مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۃ النور

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ نور

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	.....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	.....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	.....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	.....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	.....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	.....	جون 2007ء
مطبع	.....	وقار پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخرالزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقام محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہرا لگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۴۷ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۂ النور

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

آغاز

پہلا باب: سورۂ النور آیات

قرآنِ حکیم شروع سے آخر تک ایک مربوط کتاب ہے

انسان کی طرف سے قانون سازی کی پہلی شکل ملوکیت تھی اور اب جمہوریت ہے

اقتدار کی تعریف

قدم قدم پر قانون کی تبدیلی کا خدشہ

قانون شکنی پر گرفت کی ایک مثال

سیکولر نظریہ حیات کے نتائج

قرآنی نظریہ حیات

مملکت یا حکومت کا فریضہ صرف Values (اقدار) کو نافذ کرنا ہے، بنانا نہیں

ان مستقل اقدار کی خلاف ورزی انسانی ذات کو متاثر کرتی ہے

اثم کا مفہوم

ذاتِ انسانی کی بنیادوں پر قائم کردہ نظامِ احتساب ایک الگ نظام ہے

جرائم سزاؤں سے بند نہیں ہوتے

ذات پر اثر انداز ہونے والے غلط اثرات کیونکر مٹ سکتے ہیں؟

انسان کو اپنی ذات کا تحفظ خود ہی کرنا ہوگا

دراصل انسان اپنے ہی خلاف جرم کرتا ہے

نٹشے کا ایک پرمعنی قول

اسلام اور مسلمان کی تعریف

ہم ہمیشہ طبعی زندگی کے شعور کے تحت سوچتے ہیں

بار بار لغزش کرنے سے عزم ہی مفلوج ہو جاتا ہے

عزم کا قرآنی مفہوم

انسانی ذات کا، یا نفس کا، یا ''میں'' کا تغیر پذیر ہونا کیریکٹر کی نفی ہے

''میں'' کی پختگی کے ذرائع

پختہ ''میں'' تو موت کو دیکھ کر بھی نہیں بدلتی

خدا کسی کو نہیں آزماتا بلکہ انسان اپنے عزم کی آزمائش کرتا ہے

قانون بنانے اور قانون توڑنے والے دونوں ہی انسان ہوتے ہیں

نفسیاتی تبدیلی کے متعلق کوئی نہیں سوچتا

امریکہ کی اندرونی نفسیاتی کیفیت

طبعی سزاؤں کا تعلق صرف بدن تک ہوتا ہے اندر کی اصلاح سے نہیں
بدن تو پورے کا پورا وہی ہوتا ہے مگر ''میں'' وہ نہیں ہوتی
حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ''میں'' نہیں بدلتی تھی
سوسائٹی کی طرف سے ملنے والی سزا جرائم کو ختم نہیں کر سکتی
قرآن حکیم نے اپنے ہاں قانون کی بجائے اقدار کا لفظ استعمال کیا ہے
اسلامی نظام وہی ہوگا جہاں Values (اقدار) کا نفاذ ہوگا
امریکہ کا صدر بدلے تو دنیا کی حکومتوں میں تزلزل آجاتا ہے
تمدنی نظام کو غیر متبدل اقدار کے تابع کر دینے کا نام اسلامی حکومت ہے
قائداعظمؒ کی قرآنی بصیرت
قرآن سے دور رکھنے کی سازش
دورِ وکٹوریا میں انگلینڈ کی سوسائٹی کی قدامت پرستی کی مثال
اور آئے دن بدلتے ہوئے قانون
انگلینڈ میں لواطت کے قانون کے بعد امریکہ میں لڑکوں کی عام خرید و فروخت
قرآن حکیم اپنی ہر قدر کی لم اور حکمت کو خود واضح کرتا ہے
عزم کی نعمت اختیار و ارادہ کی رہین منت ہے
ذات کی پختگی میں جنس (Sex) کا جذبہ بنیادی کردار کا حامل ہے
جنس (Sex) کے جذبے کے بعد عصمت کے تحفظ کا ذکر کیوں؟

دوسرا باب: سورۂ النور آیات

کسی بھی مسلمہ بات کو سطحی طور پر نہیں لینا چاہیے
عقیدے یا Faith میں Reason (عقل و استدلال) نہیں ہوتا
جبکہ ایمان کے لیے Reason (عقل و استدلال) ضروری ہے
قرآنِ کریم نے سب سے پہلے زنا کی سزا کا ذکر کیوں کیا ہے؟
سیکولر نظریۂ زندگی مکمل طور پر طبعی زندگی کے گرد گھومتا ہے
آج دنیا کی مہذب ترین اقوام میں رضامندی سے جنسی اختلاط جرم نہیں رہا
سول کورٹ میں دعویٰ کی نوعیت
اسلام اور کفر میں فرق
قرآن حکیم کی عطا کردہ Values (اقدار) کی حکمت
سیکس اینڈ کلچر کا پہلا فقرہ
قرآن کے نزدیک جنسی اختلاط مرد اور عورت کا انفرادی فعل نہیں ہے
قوموں کے عروج و زوال کا انحصار جنسیاتی ضوابط (Sexual Regulations) کی آزادی اور پابندی پر ہے
قرآنِ حکیم کی قابلِ غور تعلیم
حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی مثال
جنسی اختلاط کے سلسلہ میں کم از کم مواقعوں کا ہونا کیوں ضروری ہے؟
مودودی مرحوم کی طرف سے لاتعداد بلا نکاح لونڈیاں رکھنے کی اجازت
پارلیمنٹ میں مولانا نعمت اللہ جمعیت علمائے اسلام کے رکن کا مطالبہ اور بیان
خلیفہ ہارون الرشید کے ہاں لونڈیوں کی تعداد
کثرت سے جنسی اختلاط میں مبتلا قوم تحقیقاتی صفات سے محروم ہو جاتی ہے
خانقاہیت، تعویذ، گنڈے، نذر نیاز، اس قوم کا معمول بن جاتا ہے
قرآن چور کو نہیں چور کی ماں کو مارتا ہے
تغیر نفس کے بغیر باہر کا تغیر ممکن ہی نہیں
قرآن حکیم کے آغاز شریف کی بجائے قرآن کے ختم شریف کی محفلیں
میں قرآن کے اس نورانی سفر پر 50 سال سے گامزن ہوں

فواحش کا مفہوم
عدالت میں غالب کا بیان: میں آدھا مسلمان ہوں
قرآن میں حرام چیزوں کا بیان
جنسی اختلاط کے لیے کوئی اضطراری حالت نہیں ہوتی
آج ہمارے ہاں فواحش کی کیفیت
عذاب فی الآخرت کا مفہوم
نظر کے ساتھ جب عقل وفکر مل جائے تو وہ بصر بن جاتی ہے
عصمت کی نقب زنی کا پہلا ذریعہ

تیسرا باب: سورۂ النور آیات

زیرِ نظر موضوع کی اہمیت
جنسی بدنہادی اور اس کی سزا کا باہمی تعلق
زانی کی یہ سزا زنا بالجبر کے لیے نہیں ہوسکتی
مسلمانوں میں میت پر نوحے کی رسم
کوڑوں کی کیفیت اور حقیقت
قرآن نے دو جرائم کی سزا کوڑے تجویز کی ہے
زنا کے سلسلہ میں رجم کی سزا یہودیوں کی تھی، قرآن کی نہیں ہے
قرآن نے سزا کے سلسلہ میں بھی تکریمِ انسانیت کو ملحوظ رکھا ہے، پھر حرامی بچے کی تذلیل کیوں؟
اس سلسلہ میں حضور ﷺ کی ایک چمکتی ہوئی حدیث
ہمارے ہاں یہ سزائیں آئیں کہاں سے؟
قرآن کو مرتب کرنے کے لیے خود قرآن کی شہادت
روایات کے سلسلہ میں شیعہ حضرات کی کتابیں الگ ہیں
رجم کی آیت قرآن میں شامل تو نہیں کی گئی مگر عمل اس کے مطابق ہو رہا ہے
کیا قرآن کی پانچ سو آیات منسوخ ہیں؟
قرآن کے خلاف سازشیں
قرآنِ حکیم کی تعلیم اور اس کا نظام دنیا میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کردے گا
قرآنِ حکیم کے متعلق مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خطرناک بیان
قرآن نے ماحول اور افراد کی نفسیاتی تربیت کے مطابق سزا کا تعین کیا ہے
ان حضرات سے کوئی شخص پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا
زنا کے بارے میں فقہ کا قانون
مولانا مودودیؒ کی نظر میں زنا کی متعلق بوڑھے شخص کی سزا
زانی کو نرمی کے ساتھ بہت مارنے کی وضاحت
سزا دیتے وقت مومنین کا دنگل اکٹھا کرنا نہیں ہوگا
قرآن نے صرف چار جرموں کی سزا کا تعین کیا ہے
سزا کے یہ احکام اسلامی مملکت کے لیے ہیں
اسلام کا نظام عدل اور اس کے لوازمات
گواہی دینے والا یقینی طور پر محفوظ رہے گا
حضرت داؤدؑ اور رسولِ خدا ﷺ کی شخصیت کو جج کی حیثیت سے احکامِ قرآنی کی تاکید
جرائم کو ختم کرنے کے لیے صاف ستھرے ماحول کا پیدا کرنا ضروری ہوگا
احکامات کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول زریں
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد کی ایک عظیم مثال
اصل سزا مملکت کو ملنی چاہیے
حالات میں بگاڑ پیدا کرنا ہی سب سے بڑا جرم ہے
ضروریاتِ زندگی کا احسن طریق سے پورا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے
اسلامی مملکت کا پہلا فریضہ
کمزور یا بیمار ذہنیت کا علاج
ہمارے ہاں کا نظامِ عدل اور ہمارے ہاں کی مروجہ سزائیں، نتیجہ تباہی و بربادی

قرآن کا نظامِ حیات نا قابل تقسیم وحدت ہے
معاشرہ سزاؤں سے نہیں بدلتا' سوچ سے ذہنیت کے بدلنے سے بدلتا ہے

چوتھا باب: سورۂ النور آیات

جنسیات کا مسئلہ دو افراد کا ہی مسئلہ نہیں بلکہ یہ پوری قوم کا ہے
اس سلسلہ میں ایک پیدا کردہ الجھن کا نتیجہ
تہمت بھی ایک سنگین جرم ہے
شریف زادیوں کے لیے جلباب کا حکم
بدقماش افراد کی سزا
یہ قوانین شروع سے سنت اللہ رہے ہیں
سنت اللہ اور "**کلمت اللہ**" میں سنت اور کلمہ کا مفہوم
ہماری تو ہزار برس سے یہی حالت ہے
غیر عورتوں کے بعد اپنی بیوی کے متعلق تہمت تراشی کے متعلق احکام
گھریلو زندگی کے متعلق احکامات کی اہمیت
آپس میں نباہ نہ ہونے کی صورت میں علیحدگی کے احکام
تہمت تراشی کے سلسلہ میں ایک واقعہ
بغیر کسی تحقیق کے بات کو پھیلاتے چلے جانا جرم ہے
ہمارے ہاں الزام اور جرم میں کچھ فرق نہیں کیا جاتا
کسی کے متعلق پہلا تاثر نیک ہونا چاہیے
خاندانوں تک میں دشمنی
اس قسم کی تشہیر کو روکنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے
تحقیق کیے بغیر کسی بات کو آگے بڑھا دینا بہت بڑا جرم ہے
اس مسئلہ کو بار بار نہایت وضاحت و تکرار کے ساتھ بیان کرنے کا مقصد
واقعہ افک کے سلسلہ میں قرآن نے اپنے ہاں کسی خاتون کا نام نہیں لیا
اس قدر واضح تعلیم کے برعکس کتب روایات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق روایت
بین السطور چھپی ہوئی کہانی کا ایک نشتر
نبی اکرم ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سلوک
حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ماں باپ کے گھر بھیج دیا
رسول خدا ﷺ کو اپنی بیوی کی بات پر یقین نہ تھا (معاذ اللہ)
واقعہ افک کے سلسلہ میں ایک فخریہ بیان!!
واقعہ افک کے بارے میں ایک اہم مگر بڑا ہی نازک سوال اٹھتا ہے
ان روایات کے بارے میں مولانا علامہ اسلم جیراجپوری رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان
قرآن فہمی کے متعلق ہمارے دارالعلوموں کی حالتِ زار اور تعلیماتِ قرآن
جس بات کا تمہیں ذاتی علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگو

پانچواں باب: سورۂ النور آیات

دنیا کے دروازے دین کی چابی سے کھولیے
ہدایاتِ سماوی دنیاوی امور کو حل کرنے کے لیے دی گئی ہیں
گزشتہ سے پیوستہ
شیطانی عمل کی حقیقت اور نتیجہ
شیطان یک لخت غلبہ نہیں پاتا
اللہ کے فضل یا رحمت کا مفہوم
ہمارے ہاں کے غلط ترجمے
اس سے پیشتر بیان کردہ تہمت تراشی کے واقعہ کی یاددہانی
قلب و نظر کو کشادہ رکھنے کی ترغیب
مجرم کے ساتھ نفرت سے معاشرے کی اصلاح نہیں ہو سکتی
اس سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ
فتح مکہ پر دشمنوں سے نبی اکرم ﷺ کا سلوک
تنگ نظری اور تنگ دلی کمینہ پن ہوتا ہے
درگزر کے معنی کسی سے آگے بڑھ جانا ہے
بدعملیوں کا اخروی زندگی پر اثر

اعمال نامہ انسان کی گردن میں پڑا ہوتا ہے
قرآن میں خبیث اور شریف انسانوں کی پہچان کا ذکر
معاشرے میں شریف انسانوں کے تحفظ کے لیے قرآن کا پہلا اعلان
سوسائٹی کے متعلق قرآنی آداب
ملاقات کے لیے وقت مقرر کر لینے کی اہمیت
بے حیائی کا پہلا دروازہ انسانی آنکھ ہے
نگاہوں کو بیباک نہ ہونے کا حکم پہلے مرد کو ہے اور بعد میں عورت کو
آنکھیں نیچی رکھنے سے مراد کیا ہے؟
اب کچھ زینت و آرائش وزیبائش کے متعلق
نمودِ حسن کا جذبہ نہیں ہونا چاہیے
میاں بیوی کی رفاقت میں بُعد کا نتیجہ
گھریلو زندگی میں باہمی تصورات
اچھے وقتوں کی ایک یاد
تصورات کی پاکیزگی کے لیے آخری حدود

چھٹا باب: سورۂ النور آیات

معاشرتی طور پر نکاح کی اہمیت
نکاح کے معاملے میں مختلف مطالبے اور حق مہر کی حقیقت
نزولِ قرآن کے وقت غلام اور لونڈیوں کا مسئلہ
قرآنِ حکیم کی تعلیم کا ماحصل: موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
مستغنی کا قرآنی مفہوم
جنسی جذبے کی تسکین کے لیے ایک ہی شکل ہے
جنسی معاملات کا تعلق مکمل طور پر جذبات کی اشتعال انگیزی سے ہے، اضطراری حالت سے نہیں
غلام اور لونڈیوں کے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا فتویٰ
لونڈیوں کے متعلق قرآن حکیم کی تعلیم
قرآنی احکامات کے ساتھ تاریخ کا نزول بھی
''اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے'' کا قرآنی مفہوم اور وحدت الوجود کی حقیقت
دنیائے تصوف کے ایک بلند پایہ ستون امام محی الدین ابن عربی شیخ اکبر کی پیش کردہ تعلیم
ہمارے ہاں یہ فلسفہ وحدت الوجود ہندوؤں کے ہاں سے وارد ہوا ہے
میں بھی ایک زمانے میں اس کشتی کا سوار رہ چکا ہوں
بات صرف شاعری تک ہی محدود نہیں رہی
تصوف میں مولانا رومؒ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ سے لے کر مجدد الف ثانی تک کا حصہ
تصوف میں بریلوی فرقے کا کردار: نور اور بشر کا معاملہ
انسان میں حد بشریت تک اللہ کی صفات
حیات النبی ﷺ کا عقیدہ
مولانا احمد رضا خانؒ کی وصیتیں
کسی غیر محسوس شے کو مثال سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا
کائنات کی ہر شے کو ہدایت سے نوازا گیا ہے
انسانوں کی طرف بھی وحی نازل کی اور اس طرح پوری کائنات کو نور سے بھر دیا
اس آیت نے لوگوں کو بڑی گمراہی میں ڈال رکھا ہے
خدا کے نور کی مثال اور خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نورانی چراغ کی خصوصیات
چراغ اپنی دلیل آپ ہوتا ہے
قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا
اس آیت کا ''مفہوم القرآن'' میں مفہوم

ساتواں باب: سورۂ النور آیات

گھروں کے اندر صفاتِ خداوندی کا چرچا
قرآن حکیم کے چراغ کی روشنی میں نظام کے قیام کا ماحصل

قرآنی معاشرے میں اعمال کا ثمر بغیر حساب ملتا ہے
نظامِ سماوی کا نتیجہ
پہلے دور کی ملوکیت کا نظام ہی آج کا جمہوری نظام ہے
اسلام کیا ہے؟
سراب (Mirage) کا یہ نتیجہ مکافاتِ عمل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے
آیات اللہ کا مفہوم
جذبات کی شدت عقلی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیتی ہے
مذہب کسی مقام پر بھی نہیں مگر دین قدم قدم پر غور کرنا سکھاتا ہے
ہم نے سراب کو پانی سمجھا ہوا ہے
جنت کا حصول اتنا آسان نہیں: یہ سعی بے حاصل کی لذت ہے
مذہب سعی بے حاصل کی لذت کا نام ہے
قرآنی تعلیم انسان کے زاویہ نگاہ کو بدل دیتی ہے
دنیائے تصوف میں نفس کشی کی انتہا آرزو کا خاتمہ ہے: پرویز کی کہانی پرویز کی زبانی
امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی: عقل کے دو پہلو
قرآن اور مقامِ عقل
حصولِ منزل کے لیے انسانی عقل کو قندیلِ سماوی کی ضرورت کیوں ہے؟
قرآن کی نظر میں لفظ سراب کے استعمال کی اہمیت
سب سے زیادہ نقصان میں رہنے والے کون ہیں؟
حبطت کا قرآنی مفہوم اور میزان کھڑی کرنے کی ضرورت کا نہ ہونا
دس سال میں چالیس ہزار شہر اور قلعے حقیقت کا اور حق کا زندہ ثبوت تھے
صحیح عمل کی نتیجہ خیزی کے لیے زراعت کی مثال
ہمارے ہاں مذہب کی اس زندگی میں ثواب کو محسوس طور پر ماپنے یا ٹیسٹ کرنے کا کوئی پیمانہ نہیں
اہلِ شریعت کے بعد اہلِ طریقت کا عمل
مذہب کی کاریگری صرف یہ ہے کہ انسان ساری عمر سراب ہی میں گزار دے
جو بیج کونپل ہی نہ بنے، وہ پودا کیسے بن سکتا ہے؟

آٹھواں باب: سورۂ النور آیات

غلط انسانی فکر کے گھٹا ٹوپ بادل سوچ کی شعاؤں کو بھی روک لیتے ہیں
قرآن نے ظلمت کے لیے ہمیشہ جمع کا صیغہ اور نور کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے
تاریکی میں انسان خود کو بھی نہیں دیکھ سکتا
ہمارے ہاں تواتر و توارث کی سند کا احترام
تواتر کی ایک مثال: مسئلہ وصیت
تقلید کی روشنی انسان کو عقل، فہم، شعور، علم اور تدبر کی دولت سے محروم کر دیتی ہے
اپنی ذات کا منکر ہونا خدا کا منکر ہونا ہے
''قلادہ'' کا مفہوم
اگر خدا کا منکر ہونا کافر ہونا ہے تو اپنی ذات کا منکر ہونا کافر تر ہونا ہے
دنیا و آخرت کا سارا دارومدار ذات انسانی پر ایمان لانا ہے
قرآن کی ساری تعلیم صرف اور صرف ذات انسانی کا ہی تعارف ہے
عربوں کے ہاں مادے کے اعتبار سے معنی کے تعین کی ایک مثال
ہر قدم پر ایک نیا خدا اور ہر قدم پر ایک نیا بندھن
دنیائے مغرب شدتِ جذبات کی گرویدہ ہے تو مشرق تقلید کا غلام ہے
نورِ خداوندی کے متعلق قرآن کا فرمان
ارض کے نور کے بعد سماوات کے نور کی حقیقت اور تسبیح کا مفہوم
اقبالؒ کی نظر میں مقام مومن اور مقامِ امتِ مسلمہ
عرب یا عراق میں تسبیح کے استعمال کی کیفیت
قرآن کی طرف آنے والوں کا فریضہ اور ہمارے مذہبی عقائد
خارجی کائنات میں واٹر سپلائی کی مثال
بادلوں میں چمکنے والی بجلی کی توانائیوں کی افادیت

قرآن نے اختلافِ لیل ونہار کو آیات اللہ کہا ہے
حقیقت تک پہنچنے کے لیے آیات اللہ ایک پل کا کام دیتی ہیں
علم وشعور کی یہ ساری شعائیں ''Dark Age'' (دور تاریک) کی ہی رہینِ کرم ہیں
زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے
قرآن فکر انسانی کے لیے ایک روشن چراغ ہے
ہمارے ہاں کے غلط تراجم کا ماحصل
قرآنی احکام پر عمل پیرائی مومن ہونے کا ثبوت ہے
عدالتوں میں گریز کے مختلف طریق
دلوں کا روگ اور اس کا علاج
مومن کا کردار اور اس کا عمل
نجات نہیں بلکہ فوز ہے

نواں باب: سورۂ النور آیات

منافقت کی پہچان
اطاعت کی شکل میں ثواب تو معروف ہی نہیں ہوتا
لفظ طاعۃ کے ساتھ معروفۃ کا استعمال کیوں؟
اطاعت کے نتیجہ کی محسوس شکل ضروری ہے
کسی کو صحیح راستے پر چلانا رسول ﷺ کے اختیار میں نہیں
قرآنی آیت استخلاف کا مفہوم دین کی صداقت پر یقینِ محکم ہے
دین کے صادق ہونے کی پہچان
اعمالِ صالحہ کا عملی ثبوت کرّہ ارض پر دین کی حکومت
حکومت اور حکومت میں فرق
ملوکیت کی تعریف
خود مسلمانوں کی حکومتوں کی کیفیت
برطانیہ کی غلامی میں مسلمانوں کے ہاں ''آزادی'' کا تصور
ملوکیت کے بعد روحانیت کی خلافت کا فریب
قرآن کی راہنمائی کے لیے قوموں کا تاریخی ذکر
حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام اور قومِ بنی اسرائیل کا تذکرہ
دنیائے تصوف کی خلافت، عالم بالا میں ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی
قرآنی لفظ خلیفہ کے بارے میں ہماری سوچ کی پستی
اس مملکت کی غایت، اس کا مقصد اور اس کی منزل
صدیوں سے دینِ خداوندی کو خود ساختہ مذہب کی صورت دی گئی ہے
اقبالؒ کی فراست فرقانی اور ہماری سوچ
سجدے کی اجازت کے ملنے میں اور اسلام کے ہونے میں ایک بنیادی فرق ہے
تمکن فی الارض کے بغیر صلوٰۃ قائم ہی نہیں ہوسکتی
قرآن کے نزدیک امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ اور ہمارا عمل
اس نظام خداوندی میں خوف، امن سے بدل جائے گا
مذہب کی دنیا میں قرآن کا ترجمہ
کبریائی کا قرآنی مفہوم اور عبادت
صرف خدا کی حکومت، صرف خدا کا نظام
ہزار سال بعد انسانی سوچ میں تبدیلی کے کچھ آثار
کفر کیا ہے؟ کافر کسے کہتے ہیں؟ اور مومن کی پہچان کیا ہے؟
تمکنِ دین کے معنی ہیں: خوف کو امن میں بدلنے کا طریق
فاسق کا قرآنی مفہوم
انسان وہ کچھ بن جائے جو کچھ خدا انسان کے لیے چاہتا ہے
قرآن صرف دماغی چیز نہیں، اس کی راہنمائی شعور کی طالب ہے
مروجہ اسلام، انگریز کی محکومیت اور آسان ترین جنت کا حصول
دین کی غایت اور مقصودِ زندگی
خوف انسان کی تمام صلاحیتوں کو پامال کر دیتا ہے
عمر بھر کے لیے غلام بے دام
کفار کی محکومیت اور روحانیت کی ترقی دو متضاد چیزیں ہیں

دسواں باب: سورۂ النور آیات

دین اور سیاست ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں
سیاست دین کے تمکن کا ایک ذریعہ ہے
روزمرہ کی زندگی کے معمولات اور قرآنی ہدایات
گھر کے اندر خلوت (Privacy) کا خیال رکھنا ہوگا
کھانے کی دعوت کے سلسلے میں ہدایات کی اہمیت
قرآن آدمی کو انسان بننا سکھاتا ہے
یہ آداب تمدن شروع میں وحی کے ہی رہن منت تھے
ضمناً ایک اہم بات
زکوٰۃ علیحدہ اور ٹیکس علیحدہ؟
مذہبی پیشوائیت نے دین اور دنیا میں ثنویت پیدا کر رکھی ہے
بے حد و نہایت دولت جمع کرنے کے جواز میں اڑھائی فیصد کا تصور
قرآنِ حکیم کی حکمتِ بالغہ
ختمِ نبوت کے معنی
بالغ بچوں کے لیے ہدایات
یہ راہنمائی بھی آیات اللہ ہیں
خدا عالم نہیں بلکہ علیم ہے
بوڑھی عورتوں کے لیے احکام
نبی اکرم ﷺ کے گھرانے کی عورتوں کے لیے خصوصی احکام
کہیں نمود و نمائش کا جذبہ پیدا نہ ہونے پائے
عورت مرد کے لیے کھلونا نہیں
اہل یورپ کی بوڑھی عورتوں کی کیفیت
بچے کی شادی کے بعد اسے الگ ہی رکھنا چاہیے
خاندان کے اندرونی طور پر باہمی روابط کے سلسلہ میں چیدہ چیدہ احکامات
مغرب کی معاشرتی تباہی کے سلسلہ میں فیملی یونٹ (خاندانی اکائی) کی حالت زار
خاندان کے روابط کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا اعجاز: ہوم (گھر) کو یونٹ بنانا ہوگا
ہوم یونٹ کے بغیر بھرے معاشرے میں یتیم
گھر میں کسی بزرگ کے کردار کا گھریلو زندگی پر اثر
مومن وہ ہے جو اس طرح ایمان لائے جس طرح قرآن کا مطالبہ ہے
اجتماعی معاملات کے لیے رسول اکرم ﷺ کا صحابہ رضی اللہ عنہم کو بلانا
ان اجتماعات کی اہمیت اور افادیت
سربراہِ مملکت کی طرف سے یہ بلاوا زندگی کی آبیاری کے لیے ہوگا
فرمودہ اقبالؒ: خدا روٹی بھی دیتا ہے اور زندگی بھی
بلا اجازت ان اجتماعات سے کھسک کر چلے جانے والے منافق ہوتے ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ سخن

قارئین اس امر سے بخوبی واقف ہوں گے کہ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے بزمِ طلوع اسلام لاہور نے جناب علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دروسِ قرآن پر مشتمل قرآنی تفسیر ویڈیو/آڈیو سی ڈی پر سے قرطاس پر منتقل کرنے کا جو پروگرام اکتوبر 2003ء میں شروع کیا تھا اس وقت تک اس تفسیر کی 9 جلدیں سورۂ نحل سے سورۂ حج تک پھر 29، 30 پارہ مکمل اور اس کے بعد سورۃ فاتحہ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے جب کہ اس وقت اسی سلسلہ کی دسویں جلد سورۃ النور طالبان قرآن کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی پر جنسیاتی بے راہ روی کے اثرات جیسے نہایت اہم ترین موضوعات کے علاوہ زیرِنظر سورۃ النور کی آیت نمبر 35 کی جو تفسیر زیرِنظر دروس میں بیان کی گئی ہے اس کا عمیق نظر سے مطالعہ یقیناً قرآن فہمی کے سلسلہ میں مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مذکورہ آیت کے متعلق تمام مروّجہ تراجم کے علاوہ علامہ پرویزؒ نے وحدت الوجودی تصورات کی اصل حقیقت کو نہایت واضح تر انداز میں بے نقاب کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان تصورات کی اس وضاحت سے جہاں حضرت انسان کو اس محیر العقول کائنات کے اندر اپنے مقامِ بلند کا اندازہ ہوگا وہاں اس کی وساطت سے عقل انسانی کو جب قندیل آسمانی کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت سے آگاہی حاصل ہوگی، تو علامہ اقبال کے الفاظ میں وہ بے ساختہ پکار اٹھے گی کہ

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

چنانچہ علامہ پرویزؒ نے سورۃ النور کی آیت نمبر 35 کے سلسلہ میں مفہوم القرآن کے تعارف میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس امر کی یہ بھی وضاحت کی ہے کہ قرآنی الفاظ کا ترجمہ کسی زبان میں بھی ممکن نہیں لہٰذا آپ تحریر کرتے ہیں کہ:

ترجمہ مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا

''حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ، خواہ وہ دنیا کی کسی زبان میں بھی کیوں نہ ہو، قرآنی مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ اگر قرآنِ کریم کے الفاظ کی جگہ، خود عربی زبان کے دوسرے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو بھی بات کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ قرآنِ کریم کا انداز اور اسلوب بالکل نرالا ہے۔ یہ اپنی مثال آپ ہے الفاظ تو اس کے عربی

زبان ہی کے ہیں' لیکن ان میں جامعیت اس قدر ہے کہ نہ ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ لے سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی ترتیب میں ردوبدل کرنے سے' وہ بات باقی رہ سکتی ہے۔اس لیے قرآنِ کریم کے ترجمہ میں اس کا پورا پورا مفہوم آ نہیں سکتا۔''

امام ابن قتیبہ کی رائے

اس باب میں امام ابن قتیبہؒ (متوفی ۲۷۷ھ) کتاب القرطین میں عربوں کے مختلف اسالیب بیان کی خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''قرآنِ کریم کا نزول' ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنے والا' قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی زبان میں (کما حقہٗ) نہیں کرسکتا' جیسا کہ ترجمہ کرنے والوں نے انجیل کا ترجمہ سریانی زبان سے' حبشی یا رومی زبان میں کرلیا تھا' ایسے ہی زبور اور تورات کے تراجم اور باقی کتب الٰہیہ کے تراجم عربی زبان میں کر لیے گئے تھے۔ کیونکہ عجمی زبانوں میں' مجاز کی وہ وسعت نہیں جو عربی زبان میں ہے۔مثال کے طور پر دیکھئے کہ اگر آپ قرآنِ کریم کی اس آیت کا ترجمہ کرنا چاہیں''۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۔(8:58)

تو آپ قیامت تک ایسے الفاظ مہیا نہیں کر سکتے جو ان معنوں کو ادا کردیں جو اس آیت میں ودیعت ہیں' بجز اس کے کہ آپ اس نظم وترتیب کو توڑ کر الگ الگ چیزوں کو ملائیں اور جو چیزیں اس میں ودیعت کی گئی تھیں انہیں اس طرح ظاہر کردیں اور یوں کہیں کہ ''اگر تمہارے درمیان اور کسی قوم کے درمیان صلح اور معاہدہ ہو' اور تمہیں ان سے خیانت اور نقضِ عہد کا اندیشہ ہو' تو پہلے انہیں بتا دو کہ جو شرائط تم نے ان کے لیے منظور کی تھیں تم نے انہیں توڑ دیا ہے' اور اس کے ساتھ ہی ان کے خلاف اعلانِ جنگ بھی کردو تا کہ تم اور وہ دونوں نقض عہد کو جان لینے میں برابر برابر ہو جاؤ۔''

ایسے ہی قرآنِ کریم کی ایک دوسری آیت ہے:

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا . (18:11)

اگر آپ چاہیں کہ اس مضمون کی کسی دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کردیں تو اس سے وہ مضمون قطعاً نہیں سمجھا جا سکے گا جو ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے۔اور اگر آپ یہ کہیں کہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''ہم نے انہیں چند سال تک سلائے رکھا'' تو اب بھی آپ نے مضمون کا ترجمہ تو کردیا' مگر الفاظ کا ترجمہ نہیں کر سکے۔

ایسے ہی قرآن کریم کی تیسری آیت ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا . (25:73)

اگر آپ اس آیت کا ترجمہ اس کے الفاظ کے مطابق کریں گے تو وہ ایک مغلق بات بن جائے گی۔ اور اگر آپ یوں کہیں گے کہ ''وہ لوگ اس سے تغافل نہیں برتتے'' تو اس سے آپ نے مضمون کو دوسرے الفاظ میں ادا کر دیا ہے' ترجمہ نہیں کیا۔ (قرطین' جلد دوم' ص163)

ایک مستشرق کی رائے

یہ تو اپنوں کی رائے ہے غیروں میں سے بھی جس نے قرآنِ کریم کا مطالعہ بنظر غائر کیا ہے' وہ اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ (کما حقہٗ) کسی زبان میں نہیں ہوسکتا۔ مشہور مستشرق گب (H.A.R Gibb)' اپنی کتاب (Modern Trends in Islam _ 1945 ed) میں لکھتا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اس کے عربی زبان کے تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کے بجائے مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیت کو مقید کر دیں گے۔ ایسی آیات میں' جن میں عام واقعات یا قوانین واحکام مذکور ہوں' ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو' لیکن بایں ہمہ' جو مدوجزر' جو نشیب وفراز' جو بلندیاں اور گہرائیاں' جو لطافتیں اور باریکیاں' اور اس کے ساتھ جو جوش وخروش' اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے وہ ترجمہ میں کیا آسکے گا! ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجیے:

اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ۔(50:43)

اور انگریزی ہی نہیں' دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھایئے۔ اس کے چھ الفاظ میں' جو پانچ مرتبہ ''ہم'' (We) کی تکرار ہے' اسے کون سی زبان ادا کر سکے گی؟

چنانچہ محترم پرویز صاحب سورۂ نور کی آیت نمبر 35 کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں کہ:

اس آیت کا ''مفہوم القرآن'' میں مفہوم

میں نے ''مفہوم القرآن'' میں اس کا جو مفہوم دیا ہے اسے اب میں ان الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ ''خدا نے ہر شے کو پیدا کیا ہے اور اسے اس راستے پر چلنے کے لیے راہنمائی دی جو اس کے لیے مقرر کیا گیا تھا (20:51) اور یہی وہ خدا کا نور ہے جو ہر جگہ پھیلا

ہوا ہے۔ اشیائے کائنات میں یہ ہدایت ان کی پیدائش کے ساتھ' ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ لیکن انسانوں کو یہ رہنمائی کتاب کی شکل میں دی گئی ہے۔ خدا کی مشعلِ ہدایت (وحی) کی مثال یوں سمجھو' جیسے کسی طاق میں' جو پیچھے سے بند ہو' اس لیے محفوظ' اور سامنے سے کھلا ہو' جس سے روشنی ساری فضا میں پھیل جائے' ایک جگمگا تا چراغ ہو' ایسا ٹھنڈی اور صاف روشنی دینے والا چراغ' جیسے ستارۂ صبحگا ہی فضا کی تاریکیوں میں نور پاش ہو' اور اس چراغ کو ایک صاف اور شفاف شیشے کے فانوس میں رکھ دیا گیا ہو' تا کہ وہ تمام خارجی اثرات سے محفوظ رہے۔ (41:42) خود فانوس بھی ایسا درخشندہ گویا وہ چمکتا ہوا تارہ ہے جس سے نور کی ندیاں رواں ہیں۔ وہ چراغ ایک ایسے بابرکت شجر کے تیل سے روشن ہو جو مشرق اور مغرب کی نسبتوں سے بلند' تمام نوع انسان کے لیے یکساں ہو۔ ایسا تیل جو اس کا محتاج نہ ہو کہ کوئی خارجی روشنی اسے جلائے۔ وہ اپنے آپ روشن ہو اور دوسروں کو بھی روشنی دے۔ وہ اپنے معانی اور تفسیر کے لیے خارجی امداد کا محتاج نہ ہو۔ وہ چراغ نہیں' روشنی کی تہیں ہیں جو ایک کے اوپر دوسری' تو برتو' چڑھی ہوئی ہیں۔ وہ سارے کا سارا نور ہے۔ نور مجسم ہے۔ اس میں روشنی ہی روشنی ہے۔ گوہر میں آب گوہر کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

''یہ ہے خدا کا وہ نور (وحی) جس کی طرف وہ ہر اس شخص کی رہنمائی کرتا ہے جو اس سے رہنمائی لینا چاہے۔ اللہ مجرد حقیقتوں کو' اس قسم کی محسوس مثالوں کے ذریعے اس لیے بیان کرتا ہے تا کہ لوگ بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہ مثالیں اس خدا کی طرف سے دی جاتی ہیں جو جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور اسے کس قسم کی مثالوں سے واضح کرنا چاہیے۔''

ہمیں امید ہے کہ قارئین کو زیرِ نظر قرآنی تفسیر کے صفحات میں جا بجا بکھرے ہوئے حقائق کی ضیا پاشیوں اور حیاتِ نو کی جلوہ ریزیوں سے استفادہ کا موقع میسر آئے گا۔

آخر پر حسب سابق ہم ان تمام محسنوں کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ جن کے تعاون سے قرآنِ حکیم کی یہ قرآنی تفسیر بتدریج اپنے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی جانب منزل رواں دواں ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

(اقبالؒ)

احباب کے مخلصانہ تعاون اور مومنانہ رفاقت کی طلب گار

والسلام

بزم طلوع اسلام، لاہور

یکم جون 2007

پہلا باب: سورۃ النور (تمہید اور آیت 1)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ①

عزیزانِ من! آج ستمبر 1977ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز اٹھارویں پارہ کی 24ویں سورۃ النور سے ہو رہا ہے: (24:1)

قرآنِ حکیم شروع سے آخر تک ایک مربوط کتاب ہے

جیسا کہ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ قرآن کریم میں ایک ربط باہمی چلا آ رہا ہے' نہ صرف یہ ہے کہ آیات میں باہمی ربط ہے بلکہ اس کی سورتوں میں بھی ایک ربط ہے۔ اس انداز سے دیکھیے تو آپ کو الحمد سے والناس تک یہ ایک مربوط کتاب نظر آئے گی لیکن اس ربط کے لیے ذرا گہرائی میں جانے کی ضرورت ہے۔ سطح بیں نگاہوں کو تو دو آیتوں میں بھی ربط نظر نہیں آتا۔ معنوی حیثیت سے گہرائی میں جایئے تو جیسا میں نے عرض کیا ہے' آپ کو یہ ساری کتاب مربوط نظر آئے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ پچھلی سورۃ المؤمنون میں دو فریقوں کی' بلکہ دو نظریاتِ زندگی کی بات تھی۔ ایک نظریہ زندگی یہ تھا کہ انسان کی زندگی اس طبعی دنیا کی زندگی ہے' اس کا جسم ہی ہے' جس کی نشوونما اور پرورش مقصودِ زندگی ہے۔ یہ کچھ میسر آ جائے تو زندگی کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ طبعی قوانین کے تابع جسم زندہ رہتا ہے۔ جب انہی قوانین کے تابع یہ منتشر ہو جاتا ہے' جسے موت کہتے ہیں' تو انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا نظریہ زندگی یہ ہے کہ نہیں' اس جسم کے علاوہ ایک اور شے (Entity) بھی ہے جو اس کی طبعی موت کے ساتھ مرتی نہیں ہے۔ یہ سلسلہ ارتقا کی آخری کڑی نہیں ہے بلکہ ایک اگلی کڑی کا پہلا لنک (Link) ہے۔ یہاں سے ایک نیا سلسلہ ارتقا آگے چلتا ہے اور وہ شے جسے کہا ہے کہ یہ موت سے بھی نہیں مرتی' اس کی نشوونما' اس کی پرورش' اس کی Development (نمود)' اس کا Crystallization (ارتکاز) اور اس کا استحکام و ارتکاز' ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں۔

اب اس کے بعد ہم ورق الٹتے ہیں تو پہلی آیت کے علاوہ اس سورۃ کی باقی آیات ان جرائم سے متعلق نظر آتی ہیں' جن کی سزائیں

مقرر ہیں مثلاً اَلزَّانِیَةُ وَ الزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (24:2) زانی اور زانیہ کو سو سو کوڑے مارو۔ آگے چل کر میں اس کی تشریح کروں گا۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ ان جرائم کی سزاؤں اور پیچھے سے چلی آنے والی چیز کے مابین کوئی باہمی ربط نہیں ہے۔ ربط باہمی کی یہ بات ہماری سمجھ میں اس لیے نہیں آتی کہ ہم قرآن کی رو سے جرائم کا صحیح مفہوم نہیں سمجھے۔ یاد رکھیے جب تک یہ بات نہ سمجھی جائے نہ کسی معاشرے کی اصلاح ہو سکتی ہے نہ جرائم بند ہو سکتے ہیں۔ وہ جو پہلا نظریہ زندگی ہے کہ زندگی صرف اس دنیا کی زندگی [1] ہے۔ اس میں انسان ایک سوسائٹی میں مل جل کر رہتا ہے۔ اس مل جل کر رہنے سے آپس کے تعلقات میں کشیدگی ہوتی ہے تصادم ہوتا ہے اختلافات ہوتے ہیں تنازعات ہوتے ہیں۔ اس زندگی کو پرامن و پرسکون رکھنے کے لیے کچھ قوانین مرتب ہوتے ہیں سوسائٹی خود یہ قوانین بناتی ہے اور پھر ان قوانین پر عمل کرایا جاتا ہے جو ان قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے اسے جرم کہا جاتا ہے اور اسے روکنے کے لیے سزا دی جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ پچھلی سورۃ کے آخر میں جو دو نظریات [2] زندگی بتائے گئے تھے ان میں جو پہلا نظریہ زندگی [1] ہے اس کا تعلق بھی قانون جرائم اور سزا سے ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ تمدنی زندگی میں سوسائٹی خود قوانین بناتی ہے۔ اسے قوانین ساز گروہ کہہ لیجیے فرد کہہ لیجیے۔ یہ اس کی صوابدید پہ ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے قوانین بنا کر دیتا ہے۔

انسان کی طرف سے قانون سازی کی پہلی شکل ملوکیت تھی اور اب جمہوریت ہے

عزیزان من! اس نظریہ زندگی [1] میں قانون سازی کا یہ اختیار کبھی ایک فرد کو حاصل ہوتا تھا اسے دورِ ملوکیت کہا جاتا ہے اور کبھی افراد کے ایک گروہ کو۔ دورِ حکومت کے اس نظام مملکت کو اب قریب قریب ساری دنیا مردود قرار دے چکی ہے۔ آج کے دور میں اس کی جگہ جمہوریت نے لے لی ہے۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ اس زمانے میں جو کچھ ایک فرد کرتا تھا اب افراد کا ایک گروہ کرتا ہے۔ اس وقت بھی انسان ہی دوسرے انسانوں کے لیے قانون بناتا تھا اب بھی انسان ہی دوسرے انسان کے لیے قانون بناتے ہیں اور یہ قوانین آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔

اقتدار کی تعریف

یہ جو جمہوریت میں زور لگایا جاتا ہے کہ اس پارٹی کی بجائے اقتدار ہمارے ہاتھ میں آئے وہ قانون سازی کا اختیار ہوتا ہے۔ جسے

---

[1] اس نظریہ زندگی کا نام ہے Materialistic Concept of Life (مادی نظریۂ حیات)

[2] اس دوسرے نظریہ کا نام ہے Quran`s Concept of Life (قرآنی نظریۂ حیات)

اقتدار کہا جاتا ہے یہ بڑی چیز ہے۔ یعنی اپنی مرضی کے مطابق ایک قانون بنایا' اس قانون کو سوسائٹی میں نافذ کیا' جس نے اس کی خلاف ورزی کی اسے جرم قرار دیا' پھر اس کی سزا دی۔ یعنی ان کی مرضی کے خلاف جو کوئی کچھ کرنے والا ہے' اسے پھانسی پہ چڑھا دیا جائے۔ اسے اقتدار کہتے ہیں۔ یہ ساری تگ وتاز' یہ ساری جدوجہد اس مقصد کے لیے ہوتی ہے کہ ہم اپنی مرضی کے مطابق قانون بنائیں اور پھر جو اس قانون کے خلاف یعنی ہماری مرضی کے خلاف چلے' اسے پھانسی پہ لٹکا دیا جائے۔ اس شکل میں قانون کے خلاف چلنے کے معنی کیا ہوئے؟ یہ کہ جو ہماری مرضی کے خلاف چلے' اسے پھانسی پہ لٹکا دیا جائے۔

قدم قدم پر قانون کی تبدیلی کا خدشہ

جمہوریت کے اس نظام میں دوسری پارٹی کوشش کرتی ہے کہ ان کو اس اختیار سے محروم کر کے یہ اختیار ہم اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ پھر ہم قانون بنائیں اور ایسا قانون بنائیں کہ یہ جو پہلے تھے انہیں پھانسی پہ لٹکا دے۔ دراصل سارا نظام ہی یہ ہے۔ یہی بات ہے کہ ایک پارٹی کے تبدیل ہو جانے سے سارے معاشرے کے اندر ایک بنیادی تبدیلی آ جاتی ہے۔ وہ اس لیے کہ قوانین بدل جاتے ہیں اور کچھ معلوم نہیں کہ کل جن قوانین کے ماتحت زندگی خوشگوار گزرتی تھی آج دوسرا قانون بنتا ہے' اب اس کے تحت جیل خانے میں چلا جائے' یہ ہے جو تبدیلی ہوتی ہے: ہر پارٹی کی صوابدید کے مطابق قانون کی تبدیلی' اور پھر ایک ہی پارٹی وقتاً فوقتاً اپنے ہی قوانین میں تبدیلیاں کرتی رہتی ہے۔ ان قوانین کی تبدیلی کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی ایک مقصد' ایک مفاد پرستی کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی اس کے مطابق ہوتی ہے۔ ان قوانین کے خلاف ورزی کا نام جرم قرار پاتا ہے اور انہوں نے اس کی سزائیں خود قانون میں ہی رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔ اس نظریہ زندگی میں دیکھیے کہ ایک تو میں نے عرض کیا ہے کہ نت نئے دن قوانین بدلتے رہتے ہیں۔ پارٹی کے بدلنے سے تو سب کچھ Upset (درہم برہم) ہو جاتا ہے۔ ایک ہی پارٹی اپنے ہی دور میں' مختلف اوقات میں' اپنے ہی قوانین میں تبدیلیاں کرتی جاتی ہے' نئے قوانین وضع کرتی جاتی ہے' تو اس کے مطابق اس معاشرے میں رہنے والے کسی شخص کو اس کا یقین نہیں ہوتا کہ کل کس قسم کے قانون بن جائیں' اور کل میری کیا کیفیت ہو۔ جسے آپ Sense of Security (احساسِ تحفظ) کہتے ہیں' جسے آپ امن کی زندگی کہتے ہیں' اُس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** [1] (2:62) یہ آپ کو زندگی نہیں میسر آ سکتی۔

قانون شکنی پر گرفت کی ایک مثال

پہلی چیز تو قانون کی یہ حیثیت ہوئی۔ پھر اس قانون کے بعد ان قوانین کی پابندی کی کیفیت یہ ہے کہ اگر اس کی خلاف ورزی اس

---

[1] ان کے لیے اس میں نہ خوف ہوگا' نہ حزن

انداز سے کر لی جائے کہ جو سوسائٹی کا نظامِ احتساب یعنی گرفت کا نظام ہے' وہ اس کی گرفت میں نہ آئے' تو اس کے بعد کچھ بھی نہیں ہوتا۔ گرفت میں آنے کے بعد اگر کوئی ایسی تدابیر اختیار کر لی جائیں تو پھر مجرم چھوٹ جائے' پھر اس قانون شکنی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور اگر انتہائی مثال لے لی جائے کہ آپ کے دوست آپ کے پاس آ کے بیٹھے۔ آپ نے ایک نہایت اچھا قیمتی پین یا گھڑی میز پہ رکھی ہے اور ان کی نیت یہ ہے کہ آپ ذرا اِدھر اُدھر ہوں تو وہ اسے اڑا لیں۔ وہ اس گھات میں بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ آپ کی خوش قسمتی ہے اور ان کی بدنصیبی ہے کہ آپ اٹھ کر نہیں جاتے اور وہ اسے اٹھانے سے محروم رہ جاتے ہیں' اسے چرا نہیں سکتے۔ عام قانون کے مطابق یہ کوئی جرم نہیں ہے' کسی محتسب کی نظروں میں نہیں آ سکتا' اسے کوئی عدالت اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی' معاشرے کے وضع کردہ قانون کی رو سے یہ جرم ہی نہیں ہے' یا مثلاً آپ جنگل میں جا کے اپنے پڑوسیوں کو ہزار گالیاں دیجیے' جہاں کوئی سننے والا نہ ہو' یعنی گواہ نہ ہو تو یہ کوئی جرم ہی نہیں ہوگا مگر یہ معاملہ یوں نہیں ہے۔

سیکولر نظریہ حیات کے نتائج

عزیزانِ من! جرم تو سوسائٹی کے اندر ہوگا۔ اس مثال میں آپ نے دیکھا کہ یہ جو اس فرد نے جرم کیا ہے یا قانون شکنی کی ہے' اس پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ مشین کے پرزے (Cog) کی طرح ہوتا ہے' کہیں ذرا خرابی ہوگئی' Detect (شناخت) کر لی گئی اور ذرا سا اس کا پیچ کَس دیا' خرابی ٹھیک ہوگئی۔ یہ جو نظریہ حیات ہے' جسے قرآن نے اسی دنیا کا طبعی زندگی کا نظریہ حیات کہا تھا' آج کی اصطلاح میں اسے سیکولر (Secular) نظریہ حیات کہتے ہیں۔ اس میں قوانین کی یہ کیفیت ہوتی ہے' اور قانون شکنی کی یہ ہوتی ہے اور اس کے بعد جرم اور جرم کی سزا کی نوعیت یہ ہوتی ہے۔ اس فرد کے اوپر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ وہ الگ بات ہے کہ اگر ایسی سزا ہے جس سے اس کو مثلاً کوئی عقوبت پہنچی ہے' تکلیف پہنچی ہے' تو وہ تو صرف طبعی تکلیف ہوتی ہے' اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا اور اگر وہ چھوٹ جاتا ہے' گرفت میں نہیں آتا' پھر اس پر اتنا بھی اثر نہیں ہوتا۔

قرآنی نظریہ حیات

دوسرا نظریہ زندگی قرآن کا نظریہ ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ قانون کے معنی ہیں ''خدا کی مقرر کی ہوئی Values یا اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا۔'' اس میں سوسائٹی کے بنائے ہوئے قوانین کی صورت نہیں ہے۔ یہ خدا کی دی ہوئی اقدار یا Values کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے۔ یہ Values (اقدار) غیر متبدل ہیں' تبدیل نہیں کی جا سکتیں اور انبیائے کرام کے توسط سے بذریعہ وحی ملی تھیں جو آج قرآن کریم کی دفتین میں موجود ہیں۔

مملکت یا حکومت کا فریضہ صرف Values (اقدار) کو نافذ کرنا ہے، بنانا نہیں

سوسائٹی کے نظام کا فریضہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے حالات کے مطابق یہ دیکھے کہ ان Values (اقدار) کو نافذ کیسے کیا جا سکتا ہے، ان پر عمل کیسے کرایا جا سکتا ہے۔ یہ جسے آپ دین کے نظام میں، قرآنی نظام میں، نظامِ مملکت یا حکومت کہتے ہیں، اس کا فریضہ صرف اتنا ہوتا ہے۔ وہ قانون بناتی نہیں ہے۔ قانون تو ان Values (اقدار) کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ وہ صرف زندگی بسر کرنے یا ان قوانین کو نافذ کرنے کی عملی تدابیر سوچتی ہے، ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ کوئی پارٹی آئے، کوئی حکومت آئے، کوئی حکومت جائے، مگر اس کا سوال ہی نہیں کہ کوئی ان اقدار میں تبدیلی کر سکے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس نظام حکومت میں پارٹیوں کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ جب یہ معلوم ہو کہ یہاں جو بھی نظام بننا ہے وہ انہی لوگوں کا ہے جن کا اس پہ ایمان ہے کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تو اس میں کس قدر Sense of Security (احساسِ تحفظ) ہوتی ہے کہ صاحب! اس میں کوئی تبدیلی کر ہی نہیں سکتا۔ اس میں یہ نہیں ہے کہ دوسرے آ جائیں تو یہ اقدار روز بدلتے چلے جائیں۔ اگر میں قدر کے مطابق زندگی بسر کرتا ہوں تو یہ کبھی بھی جرم نہیں قرار پائے گا۔ اس لیے مجھے اطمینان ہے۔ اس میں سوسائٹی کے اعتبار سے پہلی چیز یہ بات ہوتی ہے، یہ Basic Difference (بنیادی اختلاف) کی چیز ہے۔ وہاں جسم کے علاوہ کوئی شے ایسی نہیں ہے جس پہ کوئی اثر پڑتا ہو۔ وہاں جسم کے اوپر ہی اثر پڑتا ہے، جبکہ یہاں قرآن کریم نے اس تصور حیات میں ایک اور شے بھی کہی ہے جس کے متعلق میں پچھلے درسوں میں بتا چکا ہوں کہ وہ شے کیا ہے۔ قرآن اسے نفس کہہ کر پکارتا ہے، اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1938-877) اسے خودی کہتا ہے، اسے انسانی ذات بھی کہا جاتا ہے۔ آپ اس کا کچھ بھی نام رکھ لیجیے۔ یہ وہ شے ہے جسکی Development (نشوونما) سے انسان نے موت کے بعد آگے چلنا ہے اور اگلی زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جانا ہے۔ یہ وہ شے ہے۔

ان مستقل اقدار کی خلاف ورزی انسانی ذات کو متاثر کرتی ہے

عزیزانِ من! اسے پھر سمجھ لیجیے، یہ بڑی اہم کڑیاں ہیں۔ یہ بات قرآن کے علاوہ کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آئے گی کہ جرم ان اقدار کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے، ان کی خلاف ورزی کرنے سے اس کی ذات میں کمزوری واقع ہوتی ہے، ضعف آتا ہے، انتشار واقع ہو جاتا ہے، اس کی Disintegration (ٹوٹ پھوٹ) ہو جاتی ہے، اس پہ برا اثر پڑتا ہے۔ اب اس سے اگلی بات سمجھ میں آ گئی کہ کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو، کوئی عدالت موجود ہو یا نہ ہو، کوئی سزا ملے یا نہ ملے، اس کا اثر تو اسی وقت ہو گیا۔ یہ نہیں ہے کہ جس وقت وہ عمل سرزد ہوا ہے، جب اس نے وہاں دوست کے سامنے بیٹھے دل میں یہ خیال کیا کہ

اگر یہ یہاں سے اٹھ کر چلا جائے تو میں یہ گھڑی چرالوں' ذات کے اس نکتہ خیال سے' جرم سرزد ہوگیا۔ وہ جو ہے کہ خدا' دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانت تک سے بھی واقف ہے' تو خدا کی واقفیت کا عملی مفہوم یہ ہے کہ مجھ پہ اس عمل کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اس پہ تو ہمارا ایمان ہے۔ وہ یہ نہ بھی کہتا' جب بھی ہم جانتے تھے کہ وہ غیب وشہود دونوں کا جاننے والا ہے۔ شہود وہ شے ہے جو محسوس طور پہ سامنے آجائے' غیب وہ شے ہے جو ہمارے محسوسات کی زد میں نہ آئے۔ اس پہ تو ہمارا ایمان ہے۔

اثم کا مفہوم

یہ کیا بات ہے کہ وہ دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانتوں سے بھی واقف ہے؟ واقف کے معنی یہ ہیں کہ ''اگر دل میں جرم ثابت ہوگیا' جرم کی سزا مل گئی' اس لیے کہ اتنے سے ہی اس کی ذات میں اضمحلال واقع ہوگیا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن میں گناہ یا جرم کے لیے ایک لفظ ''اثم'' آیا ہے۔ اثم کے معنی ہیں ''ہر وہ شے جو اضمحلال یا واماندگی یا کمزوری پیدا کردے۔ یہ کمزوری کس میں پیدا ہوتی ہے؟ چوری کرنے والا تو مال چراتا ہے' گھی لے جاتا ہے' بڑا مزے سے ہے' پہلوان بنتا ہے' کمزوری جسم میں تو نہیں ہوتی۔ یہ اس کی ذات میں کمزوری ہوتی ہے' اس لیے اس کو اثم کہا گیا ہے۔ تو ایسا کرنے سے جرم سرزد ہوگیا' سزا مل گئی۔ وہ جنگل میں جا کر کچھ کہے' گھر کے کمرے میں تنہا بیٹھا ہوا کچھ کرے' دل میں اس کا خیال کرے' اگر وہ اقدار میں سے کسی بھی ایک قدر (Value) کے خلاف ہے تو جرم سرزد ہوگیا اور اس کی سزا مل گئی۔ یہ اس کا ایک حصہ ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے کہ یہ اس سوسائٹی کا فرد بھی ہے' سوسائٹی میں بھی تو اس نے رہنا ہے' تو یہ ایک ایسا جرم ہے جس کا اثر سوسائٹی پر بھی پڑتا ہے مگر سوسائٹی کے نقطہ نگاہ سے' محض یہ خیال کرنا جرم نہیں ہوا۔ اس نے چوری کی ہے' سوسائٹی کے نقطہ نگاہ سے اس کے لیے قانون ہوگا' گرفت ہوگی' اس کا احتساب ہوگا' عدالت ہوگی' جرم ثابت کرے گی پھر سزا دے گی' پھر اس سزا کی اس کو تکلیف پہنچے گی۔ یہ ساری چیزیں تو سوسائٹی کے مطابق ہوں گی۔

ذات انسانی کی بنیادوں پر قائم کردہ نظامِ احتساب ایک الگ نظام ہے

عزیزان من! قرآن کریم کے نقطہ نگاہ سے سوسائٹی کو قانون بنانے کی اجازت نہیں ہوگی' قانون کو Enforce (نافذ) کرنے کے لیے سوسائٹی اپنا نظام عدل اور نظام احتساب قائم کرے گی' یہ سوسائٹی کا حصہ ہے' لیکن جہاں تک قرآن کریم کے اس نظریہ زندگی کا تعلق ہے' سوسائٹی ہو یا نہ ہو' اس کا یہ نظام ہو یا نہ ہو' فرد سوسائٹی کے اندر ہو یا کہیں اکیلا ہو' جرم عملاً صادر ہو یا نہ ہو' نیت ہی ہو' صرف ارادہ ہی ہو' وہ جو انسانی ذات کا نکتہ نگاہ ہے آپ دیکھیں گے کہ اس کا ایک نظام ہی الگ ہوگیا۔ اب یہ دو چیزیں جب اکھٹی ہوں تو وہ فرد مسلمان ہوتا ہے اور معاشرہ اسلامی ہوتا ہے۔

جرائم سزاؤں سے بند نہیں ہوتے

ہمارے ہاں یہ چیز ہوتی ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹ دیجیے' زانی کو سنگسار کر دیجیے تو جرائم بند ہو جائیں گے۔ یہ سب غلط ہے۔ وہ سوسائٹی کا نظام ہے جو اصل شے ہے۔ اگر آپ اسے بہترین بناتے چلے جاتے ہیں تو یہ سوسائٹی کا نظام ہے۔ جرائم (Crimes) سزاؤں سے بند نہیں ہوتے' جرائم اندرونی تبدیلی سے بند ہوتے ہیں۔ ابھی سو سال (100) بھی نہیں گزرے کہ انگلینڈ میں چھبیس جرائم ایسے تھے جن کی سزا قتل تھی۔ ایک پنسل چرا لینے پہ بھی موت کی سزا تھی۔ کوئی جرم بند نہیں ہوا تھا۔ آپ کے ہاں تو اب بھی قتل کی سزا موت ہے' لوگ روز پھانسی چڑھتے ہیں۔ قتل کے کتنے جرائم بند ہو گئے ہیں؟ ان میں روز اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سوسائٹی میں بھی یہ نظام رہنا چاہیے لیکن سوسائٹی کا نظام نہ تو یہ مقصد پورا کر سکتا ہے' نہ وہ Fool Proof (غلطی سے مبرا) ہو سکتا ہے' نہ اس سے جرائم بند ہو سکتے ہیں۔ یہ جو نظریہ زندگی ہے کہ میرے ہر عمل کا پہلا اثر خود میری ذات کے خلاف پڑتا ہے خواہ کسی دوسرے پر اس کا اثر پڑے یا نہ پڑے' کوئی کسی کی گرفت میں آئے یا نہ آئے' سزا ملے یا نہ ملے' مجھے سزا مل گئی' میں مجرم ہو گیا۔ اس کا پہلا اثر میری اپنی ذات پہ پڑتا ہے اور میرا زندگی کا مقصد اپنی ذات کا تحفظ اور اس کی نشوونما ہے۔ اس لیے یہ جو ایمان ہے' اس کے ذریعہ سے یہ جرائم بند ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بعض اوقات لغزش ہو جاتی ہے' سوسائٹی کے قانون کی رو سے بھی آپ کو سزا بھی مل جاتی ہے تو اس سزا سے آپ کی جو ذات کے اوپر اثر ہوا تھا' وہ نہیں مٹتا' اس کے مٹنے کا ایک دوسرا طریقہ ہے۔

ذات پر اثر انداز ہونے والے غلط اثرات کیونکر مٹ سکتے ہیں؟

قرآن نے ان غلط اثرات کے مٹنے کا طریقہ بتایا ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ پہلے اس چیز پہ تمہیں ندامت ہونی چاہیے' اس کا احساس ہونا چاہیے کہ اس سے میری ذات کے اوپر جو اثر پڑا ہے اس سے مجھے کتنا نقصان پہنچا ہے' اور اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ یہ جتنی چیزیں تم نے غلط کی ہیں' اس سے کہیں زیادہ اچھے کام کرو' تب ان کا جو دھبہ ہے وہ مٹ سکتا ہے' ورنہ ان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اس نے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ [1] (11:114) کہا ہے۔ چنانچہ یہ جنہیں آپ گناہ کہتے ہیں' جرائم کہتے ہیں' برائیاں کہتے ہیں' ان کے اثرات مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس سے کہیں زیادہ ''حسنات'' کی چیزیں پیدا کرو' زیادہ اچھائیاں پیدا کرو پھر سیئات (تخریبی کاموں کے نقصاں رساں اثرات) مٹ سکتے ہیں کیونکہ اُس نے تو پلڑا بتایا ہے' میزان بتایا ہے۔ اگر ترازو میں' برائیوں کے پلڑے میں' کوئی

---

[1] ہمواریاں' ناہمواریوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یعنی تخریبی کاروائیوں کے نقصان رساں اثرات مٹتے ہی تعمیری کاموں سے ہیں۔

زیادہ چیز جھک گئی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا جو اچھائیوں کا پلڑا ہے' اس میں کچھ ڈالو۔ محض سزا جو جرم کی مل رہی ہے' وہ سوسائٹی کے تمدنی قانون کے ماتحت مل رہی ہے۔ جن کے ہاں قرآن کا یہ نظریہ زندگی نہیں بھی ہے' ہوسکتا ہے کہ ان کے ہاں نظامِ احتساب زیادہ بہتر ہو' اس میں دونوں برابر ہوتے ہیں۔ اصل بنیادی چیز یہ ایمان ہے' جس سے ایک انسان مسلم یا مومن بنتا ہے۔ وہ ایمان یہ ہے کہ جہاں میں نے کسی خداوندی قدر (Divine Value) کی خلاف ورزی کی' مجھ سے وہ جرم سرزد ہوگیا' اور اس کی سزا مجھے ملی۔ اس کے ازالے کی شکل صرف یہ ہے' جو اوپر بتائی گئی ہے۔ اس احساس سے انسان جرائم سے بچتا ہے۔ جب یہ بات ہو کہ اس کا اثر کسی دوسرے پہ ہو یا نہ ہو' مگر میری ذات پہ تو اس کا اثر ہوگیا۔ اس سلسلے میں' قرآن کریم میں کتنی ہی آیات آئی ہیں۔ اصل میں وہ زور ہی ان اقدار (Values) پر دیتا ہے۔ ایمان سے انسان مسلمان ہوتا ہے' عزیزان من! اور ہم اپنے متعلق تو بات ہی نہیں کر سکتے۔ ہم تو مسلمان ہوئے نہیں ہیں' مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوگئے' اس لیے مسلمان کہلاتے ہیں اور اگر ''عیسائی دے گھر پیدا ہو جاندے' عیسائی ہوندے۔ ❶

انسان کو اپنی ذات کا تحفظ خود ہی کرنا ہوگا

یہ جسے مسلمان ہونا کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ ان اقدار کی صداقت پر یقین ہے' وہ اس بات پہ یقین ہے کہ اگر ان اقدار (Values) کی خلاف ورزی کی گئی اور وہ جرم سرزد ہوگیا تو پھر اس کی سزا مجھے مل گئی۔ مجھے دنیا میں اس سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا' کوئی شفاعت نہیں بچا سکتی' کوئی جرمانہ نہیں بچا سکتا' کوئی سفارش نہیں بچا سکتی۔ قرآن کہتا ہے کہ کسی کی دوستی نہیں بچا سکتی' اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ طبعی مثال کے طور پہ' آگ میں انگلی ڈالنے کے بعد آپ کو سزا مل رہی ہے' کسی کی سفارش' کوئی رشوت' کوئی کسی کا کسی قسم کا لحاظ' اس درد میں تخفیف نہیں کر سکتا۔ وہ تو آپ اس پہ مرہم لگائیں گے تو اس میں تخفیف ہوگی۔ قدر کی خلاف ورزی کا اپنی ذات پر اثر پڑتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ جسے اس نظریہ زندگی کے تابع نظام احتساب اور عدل کہا جاتا ہے' وہ سیکولر نظام (Secular System) کے ماتحت ہے' اور جسے اب آپ اسلامی کہیے' میں اسے قرآنی کہا کرتا ہوں' کہ اس سے بات متعین ہو جاتی ہے' قرآنی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ ہر فرد کا اس پہ ایمان ہوتا ہے کہ اقدار خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے میں مسلم اور مومن ہوں' ان کی خلاف ورزی سے میری ذات پر ایک ایسا اثر پڑے گا جسے دنیا میں کوئی بھی زائل نہیں کر سکے گا۔ یہ ہے جسے خدا کا قانون مکافاتِ عمل (Law of Requital) کہتے ہیں۔ دو چار ریفرنسز (حوالے) آپ دیکھ لیجیے۔ ویسے بہت آیات ہیں۔ سارا قرآن ان آیات سے بھرا پڑا ہے۔

---

❶ اگر عیسائی کے گھر پیدا ہو جاتے تو عیسائی ہوتے۔

دراصل انسان اپنے ہی خلاف جرم کرتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم تو اصل میں اسی قانونِ مکافاتِ عمل کی ہی تشریح و توضیح ہے جو اس نے مختلف انداز میں اپنے ہاں کی ہے۔ سورۃ النساء میں ہے، غور کیجیے۔ جامع آیت ہے کہ وَ مَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا ❶ (4:111)۔ یہاں وہی لفظ ''اثم'' ہے جو میں نے کہا تھا کہ یہ تکان، واماندگی، اضمحلال، کمزوری ہے۔ اور آگے ہے کہ فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ❷ (4:111)۔

عزیزان من! اب آپ اس لفظ ''اثم'' کا ترجمہ جرم کر لیجیے۔ جس نے بھی کوئی جرم کیا ہے تو بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ اس نے، کسی دوسرے کے خلاف کچھ کیا ہے، اس کو گالی دی ہے، اس کو مارا ہے، اس کو قتل کیا ہے، اس کی چیز چرائی ہے، اس دوسرے کی عصمت دری کی ہے، قرآن کہتا ہے کہ نہیں، وہ بات تو سوسائٹی کی ہے مگر یہاں اس نے اپنے خلاف جرم کیا ہے: يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (4:111)۔ عزیزان من! سزا کا تصور تو ایک طرف رہا، یہ تو اصطلاح (Term) بھی آپ کو کہیں نہیں ملے گی کہ یہ اس فرد نے اپنے خلاف جرم کیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بات کہاں چلی جاتی ہے؟ وَ مَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (4:111)۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اگر اتنی سی آیت پر بھی کسی کا ایمان ہے تو پھر جرم سرزد ہی نہیں ہو سکتا ہے؟ کوئی پاگل ہی ہو جو جرم سرزد کرے۔ پاگل کے متعلق کہتے ہیں کہ اینوں اپنے نفع نقصان داوی خیال نہیں۔ ❸ وہ کہتا ہے کہ یہ کسی دوسرے کے کیخلاف نہیں ہے، یہ تیری بھول ہے۔ اس میں دوسرے کے خلاف جو کچھ ہوا ہے، وہ تو سوسائٹی کی بات ہے۔ اگر کہیں کوئی دوسرا انسان نہ ہو تو جرم ہی سرزد نہیں ہوتا، سوسائٹی کا جرم بھی سرزد نہیں ہوتا۔ یہ تو جب دوسرا انسان ہوتا ہے تو پھر جرم سرزد ہوتا ہے۔ یہ سوسائٹی کا جرم ہے جسے تو سمجھتا ہے کہ میں نے اس کے خلاف جرم کیا، یا عدالت کہتی ہے کہ تو نے اس کے خلاف یہ کچھ کیا۔ وہ سوسائٹی کی بات ہے۔ اس کا ایمان تو یہ ہے کہ يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (4:111) میں نے اپنے خلاف ایک جرم کیا ہے۔ قصہ آدم میں یہی تعارف کرایا گیا ہے۔ وہ بات کرنے کا ایک تمثیلی انداز ہے۔ اس میں یہی چیز کہی گئی ہے کہ جب آدم سے یا آدمی سے، یہ لغزش ہوئی، اس سے پوچھا گیا، تو اس نے کہا یہ تھا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) اے میرے نشوونما دینے والے! میں نے اپنے خلاف یہ جرم کیا ہے۔ اگر تو نہیں بتائے گا کہ اس کا ازالہ کیسے ہو، تو میں تو گیا، میں تو تباہ ہوا۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کے خلاف جرم نہیں تھا: ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) وہ میرے اپنے ہی خلاف جرم تھا۔

---

❶ جو شخص جرم (Crime) کرتا ہے۔

❷ اس جرم کا اثر خود اس کی ذات (Self, Personality) پر مرتب ہوتا ہے۔ (اس سے ظاہر ہے کہ جرم دوسرے کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت، خود اپنی ذات (Personality) کے خلاف ہوتا ہے۔)

❸ اسے اپنے نفع و نقصان کا بھی خیال نہیں۔

نٹشے کا ایک پر معنی قول

آپ کو یاد ہوگا نٹشے (Nietzsche, Friedrich:1844-1900[1]) کا وہ فقرہ تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ لوگ بھی اپنی فکر کی بلندیوں پر پہنچتے ہیں تو ان صداقتوں پہ آ جاتے ہیں۔ اس کا فقرہ ہے کہ بھائی! تو نے جو جرم میرے خلاف کیا ہے' اسے تو میں بخش دونگا لیکن اس سے جو جرم تم نے خود اپنے خلاف کیا ہے' اسے کون بخشے گا۔ اسے کوئی دوسرا نہیں بخش سکتا۔

---

[1] جرمن فلاسفر جس کا فکری نظام بنیادی طور پر ایک نظریۂ قدر (Value Theory) ہے یعنی ایک ایسا فلسفہ جو اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ ''تمام اقدار'' کی از سرِ نو جانچ پڑتال کی جانا چاہیے۔ اس نے غلاموں کے نظام اخلاق (Slave Morality) کو رد کر دیا۔ اس نے ذات (Self) اور غالب آ جانے کی خواہش (The Will To Power) کے نظریئے کو پیش کیا۔ اس نے اپنے ''آقاؤں کے نظام اخلاق'' (Master Morality) میں کھل کر کہا کہ ''اعلیٰ ظرفی کا ایک ایسا عمل کسی فرد کی شخصیت کو اور بھی زیادہ نکھارنے میں بڑا مددگار ہوتا ہے۔'' اس نے اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف ''زردشت'' میں فوق البشر (The Super Man) کا تصور پیش کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ ''انسان کو خود اپنے آپ پر اور اپنے قوتِ بازو پر بھروسہ کرنا چاہیے اور مذہبی عقائد کی ان خرافات سے اپنا دامن چھڑا لینا چاہیے۔'' اپنی فکر کے اختتام پر نٹشے بالآخر جس نتیجے پر پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ ''اس رہتی دنیا میں اب تک کوئی ایسا مردِ زندہ پیدا نہ ہو سکا جو ''فوق البشر'' کے افضل ترین مرتبے پر پہنچ سکا ہو اور ایسا اس لیے ہو کہ دنیا بھر کے تمام ہی لوگ باہم ایک دوسرے کے ساتھ بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔ اب اگر ان تمام مشابہت کے حامل افراد میں سے کوئی بڑا یا عظیم انسان پیدا ہو بھی گیا ہو تو پھر یہ بڑا انسان' بشریت سے ماورا یا خارج انسان' تو نہ ہوا' گویا یہ فوق البشر نہ ہوا۔''

(No living person had yet reached the level of "Superman", for all men are 'too much alike' and the greatest among them, All -Too-HUMAN. (p.456)

یہ جرمنی کا وہ مشہور فلسفی ہے جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اس لیے اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط رستے پر ڈال دیا۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938ء) نے نٹشے کے متعلق سچ کہا تھا کہ

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے (بالِ جبریل)

''ضربِ کلیم'' میں علامہ اقبالؒ کی نظم ''حکیم نطشہ'' نٹشے کے افکار پر گہری روشنی ڈالتی ہے:

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم نگاہ چاہیے اسرارِ 'لا الٰہ' کے لیے
خدنگ سینۂ گردوں ہے اس کا فکر بلند کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لیے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی ترس رہی ہے مگر لذتِ گنہ کے لیے

ان نکات کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: قاضی قیصر الاسلام (2002ء) تاریخ فلسفہ مغرب حصہ اول' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' ص ص۔452-456۔

اسلام اور مسلمان کی تعریف

جرم کا تصور یہ ہے کہ یہ جو میں نے اس قدر (Value) کی خلاف ورزی کی ہے اس سے میری ذات پر اس کا اثر آپڑا ہے، اسے کون بخشے گا، کون اس کی سفارش کر کے اسے اس نقصان سے بچالے گا۔ یہ وہی ہے جو میں نے کہا ہے کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے جو درد ہو رہا ہے، میں نے جو یہ غلطی کی ہے، جو یہ جرم کیا ہے، مجھے اس سے کون بخشے گا، اس سے کون چھڑائے گا، کس کی سفارش قبول ہوگی، میں کیسے رشوت سے بچ جاؤنگا۔ یہ وہی ہے جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ یَكْسِبُهٗ عَلٰی نَفْسِهٖ (4:111) میں نے اپنے اوپر اس کا ایک اثر مرتب کیا ہے۔ کوئی دوسرا مجھے اس سے نہیں بچا سکتا۔ عزیزانِ من! اس کا نام ہے اسلام، اس کا نام ہے مسلمان ہونا۔ ایک اور آیت لے لیجیے: وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (6:164)۔ آپ دیکھیے کہ اس آیت میں بھی وہی نفس کا لفظ چلا آرہا ہے، وہی ذات کی بات ہے۔ اس کا ترجمہ تو اب ہم یونہی کرتے ہیں کہ جو فرد بھی، جو شخص بھی، جرم کرتا ہے یعنی ان اقدار میں سے کسی قدر (Value) کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ بات کسی کے خلاف نہیں جاتی، وہ سوسائٹی کی بات ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اِلَّا عَلَيْهَا (6:164) وہ اپنے خلاف کر رہا ہوتا ہے اور جب اپنے خلاف کیا ہے تو کہا کہ مکافاتِ عمل کا یہ اصول سن رکھیے، کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (6:164) کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ اٹھا ہی نہیں سکتا۔ اوتے تینوں آپ ای چکنا پئے گا۔ [1] ایک اور ریفرنس (حوالہ) ہے کہ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۫ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (17:7) ذات کو تقویت بخشنے والے حسن کارانہ انداز سے کام کرو گے تو تمہاری اپنی ذات سنورے گی، اس کے خلاف یہ کچھ کرو گے تو اس کی تباہی واقع ہو جائے گی۔

ہم ہمیشہ طبعی زندگی کے شعور کے تحت سوچتے ہیں

قرآن مجید میں آپ دیکھیے، جسے آپ جرم و سزا (Crime and Punishment) کہتے ہیں، اس کی پہل یعنی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ سوسائٹی کے جرم میں آپ دوسرے کا نقصان کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (6:20)۔ اس کے نقصان کی تلافی تو شاید آپ روپے پیسے دے کر کر دیں، معافی مانگ لیں مگر اس سے جو تمہارا اپنا نقصان ہو گیا ہے اس کی تلافی کون کرے گا۔ یہ کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ تمہاری اپنی تباہی ہے کیونکہ وَ اِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (6:26) تم دوسروں کی تباہی نہیں کر رہے، تم تو اپنے آپ کی تباہی کر رہے ہو مگر وَ مَا يَشْعُرُوْنَ (6:26)۔ مشکل یہ ہے کہ یہ جو طبعی زندگی کا شعور (Consciousness of Physical Life) ہے، وہ اس کی نگاہ سے سوچتے ہیں تو یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ انہیں پتہ یہی چلتا ہے کہ وہ دوسرے کو تباہ

---

[1] وہ تو تجھے خود ہی اٹھانا پڑے گا۔

کر رہے ہیں' حالانکہ وہ اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہوتے ہیں: وَ اَنۡفُسَهُمۡ كَانُوۡا يَظۡلِمُوۡنَ (7:177) یہ جو ظلم کرتے ہو' اس کے متعلق تو نظر آتا ہے کہ یہ ظالم ہے' دوسروں کے اوپر ظلم کر رہا ہے۔ یہ تو بین سی بات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ یہ جو دوسروں پہ ہو رہا ہے' وہ ظلم تو ان پہ ہو ہی رہا ہے مگر اَنۡفُسَهُمۡ كَانُوۡا يَظۡلِمُوۡنَ (7:177) یہ اپنے خلاف ظلم کر رہے ہیں۔

عزیزان من! آپ اس بنیاد کو سامنے رکھیے' اور پھر آپ قرآن کا جو نظامِ عدل ہے' جو یہ احتساب کا نظام ہے' جو جرائم کا' قانون شکنی کا نظام ہے' اس پہ نگاہ ڈالیے۔ آپ دیکھیے گا کہ اس میں یہ جو اس کی محسوس سزا (Concrete Punishment) ہے' اس کی تو حیثیت ہی ثانوی رہ جاتی ہے بلکہ یہ جسے آپ قانون شکنی یا جرائم کہتے ہیں' اگر معاشرے میں اس یمان والے لوگ بستے ہیں تو پھر جرم ہی نہیں ہوسکتا۔ وہ جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (573-634 AD) کے زمانے (632-634 AD) میں آپ نے مجسٹریٹی کی ایک پوسٹ (آسامی) Create (پیدا) کر دی تھی اور جسے کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45 AD) کو مجسٹریٹ کی حیثیت سے' جرائم کے فیصلے کرنے پر' مقرر کر دیا تھا' تو سال بھر کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ اس پوسٹ (آسامی) کو Abolish (ختم) کر دیجیے یہاں تو کوئی مقدمہ ہی نہیں آیا۔ عزیزانِ من! آہی نہیں سکتا۔ بھول چوک ہوسکتی ہے' سہواً لغزش ہوسکتی ہے اور سہواً لغزش کے متعلق تو قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ اس قسم کی لغزش کرنے والا اگر ندامت کے قطراتِ اشک اپنی پیشانی پہ لے آتا ہے' اور کہتا ہے کہ رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا (7:23) اے میرے نشو و نما دینے والے! مجھ سے بھول ہوگئی' سہو ہو گیا' لغزش ہوگئی' میں نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ مجھے بتا کہ میں کس طرح اس نقصان کی تلافی کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَ اَصۡلَحَ (6:54) واپس آئے اور صلاحیت بخش کام کرے۔ جسے آپ تمدنی زندگی کی عدالت بھی کہتے ہیں' اس میں قرآن نے یہ کہا ہے کہ اگر مجرم کہیں اس کیفیت سے آئے تو اس کو موقعہ دو کہ وہ اپنی اصلاح کرے یعنی وَ اَصۡلَحَ (6:54)۔

بار بار لغزش کرنے سے عزم ہی مفلوج ہو جاتا ہے

عزیزان من! قرآنِ کریم نے ہر جگہ ''تاب واصلح'' کہا ہے۔ وہ بشری کمزوریوں کا ذکر کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ لغزش ہو جائے' بھول چوک ہو جائے لیکن اس کے بعد اگر فوراً یہ احساس ہو گیا اور وہ احساس اتنا شدید ہوا کہ اس کی نگاہیں نہیں اٹھ رہیں۔ وہ جھکی ہوئی نگاہوں سے' قطراتِ ندامت سے آلود پیشانی کے ساتھ' وہاں آتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی' بھول ہوگئی۔ تو ٹھیک ہے یہ جو پیچھے سرزد ہو گیا ہے' اس کو تو جانے دیتے ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ وَ اَصۡلَحَ (6:54) پھر اس سے یہ کہو کہ اس پہ نگاہ رکھو۔ اگر بار بار تم سے اس قسم کی بھول ہوتی چلی گئی تو یہ چیز تمہارے اندر کمزوری پیدا کر دے گی' عزم نہیں رہے گا۔ اس لیے صلاحیت بخش کام کرو۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ اس لیے ہوا تھا کہ تم میں عزم باقی نہیں رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ عزم کس چیز کا نام ہے؟

عزم کا قرآنی مفہوم

عزم کسے کہتے ہیں؟ بھول چوک کیوں ہوتی ہے؟ عزم کی کمزوری کیوں ہوتی ہے؟ سنیئے عزیزانِ من! یہ جسے آپ ارادہ یا عزم کہتے ہیں، یہ تو آپ کے اس Self (ذات)، اس خودی، اس نفس، کا فیصلہ ہوتا ہے۔ مثلاً میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ''میں'' آپ کا یہ کام کردوں گا۔ اس میں یہ ''میں'' کون ہے جس نے یہ وعدہ کیا ہے؟ یہ ''میں'' آپ کے جسم کا تو نام نہیں ہے، آپ کی زبان نے وعدہ نہیں کیا آپ کے ہاتھ نے یہ کچھ نہیں کیا۔ یہ کیا ہے؟ یہ ''میں'' ❶ ہے۔ جب آپ وہ وعدہ پورا نہیں کرتے تو سوال یہ ہے کہ آپ یہ کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے کہ اس وقت یہ ''میں''، جس نے کہا تھا ''میں کروں گا''، وہ ''میں'' نہیں رہتی۔ اس وقت کوئی اور ''میں'' ہوتی ہے۔ یہ جو ''میں'' کی تبدیلی ہے، یہ انسانی خودی یا نفس کی کمزوری ہوتی ہے۔ یہ جو نشو ونما یافتہ، پختگی یافتہ ''میں'' ہوتی ہے، اس کی پہلی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ وہ میں ''میں'' رہتی ہے، آج بھی وہ ''میں'' ہے، دس سال کے بعد بھی وہی ''میں'' میں ہوگی۔ ٹھیک ہے ، میں نے ہی آپ سے یہ کہا تھا، میں ہی وہاں تھا۔ یہ ایک وقت کا نکاح کے عقد کے لیے جو آپ ایجاب وقبول کرتے ہیں، یہ ساری عمر کیسے قائم رہتا ہے؟ وہ ''میں'' ہی تو ہوتی ہے جس نے یہ ایجاب وقبول کیا تھا۔ یہ ساری عمر وہی رہتی ہے۔ اگر وہ میں ''میں'' نہ رہے، قصہ ہی ختم ہو جائے۔

یہ جو ''میں'' کا اس طرح سے وہی رہنا ہے، یہ ہے ''میں'' کی پختگی کا ثبوت، یہ ہے دلیل سند کہ یہ وہی رہے۔ کوئی شخص جو بار بار وعدہ کرے، بار بار پھرتا چلا جائے، اسے آپ ویسے ہی بے اصولا پن کہہ لیجیے، آپ وعدہ خلاف کہہ لیجیے۔ یہ الفاظ ہیں، جو آپ اس کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ اس کی ''میں'' کی پختگی نہیں ہوتی۔ پختہ ''میں'' تو بدلتی نہیں، وہ ایک جیسی رہتی ہے۔ اگر یہ کچھ ایک فقرے کے اندر کہا جائے تو وہ برگسان (1859-1941) ہے، جس نے یہ چیز کہی ہے کہ یہ ''میں'' Changelessness in change ❷ ہے۔ اس تغیراتی دنیا میں وہ اسے عدمِ تغیر کہتا ہے۔ اس لیے اس نے اس کا نام ''میں'' رکھا اور بڑی ہی عمدہ Definition (تعریف) دی ہے۔ برگسان تو یہ کہتا ہے کہ We change without ceasing ❸ حالات کی تبدیلیاں ہوتی ہیں لیکن ''میں'' ویسے ہی برقرار رہتی ہے۔ یہ وہی ہے جو میں نے کہا تھا کہ جب دودھ کے اندر ملا ہوا کریم، مکھن کا پیڑا بن جاتا ہے تو اسے سارا دن پانی میں ڈالے رکھو، اس کا پانی بدلتے رہو، دوسرا پانی ڈالتے چلے جاؤ، وہ نہیں بدلتا۔ او پیڑا او سے طراں دا اس طرح ای رہندا ہیگا اے، کیونکہ اس دودھ دا مکھن پک گیا ہوندا اے، پختگی آ گئی ہوئی ہوندی او ہدے اندر۔ ❹ وہ نہیں بدلتا لیکن ہر آن بدلنے والا جو شخص ہے، یاد رکھیے اس کے

---

❶ I - am- ness ❷ تغیر میں عدمِ تغیر ❸ ہم میں تغیر آتا ہے معدوم ہوئے بغیر۔

❹ وہ پیڑا اسی طرح کا اسی طرح رہتا ہے کیونکہ اس دودھ کا مکھن پختہ ہو چکا ہوتا ہے، اس میں پختگی آ چکی ہوتی ہے۔

لیے آپ معاشرتی نقطہ نگاہ سے کوئی بھی لفظ استعمال کر لیجیے' قرآنی نقطہ نگاہ سے یہی کہیں گے کہ اس کی ''میں'' اس کے نفس' اس کی Self (ذات) میں پختگی نہیں آئی۔ وہ ابھی خام ہے۔ اس کا نام کیریکٹر ہے۔

انسانی ذات کا' یا نفس کا' یا ''میں'' کا تغیر پذیر ہونا کیریکٹر کی نفی ہے

عزیزان من! یہ Characterless (بے کردار) کون ہے؟ یہ وہ ہے جس کی اس وقت ''میں'' کچھ اور ہے' شام کو یہ ''میں'' کچھ اور ہے۔ برگسانی مکتب فکر کے علم بردار تو اس حد تک آگے جاتے ہیں۔ برگسان (1859-1941ء) یہ لکھتا ہے کہ رات کو سوتے وقت آپ تہیہ کرتے ہیں کہ میں صبح چار بجے ضرور اٹھونگا حتیٰ کہ آپ بعض اوقات الارم بھی لگاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ الارم لگانا بھی تمہاری' ناپختگی کی نشانی ہے۔ اپنے آپ پہ تمہیں بھروسہ نہیں ہے' اس لیے خارجی سہارا ڈھونڈ رہے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ اس خارجی سہارے کے باوجود' ہمارے' آپ کے' ساتھ یہ ہوتا ہے' کہ مثلاً سردیوں کی رات ہو' تے لحاف لپیٹیا ہووے نال [1]۔ معاف رکھیے گا' بیٹیو! اب آپ یہ سارا کچھ اتنی سی پنجابی میں سمجھ جاتی ہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ سردیوں کی رات ہو تو چار بجے' آخری شب میں' تو نیند بھی زیادہ گہری ہوتی ہے۔ یہ سوئے ہوئے ہوں' اس وقت بغیر الارم ٹائم پیس کے تو بات ہی نہیں۔ وہ بھی اگر بجے تو وہ ذرا سا یوں یوں کر کے' الارم بند کر دے' اوتے ہتھ مار کے او الارم بند کر دے' کوئی گل نئیں چھ وجے وی چلیا جاواں گا۔ [2] وہ کہتا کہ یہ کیا چیز تھی کہ رات کو دس بجے والی ''میں'' نے جب کہا تھا کہ ''میں'' نے صبح چار بجے اٹھنا ہے اور صبح چار بجے جو آپ کی ''میں'' ہے' وہ یہ کچھ کر رہی ہے۔ تو کہا کہ سوچو تو سہی' اگر رات والی ''میں'' ہوتی تو کیا وہ کبھی یہ کرتی؟ یہ ''میں'' وہ نہیں رہی۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے' عزیزامن! اور جیسا میں نے عرض کیا تھا' اب تو وہ دور آ گیا ہے جو قرآن نے کہا تھا کہ تم انفس و آفاق میں ہماری نشانیاں دیکھو گے جو قرآن کے حقائق کے لیے سند اور ثبوت بنتی جائیں گی' تو جسے آپ ''میں'' کہتے ہیں' ایہدا تے کریکٹر ای کوئی نئیں ہیگا: اج کچھ کیندا' کل کچھ کیندا' اج کچھ کردا' کل کچھ کردا' مینوں کچھ کیندا تینوں کچھ کیندا۔ [3] وہ کہتا ہے کہ یہ جسے آپ Characterlessness (بے کرداراپن) کہتے ہیں' وہ کیریکٹر کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ جو اس کی ''میں'' ہے' اس کی پختگی کا نام کیریکٹر ہے۔ اسی کو عزم کہتے ہیں۔

''میں'' کی پختگی کے ذرائع

اب قرآن ایک اور بات کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو پختگی ہے اس کا اِظہار کوئی کفر کے اندر کرتا ہے' کوئی ایمان کے اندر کرتا ہے۔

---

[1] لحاف لپیٹا ہوا ہو۔ [2] وہاں ہاتھ مار کر الارم بند کر دے (اور کہے کہ) کوئی بات نہیں چھ بجے چلا جاؤں گا۔

[3] اس کا تو کوئی کردار ہی نہیں ہے: آج کچھ کہتا ہے' کل کچھ اور۔ آج کچھ کرتا ہے' کل کچھ اور۔ مجھے کچھ کہتا ہے' آپ کو کچھ اور۔

آگے بات تو اس اظہار کے ذرائع کی رہ جاتی ہے' پختگی کی بات اور ہے۔ قرآن میں جو آخری وقت میں فرعون نے ڈوبتے وقت کہا تھا کہ یا اللہ! میں موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے خدا پہ' ایمان لایا تو بظاہر ہمارے آپ کے' مولوی صاحب کے نزدیک' تو اسے اس وقت دریا سے نکال کر گلے لگا لینا چاہیے تھا کہ تو بہ نصیب ہوگئی یعنی مرتے وقت تو بہ نصیب ہوگئی' لیکن دیکھیے خدا کے ہاں سے کیا جواب ملا تھا؟ جواب یہ ملا تھا کہ فٹے منہ تیرا۔ ہور کچھ نئیں' موت نوں سامنے ویکھ کے کفر توں منکر ہو گیا ایں۔ عزم ای تیرے اندر نئیں ہیگا۔ [1] عزم کی تو وہ بات ہے' عزیزان من! یہ ہے عزم کی پختگی۔ ٹھیک ہے توبہ کی بڑی گنجائش ہے لیکن موت کو دیکھ کر اس ڈر سے پہلی چیز کو چھوڑنا تو یوں ہے کہ اس میں کیریکٹر نہیں رہا۔

پختہ ''میں''، تو موت کو دیکھ کر بھی نہیں بدلتی

تو یہ کفر کی بات ہے' عزیزان من! اور اگر کہیں یہ بات ایمان کے اوپر آجائے' قرآن کریم کے اقدار (Values) کے اوپر آئے' جنگ کے کھڑے ہونے کے لیے آئے تو پھر کیا ہو؟ یعنی جب کسی کے لیے یہ عزم پیدا ہو جائے تو پھر کیا ہوتا ہے؟ اگر وہ اس جنگ میں اپنی اس طبعی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تو وہ زندہ جاوید ہو جاتا ہے' اسے آپ شہید کہتے ہیں۔ اسے شہید کہا' جو موت کو دیکھ کر بھی نہیں بدلتا۔ عزیزان من! یہ فرق ہوتا ہے ایک فرعون کی توبہ میں اور ایک شہید کے میدان جنگ میں جانے میں۔ ایسا کرنے سے اس کا عزم نہیں بدلتا۔ اس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ یہ مصائب و آلام آتے ہیں تو آتے رہیں کیونکہ اس جدوجہد میں بیشتر مواقع ایسے آئیں گے کہ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ (2:155) جن میں تمہیں اس امر کا اندازہ ہو سکے گا کہ تمہاری صلاحیتوں کی کس حد تک نشو ونما ہو چکی ہے۔ اس میں کہیں جنگ و قتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہوگا' کہیں سامانِ خورد و نوش کی کمی ہوگی' کہیں مال اور جان کا نقصان ہوگا' کہیں کھیت اور باغ اجڑ جائیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا کے اندر آپ دیکھو گے کہ ٹکراؤ آئے گا' تصادم پیدا ہوگا' جس سے بڑے بڑے نقصانات ہونگے۔ تباہیاں آجائیں گی' فصلیں تباہ ہو جائیں گی' ظلم ہوگا۔ یہ سب چیزیں ہونگی' تصادمات ہونگے' جنگیں ہونگی لیکن یہ سارے مشکل مراحل جسے آپ آزمائش کہتے ہیں' آئیں گے۔ ان تمام کا مقصد و مدعا صرف یہ ہوگا کہ اس امر کا اندازہ لگایا جا سکے کہ تمہاری صلاحیتوں کی نشو ونما کس حد تک ہو چکی ہے۔

خدا کسی کو نہیں آزماتا بلکہ انسان اپنے عزم کی آزمائش کرتا ہے

عزیزان من! ہمارے ہاں تو یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آزمائش کرتا ہے (معاذ اللہ)۔ اللہ آزمائش کرتا ہے!! اس کو تو ہمارا سب پتہ

---

[1] تف! لعنت تجھ پر۔ اور کچھ نہیں ہو سکا تو موت کو سامنے دیکھ کر اپنے ہی کفر کا منکر ہو گیا۔ تجھ میں تو عزم ہی نہیں ہے۔

ہوتا ہے۔ اس نے ہمیں کیا آزمانا ہے؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ تمہاری اپنی آزمائش کے مواقع ہوتے ہیں جن میں You test Yourself [1] یعنی ان سے مقصد یہ ہے کہ اپنی اس خودی کی آزمائش کرتے جاؤ کہ یہ ان تصادامات میں کس حد تک پختہ ہے' کیونکہ جتنی پختگی کسی کے عزم میں ہوتی ہے۔ اسی قدر اس کی ذات کی' اس کے عزم کی' نشوونما ہوتی چلی جاتی ہیں اور وہ ہنستے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ہر نیا تصادم' ہر نئی تکلیف' ہر نئی مصیبت کے آنے پر وہ کہتا ہے کہ کیا ڈراتے ہو۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (2:156) ہم تو اس کی اقدار (Values) کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکے ہیں۔ ہر مصیبت اور ہر تصادم کے بعد ہمارا قدم اسی کی طرف اٹھے گا۔ تم ہٹا کے دیکھ لو ہٹا نہیں سکو گے۔ یہ ہے: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (2:156)۔ یہ بڑی پختگی ہے عزم کی۔

عزیزان من! ہمارا قدم کسی اور طرف نہیں جا سکتا۔ اسی لیے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے کیریکٹر کے متعلق جو بات قرآن نے کہی ہے' وہ یہ ہے کہ وہ اولوالعزم تھے۔ ایمان ہو' اقدار خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا پورا پورا عزم ہو یعنی یہ کیفیت ہو' پھر اس میں پختگی ہو' پھر کیا اس معاشرے میں جرائم سرزد ہو سکتے ہیں؟ نہیں۔ اسی لیے قرآن یہ کہتا ہے کہ جب تک تمہارے اندر یہ تبدیلی پیدا نہیں ہوتی' خارج میں تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی' خواہ آپ کتنا ہی اس قسم کا یہ نظام بناتے چلے جائیں۔ تغیر نفس لازمی امر ہے۔ اس کے بغیر خارج میں تبدیلی ممکن نہیں۔

قانون بنانے اور قانون توڑنے والے دونوں ہی انسان ہوتے ہیں

آپ دیکھیں گے کہ اِدھر قانون بن رہا ہوتا ہے' اُدھر انسان قانون شکن تدبیریں سوچ رہا ہوتا ہے کہ کس طرح اس قانون سے نکلنا ہے۔ وہ قانون بنانے والے بھی انسان ہوتے ہیں' یہ توڑنے والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ یہ ان بنانے والوں سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں' نابغہ (Genius) ہوتے ہیں' یہ اس قانون سے بچ نکلنے کی راہیں تلاش کر لیتے ہیں۔ روز یہی کچھ ہوتا ہے۔ جو پکڑے نہیں جاتے وہ ان کا جو احتساب کا اور عدل کا نظام ہوتا ہے اس کے اندر ہزار رخنے ہوتے ہیں' وہ ان سے بچ نکلتے ہیں۔ وہاں بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اتنی سی ہی تمہید کافی ہو جائے گی ورنہ یہ موضوع تو ایسا ہے کہ اسی کے اوپر ہم چلیں تو کتنے درس ہو سکتے ہیں اور یہ بڑا ہی بنیادی ہے۔

عزیزان من! معاشرے میں آپ یہ کہیں نہیں سنیں گے کہ یہ جرائم کیسے ختم ہونگے اور کس طرح معاشرہ صحیح ہوگا اور کیسے معاشرے کی اصلاح ہوگی؟ وہ سارے اربابِ حکومت انہی خطوط پر کام کر رہے ہیں جن پر وہ سیکولر نظام (Secular System) یا سیکولر سوسائٹی

---

[1] تم اپنی صلاحیتوں کی جانچ کرتے ہو۔

(Secular Society) والے آتے ہیں کہ پولیس اس قسم کی ہونی چاہیے عدالتیں ایسی ہونی چاہئیں اس کی سزائیں قسم سخت کر دو جیل خانہ ایسا ہونا چاہیے یہ اوپر والا سارا ہی نظام اس پر قائم ہے۔ زندگی کی اس تبدیلی کا کوئی بھی نام نہیں لیتا۔

نفسیاتی تبدیلی کے متعلق کوئی نہیں سوچتا

عزیزان من! یہ جو چیز ہے کہ اندر کی تبدیلی کس طرح ہونی چاہیے کسی کا بھی ادھر خیال نہیں جاتا۔ آپ یہ جتنی بھی اصلاحات (Reforms) کہتے ہیں یہ کافروں کی سلطنتوں کے اندر بھی ہیں۔ یہی اصلاحات وہ سوچتے اور کرتے ہیں۔ وہاں آپ سے زیادہ Perfection (اکملیت) ہوتی ہے پھر ان میں اور آپ میں کیا فرق ہے؟ وہ تو اتنی Perfection (اکملیت) کے باوجود ناکام رہ رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ یہ بڑا ہی اہم اور بنیادی سوال ہے۔

امریکہ کی اندرونی نفسیاتی کیفیت

اس ناکامی کی صورت ذرا آپ امریکہ کے اندر دیکھیے۔ نظر بظاہر وہ لوگ بڑے امن سے رہتے ہیں کوئی کسی کی چیز نہیں چراتا کسی پہ کوئی ڈاکا نہیں ڈالتا۔ یہ سارا کچھ وہ نظام ہے۔ دو ایک مہینے ہوئے ہیں[1] وہاں سارے نیویارک میں ایک رات بجلی فیل ہوئی تھی یہ سارا نظام موجود تھا صرف اتنا ہی ہوا تھا کہ کوئی دیکھنے والا نہیں تھا گو کہ چوکیدار سپاہی وہ سب اسی طرح پھر رہے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ صبح تک نیویارک کی ساری ہی دکانیں ایک ہی رات میں لٹ چکی تھیں۔ یہ کیا تھا؟ اندر تبدیلی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ یہ ساری باہر کی تبدیلی ہے۔ ساری دنیا جرائم سے بھری ہوئی ہے۔ قوانین کو سزاؤں کو جتنے زیادہ سخت کرتے جاتے ہیں اتنے ہی جرم اور بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ خارجی دباؤ کے اس جبر سے ان خیالات سے ان جرائم سے جو کمزور اعصاب کے لوگ ہیں وہی بچتے ہیں۔ آہ!

عصمت بی بی از بیچارگی[2]

ذرا کسی کے اعصاب مضبوط ہو جائیں اور وہ اس قسم کی تدبیریں اپنے ساتھ کر لے تو پھر راوی عیش لکھتا ہے۔ عزیزان من! اس طرح جرائم ختم ہو ہی نہیں سکتے۔ دنیا نے اپنے کفر کے نظام کو آزما کر دیکھ لیا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اب ہم بھی قرآن کریم کی یہ چیزیں پیش ہی کر سکتے ہیں عملاً تو ہم بھی کہیں کسی کو دکھا ہی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اسلام ایک سماجی نظام (Social System) کا نام ہے۔ آپ نے اپنے نظام کا نام مسلمان معاشرہ رکھ لیا۔ آپ اسلام نام رکھ کر جو جی میں آئے کر لیجیے کہ یہ قوانین ہم ایسے نافذ کریں گے اس سے تو کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ آج اس نظام میں اور اس نظام میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا عزیزان من!

---

[1] یعنی 1977ء میں ہی [2] یہ مثل ہے کہ ''بے سروسامانی کی وجہ سے پارسا بنے رہنا''۔

یہ جو اس دیدہ ور ❶ نے کہا تھا کہ

یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری ❷

یہ مسلمان نام رکھانے والی قومیں، یا وہ قومیں جنہوں نے مسلمان نام نہیں رکھا، اس اعتبار سے ساری کی ساری زناری ہیں۔ یہ جو اندر کی تبدیلی (Change From Within) ہے، جس کے اوپر باہر کی تبدیلی (Chane From Without) کا مدار ہے، اس پہ نہ اُن کی نگاہ ہے، نہ اِن کی۔ یہاں جب بھی بحث ہوتی ہے، وہ بتائیں گے کہ صاحب! یہ دیکھیے یہ اسلام میں جرائم کی سزائیں ہیں، یہ یہاں کے قانون ہیں، ان میں یہ سختی ہے، یہ صلابت ہے۔ اس کی رو سے آگے پھر یہ دیکھیے کہ کیا ان سے یہ جرائم بند ہوتے ہیں؟ جواب ہے نہیں، قطعاً نہیں۔

طبعی سزاؤں کا تعلق صرف بدن تک ہوتا ہے، اندر کی اصلاح سے نہیں

یہ وہی خارجی جرائم کی خارجی سزائیں ہیں، ان کا تعلق بدن تک ہے۔ جو اندر کی اصلاح ہے، اس کے متعلق کبھی بات ہی نہیں ہوتی۔ باقی دنیا نے یہ کچھ کر کے دیکھ لیا۔ آپ بھی کر کے دیکھ لیجیے۔ ہم تو ان سے بہت پیچھے ہیں۔ قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے یہ اعلان کیا تھا کہ **لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ** ❸ (13:11)۔ اصلاح صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ آپ کے زندگی کے تصور یعنی نظریہ حیات کے لحاظ سے آپ میں تبدیلی ہو، آپ کی خودی میں تبدیلی ہو، آپ کے نفس (Self) میں تبدیلی ہو، یعنی اس میں پختگی آئے۔ جب آپ کسی سے یہ کہہ دیں کہ ہاں میں تمہارے لیے یہ کرونگا تو پھر دل و جان سے اسے پورا کرنے کی تگ و تاز میں سرگرم عمل ہو جائیں، پھانسی کے تختے پہ بھی چڑھ جانا پڑے، تو پھر اس کے بعد تمہاری ''میں'' ❹ نہیں بدلے گی کیونکہ ''میں'' وہی ہے جس نے کہا تھا کہ میں کرونگا، ''میں'' یہ نہیں کرونگا۔ جب آپ کی ''میں'' نے اندر سے یہ کہہ دیا ہے اور ''میں'' ہر آن وہی ہے تو پھر یہ نہیں کریں گے کیونکہ کہنے والا تو وہی ہے۔

بدن تو پورے کا پورا وہی ہوتا ہے مگر ''میں'' وہ نہیں ہوتی

عزیزان من! جسے آپ کہتے ہیں کہ دیکھو جی! او جھٹ بدل جاندا ہیگا۔ ❺ اس کا کیا بدل جاتا ہے؟ اس کا چہرہ تو اسی قسم کا ہوتا ہے، منہ

---

❶ یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

❷ مفکر قرآن علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938) نے ''ضرب کلیم'' میں ''مردان خدا'' کے عنوان سے انہیں یوں مخاطب کیا ہے:

وجود انہی کا طواف بتاں سے ہے آزاد — یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری (اقبالؒ)

❸ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی — نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

❹ I am - ness ❺ وہ فوراً بدل جاتا ہے۔

اسی قسم کا ہوتا ہے‘ رخ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ اس کا کیا بدل جاتا ہے جو کہا کہ جھٹ بدل جاتا ہے؟ اس کی وہ کیا چیز بدل جاتی ہے؟ اس کے لیے تو ہمارے پاس کوئی لفظ بھی نہیں ہے۔ بس لفظ وہی ہے کہ اس کا Self (ذات) بدلتا ہے‘ اس کی خودی بدلتی ہے‘ اس کی ’’میں‘‘ بدلتی ہے اور پھر اسے میں دہراووں کہ جسے آپ Characterlessness (بے کرداراپن) ہونا کہتے ہیں‘ جسے کیریکٹر نہیں ہے کہتے ہیں‘ وہ یہ ہے کہ ہر آن اس کی ’’میں‘‘ بدلتی ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ’’میں‘‘ نہیں بدلتی تھی

حضرات انبیاء کرام کے متعلق بھی قرآن نے یہ کہا ہے کہ وہ اولوالعزم تھے‘ ان کا Determination (عزم) ایسا تھا کہ ان کی ’’میں‘‘ نہیں بدلتی۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ پچھلی سورۃ جو ختم ہوئی تھی‘ اس میں اور اس اگلی سورۃ کے اندر‘ کتنا ربط ہے۔ یہاں سے بظاہر نظر آئے گا کہ صاحب! یہ تو جرمِ زنا کی بات شروع ہوگئی۔ یہاں اس نے ایک جرم بتادیا‘ جرم کی ایک سزا بتادی۔ اب سزا میں ہی کچھ اختلاف ہوسکتا ہے‘ ورنہ زنا کا جرم تو جرم ہوتا ہے۔ تو اتنی سی بات ہے کہ یہاں یہ سزا ہے‘ وہاں وہ سزا ہے۔ بس اس میں آپ کے ہاں کا خدا کا دین ہوگیا اور وہ انسانوں کا بنایا ہوا ہوگیا۔ بس اتنی سی بات سے یہ دونوں الگ الگ ہوگئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس سزا دینے سے یہ جرم ختم ہو جائے گا؟ یاد رکھیے! سزا دینے سے جرم ختم نہیں ہوگا‘ صرف اِس سزا میں اور اس سزا میں فرق ہے‘ سزا تو وہاں اس سے بھی زیادہ شدید ہوسکتی ہے۔

سوسائٹی کی طرف سے ملنے والی سزا جرائم کو ختم نہیں کرسکتی

سزا صرف سوسائٹی کے نظام کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے‘ جرائم کو ختم کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ سزاؤں سے جرائم ختم نہیں ہوتے۔ آپ سزائیں دیئے جارہے ہیں۔ ہر سال آپ کے جیل خانے چھوٹے ہوتے جارہے ہیں۔ وہ کیسے چھوٹے ہوتے جاتے ہیں؟ اوسنگڑ دے جاندے نیں۔ [1] آپ کے ہاں مجرموں کی ہر سال اتنی زیادہ تعداد چلی جاتی ہے کہ وہاں جگہ ہی نہیں رہتی اور اس سزا سے جرم کہیں بھی نہیں رکتا۔ تو یہ ہے وہ بنیاد‘ عزیزان من! سوسائٹی میں جرائم کو روکنے کی۔ صرف روکنے کی ہی نہیں بلکہ یوں کہیے کہ پھر تو جرم سرزد ہی نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ کہیں لغزش ہوسکتی ہے‘ سہواً ایسا ہوسکتا ہے۔ سہواً کے بعد جب بھی وہ ’’میں‘‘ جاگ اٹھتی ہے‘ جسے ندامت کہتے ہیں‘ وہ اس کی پکار ہوتی ہے۔

---

[1] وہ سمٹتے چلے جاتے ہیں۔

عزیزان من! اب اس درس کا تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے' اس تھوڑے سے وقت میں ہی کوئی بات کر سکوں گا۔ اس سورۃ کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ سُوۡرَۃٌ اَنۡزَلۡنٰہَا وَ فَرَضۡنٰہَا وَ اَنۡزَلۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ (24:1)۔ اس سورۃ کو بھی دیگر قرآنی سورتوں کی طرح ہم نے نازل کیا ہے اور اس کے احکام کو بھی قرآن کے دیگر احکام کی طرح (28:85) اطاعت کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں واضح احکام دیئے گئے ہیں تا کہ تم اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھو کہ وہ کون سے امور ہیں جن کی تعمیل ضروری ہے اور کون سے ایسے ہیں جن سے بچنا لازمی ہے۔ ویسے تو سارا قرآن منزل من اللہ ہے۔ یہاں کہا یہ ہے کہ یہ سورۃ بھی اسی طرح ہے جس طرح قرآن کی باقی سورتیں خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ میں اسے پھر دہرا دوں کہ جسے ہم خدا کی طرف سے نازل ہوئی کہتے ہیں' اسے یوں ماننا کیوں ضروری ہے؟ یہ ماننا اس لیے ضروری ہے کہ ان کے متعلق کہا ہے کہ تَمَّتۡ کَلِمَۃُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ❶ (6:115)۔ ان قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔ یہ ہے اصل بات۔ سوسائٹی کے نظام میں آپ کوئی سا قانون بھی بنا لیجیے' اس کے آئین کے اندر یہ شقیں موجود ہوتی ہیں کہ ان میں تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں' مگر یہ ایسے قوانین ہیں کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا صرف ان کی جزئیات (By Laws) وقت کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔

قرآن حکیم نے اپنے ہاں قانون کی بجائے اقدار کا لفظ استعمال کیا ہے

میں نے کہا ہے کہ میں قوانین کا لفظ تو آج کی اصطلاح میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں ورنہ قرآن میں قانون کا لفظ نہیں آیا ہے۔ وہاں تو اقدار (Values) ہی کا لفظ ہے۔ اور عزیزان من! قانون (Law) میں اور Values (اقدار) میں بڑا فرق ہے' قرآن Values (اقدار) دیتا ہے۔ وہ Values (اقدار) کی خلاف ورزی کے متعلق پہلی چیز یہ کہتا ہے کہ اس سے تمہاری ذات (Self) متاثر ہوگی۔ یہ ہماری سوسائٹی کی اصطلاح ہے جس میں ہم اس کو قانون کہتے ہیں۔

اسلامی نظام وہی ہوگا جہاں Values (اقدار) کا نفاذ ہوگا

میں یہاں پھر دہرا دوں کہ اسلامی نظام اسے کہیں گے جہاں' یہ غیر متبدل Values (اقدار) قانون کی حیثیت اختیار کر لیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہ کر سکے۔ ان کی Implementation (نفاذ) کے قاعدے' ضابطے' پروگرام' تفصیلات' جزئیات (By Laws) تو بدلتی رہیں گی لیکن جنہیں آپ غیر متبدل Values (اقدار) کہتے ہیں' آپ انہیں قانون کہہ لیں' یہ نہیں بدلیں گی۔ انہیں منزل من اللہ کہا ہے۔ یہ ہے انہیں ماننے کی لِم۔ اب سوال یہ ہے کہ انہیں کیوں مانا جاتا ہے؟ یہ وحی کے متعلق تو کہتے ہیں کہ صاحب! کوئی بات نہیں ہے۔

---

❶ اس قرآن میں خدا کا ضابطہ قوانین' تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے' مکمل ہو چکا ہے۔ اب ان قوانین خداوندی میں کوئی تغیر و تبدل کرنے والا نہیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن' ص۔317)

ہم انہیں مانتے ہیں جھوٹ بولنا بری بات ہے' زنا بری چیز ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ چیز منزل من اللہ ہے' یعنی یہ خدا نے دی ہے۔ اس لحاظ سے اب ان میں اور ہم میں کیا فرق ہے؟ عزیزانِ من! اس میں فرق یہ ہے کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115)۔ اب ان قوانینِ خداوندی میں کوئی تغیر وتبدل کرنے والا نہیں ہے۔ اس کے بعد دیکھ لیجیے کہ صورتِ حال کیا بنتی ہے۔ قوانین میں تغیر وتبدل ہونے کی بہترین مثال امریکہ کے صدر کی ہے۔

امریکہ کا صدر بدلے تو دنیا کی حکومتوں میں تزلزل آجاتا ہے

عزیزان من! آپ دیکھ لیجیے کہ امریکہ کا President (صدر) بدلتا ہے' تو ساری دنیا کی حکومتوں کی بنیادوں میں تزلزل آجاتا ہے۔ دو تین مہینے پہلے سے حکومتیں اپنے اپنے پروگرام معطل کر کے بیٹھ جاتی ہیں کہ ٹھہر جاؤ! دیکھیں' امریکہ کے انتخاب ہونے والے ہیں' President (صدر) کا الیکشن ہونے والا ہے۔ تمہیں کیا اس سے؟ کہا کہ جی! بہت بڑی چیز ہے' ساری پالیسی بدل جائے گی۔ پالیسی بھی عجیب اصطلاح ہے۔ وہاں تو Honesty (ایمانداری) کو بھی The Best Policy (بہترین پالیسی) کہا جاتا ہے یعنی Honesty is the best policy[1] یہ ایمانداری بہترین پالیسی ہے۔ اسے حکمتِ عملی' مصلحتِ وقت' مفاد پرستی کہیے' اور یہیں اسی لفظ سے آپ کی یہ پالیٹکس (Politics) ہے۔ اسی کے تابع آپ نے پولیس (Police[2]) بنائی ہوئی ہے۔ پالیسی بدلتی ہے تو یہ تمام مبادیات (Derivatives) ہر آن بدلتی ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کفر اور ایمان میں فرق کیا ہے؟ اسلام کہتے کس کو ہیں؟ غیر متبدل اقدار خداوندی' معاشرے میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہوں تو پھر دونوں باتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ فرد کی ذات پہ جو اثر پڑتا ہے وہ تو پہلے ہی پڑ چکا ہے' اس کے لیے اس لمبے چوڑے Process (عمل) کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ تو ہو گیا۔ اب چونکہ یہ فرد معاشرے کے اندر رہتا ہے اس لیے معاشرے کے اوپر بھی اس کے اس عمل کا اثر پڑتا ہے۔ معاشرے کو اس سے محفوظ رکھنے کے لیے ان اقدار کو قانونی حیثیت دے کر نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ اسلامی نظام کہلاتا ہے۔ جسے یہ لوگ اسلام کہتے ہیں اس پر بڑے مباحثے اور مناظرے ہوتے ہیں اور پتہ نہیں کہ کیا کیا ہوتا ہے۔ وہاں تو یہ ہے کہ یہ کافر ہو گیا' یہ کفر ہے' یہ ایمان ہے' یہ شریعت ہے۔ بس وہاں بات تو اتنی سی ہی رہتی ہے مگر:

---

[1] ایمانداری بہترین پالیسی ہے۔

[2] Policy کے لفظ سے ہی Politics اور Police کے الفاظ ماخوذ ہیں۔

تفصیل معنی غم الفت طویل ہے
اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

تمدنی نظام کو غیر متبدل اقدار کے تابع کر دینے کا نام اسلامی حکومت ہے

عزیزان من! اتنی سی بات ہے کہ تمدنی نظام کو خدا کی دی ہوئی ساری غیر متبدل اقدار کے تابع قوانین کی حیثیت سے نافذ کرنا ہے۔ ان کے مطابق معاشرے کو متشکل کرنا ہے۔ یہ اسلامی نظام ہے۔ یاد رکھیے! جب یہ معاشرے میں اس طرح نافذ ہوتی ہیں تو اسے الدین کہا جاتا ہے۔ اب آپ دیکھ لیجیے گا کہ جب کسی معاشرے کے اندر الدین ہو تو میں نے کہا کہ سہو ولغزش کے سوا اس معاشرے میں جرائم کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا اور جب اس کو غیر متبدل مانا جائے تو اس کا سوال ہی نہیں کہ جرائم کا ارتکاب ہو۔ امریکہ کا President (صدر) تو ایک طرف رہا اپنے ہاں بھی یہ سوال نہیں رہتا کہ کون برسر اقتدار آ گیا ہے۔ دراصل برسر اقتدار آنے کی یہ اصطلاح بھی بڑی غلط چیز ہے۔ یہ اقتدار ان کے ہاتھ میں ہوتا ہی نہیں۔ یہ تو ان اقدار کو نافذ کرنے کی ایک مشینری ہوتی ہے۔

قائداعظمؒ کی ❶ قرآنی بصیرت

اس دیدہ ور ❶ نے، جسے یہ مغرب زدہ اور پتہ نہیں کافر اعظم اور کیا کیا کہا کرتے تھے، معلوم نہیں، کہاں سے یہ چیزیں سمجھی تھی۔ قائد اعظم محمد علی جناحؒ کا یہ ارشاد ہے کہ ہماری پابندی اور آزادی کی حدود خدا کی اقدار مقرر کرتی ہیں۔ جسے آپ اسلامی حکومت کہتے ہیں وہ ان اقدار کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہے۔ کیا بات تھی اس شخص کی! جبکہ اس قائدؒ کے ❶ متعلق کہا یہ جاتا تھا کہ اس کے خیالات اور نظریات میں ایک چھینٹ بھی اسلام کی نظر نہیں آتی۔ ٹھیک ہے جی، جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ اظہار خیال کی آزادی (Freedom of Expression) کا زمانہ ہے، جس کے متعلق جو جی میں آئے کہہ دیجیے۔ میں کہتا ہوں کہ جس شخص کو کچھ بھی قائداعظمؒ ❶ کے متعلق معلوم نہ ہو، صرف اتنی سی بات معلوم ہو جو انہوں نے حیدآباد دکن میں کی، تو ان کا تصورِ دین اسلام سمجھ میں آ جاتا ہے۔ قائداعظمؒ سے پوچھا گیا تھا کہ اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟ ''انہوں نے کہا کہ میں نہ تو مولوی ہوں، نہ ملا ہوں۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں۔ میں نے اپنے طور پہ قرآن کا کچھ مطالعہ کیا ہے۔ اس سے میں اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں کہ اسلامی حکومت اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے، نہ کسی ادارے کی، نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی انسان ساز قانون کی۔ اس میں خدا کی دی ہوئی اقدار ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتی ہیں اور اسلامی حکومت ان اقدار کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔

---

❶ قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948)

قرآن سے دور رکھنے کی سازش

برادرانِ عزیز! سوچیے اسلام اور اسلامی نظام کی' اس سے زیادہ جامع تعریف کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ پچھلا [1] (Qaid-e-Azam Year) (سالِ قائداعظم) سارا سال گزر گیا۔ اس میں آپ نے ہزاروں سیمینار اور بیسیوں مذاکرات منعقد کیے۔ بیانات جاری کیے' تقاریر کیں' کتابیں بھی کہتے ہیں کہ دوسو کے قریب لکھی گئیں' مقالات لکھے گئے۔ یہ سارا کچھ آپ لوگوں نے دیکھا بھی ہوگا' پڑھا بھی ہوگا' سنا بھی ہوگا' یہ جو اوپر بیان کا ٹکڑا ہے' کبھی آپ نے سارے سال میں کسی ایک زبان سے بھی سنا ہے؟ یہاں تو سازش ہی یہ چلی آ رہی ہے کہ اور سب کچھ کہو مگر کسی کو قرآن کی طرف نہ آنے دو۔ کیا بات تھی اس شخص کے الفاظ کے انتخاب کی! ساری بات ہی یہ ہے۔ اب آپ سمجھ لیجیے کہ منزل من اللہ کیوں مانا جاتا ہے؟ وحی پر ایمان لانے کی کیوں ضرورت ہے؟ ورنہ اگر اس پہ ایمان لائے بغیر آپ انہیں ویسے ہی Values (اقدار) کہہ کر پکارتے رہیں تو اس سے کوئی فائدہ نہیں' آج اس قسم کے جرائم ہیں۔ یہ پوچھیے نہیں کہ ان Values (اقدار) سے کس قسم کی تبدیلیاں آتی ہیں' ان کا اثر کیا ہوگا؟ میں جب اس نکتہ پہ آؤنگا جہاں قرآن نے اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ (24:2) کی بات کی ہے' یعنی اس نے جرائم سے پاک کرنے کی سوسائٹی کی تبدیلی کی بات کی ہے تو کھل کر اس کی وضاحت کروں گا۔ یہ بات یہیں سے شروع کی ہے۔

دورِ وکٹوریا میں انگلینڈ کی سوسائٹی کی قدامت پرستی کی مثال اور آئے دن بدلتے ہوئے قانون

آپ انگلینڈ کی سوسائٹی کو دیکھیے۔ ملکہ وکٹوریا (1819-1901) کے زمانے (1837-1901) میں ان کے ہاں کی قدامت پرستی کی کیفیت یہ تھی کہ جس چیز کا نام Leg (ٹانگ) رکھ دیا جاتا تھا' اوہ اُس کے اوپر کپڑا اوڑھا دیتے تھے۔ پرانے زمانے کی تصویروں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ میزوں کی جو Legs (ٹانگیں) ہوتی تھیں' ان پر اور کرسیوں کی ٹانگوں پہ بھی غلاف چڑھا ہوتا تھا۔ اس زمانے کی عورتوں کا لباس بھی آپ نے دیکھا ہے کہ گھسٹتا ہوا چلا جاتا تھا۔ یہ بھی کل کی بات ہے لیکن آج وہاں جا کے دیکھیے' زنا کو سوسائٹی میں کوئی معیوب قرار نہیں دیتا۔ سو جسے آپ زنا کہتے ہیں' اس کے لیے وہاں سوسائٹی نے ایک Definition (تعریف) مقرر کی لیکن دوسرے ہی دن وہ بدل دی گئی۔ آخر میں اس چیز پر آئے کہ جسے ان کے ہاں قانون کی رو سے شادی یا نکاح یا میرج کہا جاتا تھا' اس سے پہلے ہی اگر اس سے اختلاط ہو جائے' حمل قرار پا جائے اور بچہ پیدا ہو جائے تو اس کے بعد اس کے لیے ضروری ہے کہ اس سے شادی کر لے۔ کاہے کے لیے شادی کر لے؟ تاکہ وہ بچہ قانوناً اس کا بیٹا تصور ہو۔ بس اس مقصد کے لیے شادی کر لے۔ پھر قانون یہ بدلا کہ صاحب! اس سے تو اس لڑکی سے شادی کرنے کی مجبوری ہوتی ہے کیونکہ اس کے ہاں بچہ پیدا ہو گیا' بڑی مجبوری ہے' تو کہا کہ ٹھیک ہے بات صرف چار وولٹس

---

[1] یعنی 1976ء

ہی کی ہے اور اس طرح چار ووٹس اور لے لیں گے تو لہٰذا یہ قانون بھی گیا' ختم ہوا قصہ۔ اب وہاں بالجبر کے سوا' کوئی شکل بھی جو اس اختلاط کی ہے' وہ قانوناً جرم ہی نہیں ہے۔ مجمع میں میری بیٹیاں اور بہنیں بھی ہوتی ہیں تو کھلے بندوں کہہ نہیں سکتا۔

انگلینڈ میں لواطت کے قانون کے بعد امریکہ میں لڑکوں کی عام خرید وفروخت

آپ کو معلوم ہے کہ اب انگلینڈ میں Homo sexuality (ہم جنسی) جسے آپ لواطت کہتے ہیں (جو کہ کہنا نہیں چاہیے)' قانوناً جائز قرار پائی ہے۔ یہ قانون پاس ہو گیا ہے کہ یہ جرم نہیں ہے۔ یہاں کے متعلق تو انہوں نے کھلے بندوں کہہ دیا ہے۔ امریکہ میں لڑکوں کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں ریڈرز ڈائجسٹ (Reader`s Digest) میں ایک بڑا تفصیلی مضمون آیا۔ میں نے اسے پڑھا' اس میں وہاں لڑکوں کی' قیمتیں دی ہوئی تھیں۔ یہ کیا ہے؟ یہ کہ سوسائٹی جس قسم کا چاہے قانون بنائے اور جب جی چاہے اسے بدلتی چلی جائے۔ یہاں اس سورۃ النور کے شروع ہی میں ''سورۃ'' کہنے کے بعد کہا کہ اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا (24:1)۔ یہاں تو خدا کی طرف سے خاص لفظ آیا ہے کہ یہ احکام تم پہ واجب قرار دیئے گئے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے آپ فرض کہتے ہیں' مگر یہ نہیں ہے کہ قرآن کی جو تعمیل' حکم یا قانون ہے وہ تو نافذ کر دیا جاتا ہے لیکن آپ اس کے متعلق پوچھ نہیں سکتے کہ صاحب! یہ حکم ہی کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی لم کیا ہے؟ اور یہ بھی نہیں ہے کہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے' آپ کو تو اسے ماننا ہوگا۔

قرآن حکیم اپنی ہر قدر کی لم اور حکمت کو خود واضح کرتا ہے

عزیزان من! قرآنِ کریم تو کوئی حکم اس طرح سے نہیں دیتا۔ یہاں کہاں کہ فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ (24:1)۔ تو یہ وہ حکم ہے جسے وہ آیات بتاتا ہے۔ آیت کے معنی ہوتے ہیں ''کسی شے کی' کسی مقصد کی' محسوس نشانی جس سے یہ پہچانا جائے کہ اس کا مقصد کیا ہے''۔ تو جو احکام بھی ہیں وہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن انہیں آیات کہتا ہے۔ یہاں آیات کہا ہے کہ وہ بیّنٰت ہیں یعنی بالکل واضح ہیں' ان کے اندر کوئی ابہام نہیں۔ تمہیں ہم ہر چیز سمجھائیں گے' حکمت کے ساتھ بتائیں گے تاکہ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (24-1) تم اپنی زندگی میں ہر وقت انہیں سامنے رکھ سکو اور تمہیں معلوم ہو کہ ان کے اتباع سے' ان کے مطابق چلنے سے' کیا فائدہ ہوگا' اس کی خلاف ورزی سے کیا نقصان ہوگا۔ لہٰذا یہاں ایک آیت سے قرآن کریم نے تمہید شروع کی اور پھر اگلی ہی آیت میں اس جرم پر آ گیا کہ اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (24:2)۔ زنا کی سزا کے اوپر آ گیا۔ سوال یہ ہے کہ قرآن نے پہلے ہی اس کے متعلق کیوں ذکر کیا؟ انسان کی طبعی زندگی میں جذبات تو مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کی شدت اور نوعیت کے لحاظ سے' آپ ان کی Categories (اقسام) بھی مقرر کر سکتے ہیں۔ ان جذبات کے اوپر قابو پالینا' ضبط کر لینا' انہیں حدود کے اندر رکھنا' انہیں اقدار کے مطابق استعمال کرنا' یہ ہے جسے آپ کشمکش کہتے ہیں اور یہ جو چیزیں ہیں' ان کے اندر وہ شدت اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ انسانی

جذبات میں سب سے زیادہ شدید ترین جذبہ Sex (جنس) کا جذبہ ہے' اس میں آدمی پاگل ہو جاتا ہے' پاگل! وہ ٹھیک ہی کہہ گیا تھا کہ

کہتے ہیں جس کو عشق' خلل ہے دماغ کا ❶

اس جذبہ جنس کی تسکین کے لیے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ انسان تو ایک طرف رہا آپ حیوانات کو دیکھیے۔ یہاں (لاہور میں) تو آپ نے کبھی دیکھے نہیں ہونگے' گاؤں میں جا کر دیکھیں۔ وہ جوان کا اپنے ہاں میٹنگ سیزن (Mating Season: جفتی رُت) ہوتا ہے' میں آگے جا کر بتاؤنگا کہ کس طرح حیوانات پر قدرت نے خود ضبط کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ جب تک ان کے ہاں کا یہ سیزن (Season: رُت) نہیں آتا' سال بھر تک انہی گائیوں کے اندر وہ بیل پھرتا رہتا ہے' اپنی جنسی اختلاط کی پوری قوتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہوتا ہے اور اتنی زیادہ گائیں ہوتی ہیں ایک دو بھی نہیں' ہیٹر داہیٹر جنوں کیندے او ❷۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ غالب (1797-1869) یہ بات بڑے حسین انداز میں کرتا ہے:

چاک مت کر جیب' بے ایام گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

اور جب انہیں اُدھر کا اشارہ ہوتا ہے یعنی میٹنگ سیزن (Mating Season: جفتی رُت) ہوتا ہے' پھر واقعی وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں فطرت نے ایسی چیز رکھی ہے۔ وہ اس مادہ کی ایک خوشبو ہوتی ہے وہ دور تک جاتی ہے۔ ان کے ہاں حیوانات کے اندر تو قدرت نے یہ چیز بڑی زور کی رکھی ہے۔ یہ اس پہچان کی چیز ہے۔ وہ دروازوں کو ٹکریں مار مار کر توڑتا ہے۔ وہی بیل' جو وہاں سال بھر ان کے اندر پھرتا تھا' آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ اس جذبے کی شدت کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

عزم کی نعمت اختیار و ارادہ کی رہین منت ہے

آپ معاشرے میں دیکھیے۔ کبھی آپ جرائم کی Census (مردم شماری) لے لیجیے۔ اس میں آپ دیکھیے نوے فیصد بالواسطہ یا بلاواسطہ جرائم کے تابع سیکس (جنس) کا جذبہ ہی پنہاں ہوتا ہے۔ یہ شدید ترین جذبہ ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اس جذبے پر پابندی کیوں؟ حیوانات پہ تو فطرت نے آپ پابندی عائد کر دی' انسان پہ وہ فطرت اس قسم کی پابندی خود نہیں عائد کرتی۔ وہ اس کو صاحب ارادہ

---

❶ یہ اشارہ مرزا اسد خاں غالب (1797-1869) کی طرف ہے اور ان کا وہ پورا شعر یوں ہے:

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل — کہتے ہیں جس کو عشق' خلل ہے دماغ کا

❷ جسے وہ بھیڑ در بھیڑ کہتے ہیں۔

بناتی ہے۔ اسے اس قسم کی پابندی اپنے ارادے سے عائد کرنا ہے۔ یہی تو عزم کہلاتا ہے۔ کیا کبھی آپ کسی حیوان کو کہتے ہیں کہ صاحب! اس میں بڑا کیریکٹر ہے۔ یہ سال بھر گائیوں کے اندر' مستورات کے اندر' پھرتا رہتا ہے' غمزہ وادا کی یہ کیفیت ہے کہ ادھر نگاہ بھی نہیں اٹھاتا؟ آپ کہیں گے کہ صاحب! اسے کہو کہ یہ بڑا پاک باز' بڑا متقی اور پرہیزگار ہے۔ کیا آپ کسی بیل کو کہتے ہیں کہ وہ متقی پرہیزگار ہے؟ حالانکہ تقویٰ کا انتہائی معیار جو آپ مقرر کر رہے ہیں' وہ اس پہ پورا اترتا ہے۔ آپ یہ کبھی نہیں کہتے کہ وہ اس معیار پر پورا نہیں اترا۔ کیوں نہیں کہتے؟ اس لیے کہ اس میں اس کے اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ جو اپنے اختیار وارادہ سے اس قسم کے شدید جذبے کے اوپر حد بندی یا پابندی عائد کرے وہی صاحب کردار ہے۔ اقدار کے تابع اس جذبے کی تسکین ہونی چاہیے۔ یہ جو چیز ہے' اس سے اس کے عزم کو خود پختگی حاصل ہوتی ہے۔

ذات کی پختگی میں جنس (Sex) کا جذبہ بنیادی کردار کا حامل ہے

قرآن نے زنا کے جرم کے لیے بھی ''اثم'' کا لفظ استعمال کیا ہے کہ تمہاری ذات کی ''میں''[1] کی ناپختگی کی سب سے بڑی نشانی یہ Sex (جنس) کا کمبخت جذبہ ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں چونکہ Sex (جنس) کا شدید ترین جذبہ یہ ہوتا ہے جہاں انسان پاگل ہو جاتا ہے' فی الواقعہ جس پہ وہ کنٹرول نہیں رکھتا اس لیے قرآن کریم نے یہاں سے یہ سورۃ شروع کیا کہ **فَـرَضْنٰهَـا** (24:1) اس کے احکام کو اطاعت کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ یہیں سے وہ چیز آتی ہے جسے آپ احکام کہتے ہیں۔

جنس (Sex) کے جذبے کے بعد عصمت کے تحفظ کا ذکر کیوں؟

عزیزان من! قرآن کریم نے اس سورۃ کی ابتدا ہی Sex (جنس) کے جذبے سے کی ہے' اس لیے زنا کے جرم سے ابتدا ہوئی ہے۔ یہاں سے آگے عصمت کی بات چلے گی۔ اس کے نزدیک انسان کی ذات کو یہ سب سے زیادہ مضمحل کر دیتی ہے۔ سوسائٹی میں جو کچھ ہوتا ہے' وہ تو آپ سوسائٹی کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ وہ سوسائٹی کی بات ہے' لیکن قرآن کی رو سے یہ جو قدر ہے کہ جنسی جذبات کو خدا کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر رکھ کر' اس کی تسکین کریں' یہ سب سے بڑی قدر ہے اور اس کی خلاف روزی سنگین ترین جرم' انسانی ذات کے لیے بھی اور معاشرے کے لیے بھی۔ اسی لیے قرآن کریم نے سورۃ النور میں پہلی آیت کے بعد اگلی آیت میں' جو زنا کا جرم ہے' اس کے متعلق گفتگو کی ہے۔ عزیزان من! اسے ہم اگلے درس میں لیں گے اور اس میں آپ کے سامنے عجیب چیزیں آئیں گی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

---

[1] I am ness یعنی Self یا انسانی ذات

دوسرا باب: سورۃ النور (تمہید اور آیت 2)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲

عزیزان من! آج اکتوبر 1977ء کی 7 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورۃ النور کے ابتدا ہی سے ہوتا ہے۔ پچھلے درس میں بھی یہی پہلی آیت ہمارے زیر نظر تھی' آج بھی بات وہیں سے شروع ہو رہی ہے۔ بات تو بڑی آسان نظر آ رہی ہے کہ اس میں زانی مرد اور زانی عورت کی سزا کا ذکر ہے۔ زنا ایک ایسا عمل ہے جس کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کم از کم ادھر ہمارے معاشرے میں تو ابھی تک یہ معیوب ترین گنا جاتا ہے' بہت بڑا عیب گنا جاتا ہے' قابلِ نفرت گنا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے متعلق اتنی لمبی چوڑی تشریح کی ضرورت نہیں تھی۔

کسی بھی مسلمہ بات کو سطحی طور پر نہیں لینا چاہیے

مجھے وائٹ ہیڈ [1] کا قول یاد آ جاتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ رہا کہ میں ایک Great mind (بڑے ذہن کا مالک) ہوں لیکن چونکہ قرآن نے یہ کہا ہے' اس لیے مجھے یاد ہے۔ اس مفکر نے [2] کہا ہے کہ ''جو چیزیں بالبداہت نظر آئیں ان کی گہرائیوں میں جانے کے لیے

---

[1] White-head, Alfred North (1861-1974).British philosopher and mathematician.One of the founders of mathematical logic, his Principia Mathematica (1910-13) was written in collaboration with Bertrand Russell. (Reader's Digest(1990). Universal Dictionary. New York: The Reader's Digest Association Limited, P.1710

[2] It requires an un-usual mind to undertake the analysis of what is obvious.

ایک بڑی گہری نظر و فکر کی ضرورت ہوتی ہے''۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ ہماری سینکڑوں باتیں ایسی ہیں جن میں بالبداہت ایسے نظر آتا ہے کہ صاحب! یہ ٹھیک ہیں' ایسا ہے مگر ان پر ہم کبھی غور نہیں کرتے۔ قرآن کی عظمت اس میں بھی ہے کہ جو باتیں اس سے پہلے معاشرے کے اندر معیوب گنی جاتی تھیں' اس نے جب ان کو بھی لیا ہے تو ان کی گہرائیوں میں گیا ہے حالانکہ مسلمہ طور پہ وہ سب اسے معیوب مانتے تھے۔ بہت سی چیزیں عربوں میں ہی نہیں بلکہ سامی اقوام [1] کے اندر بھی معیوب گنی جاتی تھیں' انہیں جرم قرار دیا جاتا تھا۔ ان میں زنا بھی تھا لیکن قرآن کریم نے اپنے ہاں جہاں بھی ان چیزوں کا ذکر کیا ہے' انہیں اتنا ہی کہہ کے نہیں چھوڑ دیا کہ یہ بڑے معیوب فعل ہیں' جرائم ہیں ان کی سزا دیجیے۔ جسے وہ کہتا ہے کہ ہم نے قانون کے ساتھ حکمت بھی بیان کی ہے' یعنی The why of it بھی بیان کی ہے' بتایا ہے کہ یہ کیوں ایسا ہے تو یہ ''کیوں'' اس نے ان چیزوں کے لیے بھی کہا ہے جو عام طور پہ اس زمانے کے معاشرے میں مسلمہ طور پر تسلیم کی جاتی تھیں۔

عقیدے یا Faith میں Reason (عقل واستدلال) نہیں ہوتا جبکہ ایمان کے لیے Reason (عقل و استدلال) ضروری ہے

اس سے یہ نظر آیا کہ صرف ایک چیز کا یونہی مسلمہ طور پہ مان لینا کافی نہیں۔ اس کے لیے بھی ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ایسا کیوں مان رہے ہیں اور یہی ''کیوں'' جب پتہ چلے تو پھر یہ ایمان کا درجہ حاصل کرتی ہے' ورنہ پہلے جتنی چیز ہوتی ہے وہ Faith (عقیدہ) ہوتا ہے۔ انگریزی میں جسے Faith (عقیدہ) کہتے ہیں' اس میں Reason (عقل واستدلال) نہیں ہوتا۔ وہی بات جب Reason (عقل واستدلال) پہ مبنی ہو جاتی ہے وہ ایمان ہو جاتا ہے۔ قرآن اس چیز پہ زور دیتا ہے کہ جسے تم ایمان کی حیثیت سے بھی مانو' اس کا جو Reason (عقل واستدلال) ہے' وہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے اور Reason (عقل واستدلال) پہ تمہیں مطمئن ہونا چاہیے' پھر وہ ایمان ایمان بنتا ہے اور جب اس طرح وہ ایمان بنتا ہے تو پھر وہ کبھی زائل نہیں ہوتا' دنیا کی کوئی قوت اسے زائل نہیں کر سکتی۔ انہی میں زنا ہے' اور یہ اتنا Obvious (ظاہر) ہے کہ اس کے لیے لمبی چوڑی تفصیل کی ضرورت نہیں تھی لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے پچھلے درس میں بھی اس کی تمہید ہی عرض کی تھی' آج بھی میں سمجھتا ہوں کہ شاید اسے بھی تمہید ہی سمجھا جائے۔

جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ قرآن نے اس جرم کو سرفہرست رکھا ہے اور اس میں جو زانیہ ہے اس کا ذکر پہلے کیا ہے۔ زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں کا جرم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں زنا بالجبر کا سوال نہیں ہے کیونکہ اس جبر میں عورت تو مجرم قرار ہی نہیں

---

[1] Semitic Races, those designating a subfamily of the Afro-Asiatic Family of lanuages including Arabic, Hebrew, Ethiopic, Akkadian, and Aramaic.

پاسکتی۔ جبر سے جو بھی کام ہو' قرآن کی رو سے بھی اور عام قانون کی رو سے بھی' وہ جرم ہی نہیں قرار پاسکتا۔ لہٰذا یہاں عورت کو بھی ساتھ رکھا ہے اور اس کا تو ذکر پہلے کیا ہے۔ یہ اس زنا کا ذکر ہے جو دونوں کی رضامندی سے ہے اور اس میں جبر کا پہلو نہیں۔ اب یہاں سے سوچنے کی بات شروع ہوگئی۔

قرآنِ کریم نے سب سے پہلے زنا کی سزا کا ذکر کیوں کیا ہے؟

قرآن کریم نے چند ایک ہی ایسے جرائم ہیں جن کی سزا خود تجویز کی ہے' باقی چیزوں کو معیوب قرار دیا ہے اور ان کی سزا کو معاشرے پہ چھوڑ دیا ہے۔ ان جرائم میں بغاوت کی سزا ہے' قتل کی سزا ہے' چوری کی سزا ہے اور آخر میں یہاں زنا کی سزا ہے جسے اس نے سب سے پہلے لیا ہے۔ ان کے اندر کیا فرق ہے؟ بغاوت' ڈاکا' فساد' قتل' چوری' یہ سب وہ چیزیں ہیں جن میں ایک بالادست قوت والا دوسرے پر اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرتا ہے۔ قاتل دوسرے کو قتل کرتا ہے تو اس کی مرضی سے نہیں کرتا' چور چوری کرتا ہے تو اس کی رضامندی سے نہیں کرتا' باغی بغاوت کرتا ہے تو وہ مملکت کی یا حکومت کی رضامندی کے ساتھ نہیں کرتا' یعنی یہ وہ جرائم ہیں جن میں ایک بالادست' صاحب قوت دھاندلی کے زور پہ دوسرے کی مرضی کے خلاف کچھ کرتا ہے۔ زنا بالجبر' میں نے کہا ہے' کہ اسے ذہن سے نکال دیجیے۔ وہ اس میں شامل ہی نہیں ہے لیکن زنا میں یہ صورت نہیں ہوتی۔ اس میں دونوں کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی نوعیت ان جرائم سے مختلف ہوگئی جن کا قرآن نے دوسری جگہ ذکر کیا یا جن کی حد مقرر کی ہے' سزا مقرر کی ہے۔ اس کی نوعیت ہی مختلف ہے۔ قرآن نے اسے مختلف مقامات پر شرح وبسط سے بیان کیا ہے۔

عزیزان من! یہ بات آج سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کریم نے اس کو اس قدر تصریحات اور وضاحتوں کے ساتھ کیوں بیان کیا حالانکہ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ جو چیز فریقین کی رضامندی سے ہو' اس میں تو کوئی معیوب بات نظر نہیں آتی۔ جرم تو وہ ہے کہ ایک قوت والا' اقتدار والا' دھاندلی سے دوسرے کی مرضی کے خلاف اس سے کچھ کرے۔ یہاں تو وہ صورت نہیں ہے۔ یہاں تو رضامندی ہے۔ قرآن نے جو کہا تھا کہ انفس وآفاق میں ہماری نشانیاں بے نقاب ہوتی چلی جائیں گی اور ہر نشانی جو بے نقاب ہوگی وہ قرآن کی کسی نہ کسی ایک صداقت کی شہادت بنے گی' آج اس دور میں' میں سمجھتا ہوں کہ یہ انسانیت کی تاریخ میں شاید پہلا دور ہے' جس میں یہ بات آئی ہے کہ فریقین کی رضامندی سے جنسی اختلاط جرم ہی نہیں قرار دیا گیا۔ دلیل ہی یہ دی جاتی ہے کہ اس میں دونوں کی مرضی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس میں جرم کیا؟ دراصل یہاں مغرب کا جو زندگی کا نظریہ ہے' بات ساری وہیں آجاتی ہے جو میں ہر بار کہا کرتا ہوں کہ اصل چیز زندگی کا ایک نظریہ ہے جس کے تابع یہ سب چیزیں آتی ہیں۔

سیکولر نظریۂ زندگی مکمل طور پر طبعی زندگی کے گرد گھومتا ہے

مغرب کا جو سیکولر نظریہ زندگی (Secular Theory of Life) ہے اس کی رو سے انسان یہی طبعی جسم ہے' اس کی Physical Life (طبعی زندگی) ہے' اس کی سوسائٹی ہے' سوسائٹی کے اندر وہ رہتا ہے۔ اگر وہ سوسائٹی کے قوانین کے تابع ہے تو پر امن زندگی بسر کرے۔ اگر وہ سوسائٹی کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ جرم ہے۔ جہاں تک اس کی ذات (Self) کا تعلق ہے اس میں یہ چیز نہیں آتی۔ وہ طبعی قوانین کے تابع زندہ رہتا ہے' انہی کے تابع مر جاتا ہے۔ یہ وہاں کا نظریہ زندگی ہے۔ اس میں سوسائٹی کے قوانین ہی حرفِ آخر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ قدیم سے قدیم تر دَور میں بھی اگر ہم دیکھتے ہیں تو جنسی اختلاط کی یہ شکل کہیں بھی نہیں تھی کہ کسی بھی قسم کی باہمی رضامندی ہو اور اسے جائز تصور کر لیا جائے۔ وحشی قبائل میں بھی یہ بات نہیں تھی۔ اب بھی دنیا میں ایسے قبائل بستے ہیں جنہیں آج بھی وحشی قبائل کہا جاتا ہے' ان کے ہاں بھی نہیں۔ آسٹریلیا میں' جنوبی امریکہ میں' افریقہ میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ مرد اور عورت یا جوان لڑکا اور لڑکی باہمی رضامندی سے جس طرح جب جی چاہے اختلاط جنسی کر لیں اور ان کے ہاں اسے جرم نہ قرار دیا گیا ہو یا اسے معیوب نہ سمجھا گیا ہو۔

آج دنیا کی مہذب ترین اقوام میں رضامندی سے جنسی اختلاط جرم نہیں رہا

میری عزیز بیٹیاں اور بہنیں مجھے معاف رکھیں۔ یہ موضوع بڑا نازک سا ہے۔ قرآن میں یہ سامنے آیا ہے اور اہمیت کا تقاضا ہے کہ میں ذرا وضاحت سے بات بیان کروں۔ تاریخ انسانیت میں' جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں' یہ پہلا دور ہے کہ دنیا کی مہذب ترین اقوام نے اپنے ہاں اسے معاشرتی مسلمہ ہی نہیں' قانون بنا دیا ہے کہ مرد اور عورت' لڑکے اور لڑکی کی باہمی رضامندی سے اگر اختلاط جنسی ہوتا ہے تو نہ یہ قانون میں جرم ہے' نہ سوسائٹی میں معیوب ہے۔ پوری سوسائٹی نے اسے تسلیم کر لیا۔ اگر اتنی ہی بات ہوتی کہ جرم وہی جرم ہے' جس میں دوسرے کی رضامندی شامل نہ ہو' تو جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' پھر تو یہ زنا جرم قرار ہی نہیں پا سکتا۔ یہی تو وہ دلیل دیتے ہیں کہ اس میں ان دونوں کی باہمی رضامندی ہے' سوسائٹی بیچ میں کیسے آتی' سوسائٹی تو کمزور' مقہور اور مظلوم ہے۔ جب وہ مدد کے لیے آواز دیتا ہے تو سوسائٹی اس کی مدد کے لیے آتی ہے۔ مگر یہاں تو رضامندی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک بات جو بالکل Obvious (عیاں) نظر آتی تھی' ذرا ہم نے کھڑے ہو کر سوچنا شروع کیا تو وہ کس قدر نازک اور پیچیدہ سی بن گئی۔ پہلے انہوں نے اتنی چیز کہی تھی کہ بھئی! نکاح سے پہلے اگر یہ اختلاط ہو جائے اور اس کی رو سے حمل قرار پا جائے' تو بہر حال اس کے بعد اس لڑکے کو اس لڑکی سے شادی کرنی پڑے گی اور وہ اس لیے کہ وہ بچہ قانوناً اس کا بیٹا تسلیم کیا جائے۔ یہ ایک قانونی ضرورت تھی لیکن ان کے ہاں یہ ایک بات ضرور تھی۔ اب انہوں نے

وہ بھی ختم کر دی۔

سول کورٹ میں دعویٰ کی نوعیت

عزیزان من! اب وہاں صرف ایک ہی چیز باقی ہے کہ کوئی شادی شدہ عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ جنسی اختلاط کرے۔ اور یہ صورت ہو تو سوسائٹی کی طرف سے یہ بھی جرم نہیں ہے۔ ہاں' البتہ اگر اُس عورت کا خاوند ہرجانے کا دعویٰ کرے تو وہاں قانون کی رو سے دعویٰ' جرمِ زنا کا نہیں ہے۔ وہ دعویٰ سول کورٹ میں ہرجانے کا دعویٰ Admit (داخل) کیا جاتا ہے اور اگر وہ سمجھے کہ یہ کوئی حرج ہی نہیں ہوا ہے یعنی وہ دعویٰ نہ کرے تو سوسائٹی یا حکومت اُسے جرم ہی نہیں تسلیم کرتی۔ گویا یہ ساری چیزیں بالکل بے باکانہ ہو گئیں۔ لہٰذا اب ہم یہاں پہنچ گئے کہ Sex (جنس) کے جذبے کے متعلق' جیسا کہ میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا اور ہمارے ہاں کے حکماء نے بھی یہی کہا ہے اور آج کے سائیکالوجسٹ بھی یہی کہے ہیں کہ جب اس کی شدت ہوتی ہے تو اس سے انسان پاگل ہو جاتا ہے' اس کی عقل و فکر ماؤف ہوتی ہے۔ اتنا شدید جذبہ ہونے کے باوصف اس پہ کوئی پابندی نہ رہے' اور اس کے متعلق دلیل یہ دی جائے کہ دونوں کی رضامندی اس میں شامل ہے' تو پھر جرم کاہے کا ہوا۔ لہٰذا نظر بظاہر تو یہ جی کو لگتی ہوئی بات ہے۔ اب تو یہ روا دھر بھی چل رہی ہے۔ یہ ہے سول کورٹ میں دعویٰ کی نوعیت۔

اسلام اور کفر میں فرق

ہم دیکھ رہے ہیں کہ قرآن اس جرم (Crime) کو سرفہرست رکھ رہا ہے' خواہ اس میں دونوں کی رضامندی ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس کا کہنا یہ ہے کہ پابندی صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں دونوں کی رضامندی ضروری ہے بلکہ یہ تو اسے سرے سے سنگین جرم قرار دے رہا ہے' اور اس کے لیے سخت ترین سزا متعین کرتا ہے جبکہ آج کی اس دلیل کے مطابق تو یہ چیز جرم قرار ہی نہیں پانی چاہیے۔ اب ہم یہاں آ گئے کہ قرآن کریم صرف اقدار یا Values سے ہی بات کرتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ انسان کی یہ زندگی صرف طبعی (Physical) زندگی نہیں ہے کہ کھاؤ پیو اور مر جاؤ' اس کی انسانیت کی بھی ایک زندگی ہے اور اس کے لیے انسان کی' کچھ Values (اقدار) ہیں۔ وہ Values (اقدار) غیر متبدل ہیں' بدلی نہیں جا سکتیں۔ بس یہ ہے فرق اسلام میں اور کفر میں۔

قرآن حکیم کی عطا کردہ Values (اقدار) کی حکمت

اب پھر اگلی بات یہ آ گئی کہ کیا ہم یہ Values (اقدار) محض ایک عقیدے (Faith) کی رو سے' مان لیں کہ چونکہ قرآن نے ان کو Values (اقدار) قرار دیا ہے اس لیے ہم انہیں Values (اقدار) مان لیں۔ یوں تو اطمینان نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم کی

Values (اقدار) بھی محض بطور عقیدہ (Faith) منوانے کے لیے نہیں ہیں۔ یہ Values (اقدار) تو' عزیزانِ من! اس وقت Values (اقدار) بنیں گی جب آپ ان کی Value (قدر و منزلت) کو تسلیم کریں گے اور اگر آپ کے پاس جنس کا سد یعنی کھوٹا پیسا ہے تو وہ کس کام کا! اونوں کتے سنبھال سنبھال کے تسی رکھدے ہو ❶۔ آپ تو اس پیسے کو رکھتے ہیں جس پیسے کی قیمت ہوتی ہے۔ اس طرح آپ Value کا ترجمہ ''قیمت'' کر لیں۔ اگر آپ کا سوال یہ ہے کہ یہ Values (اقدار) جو قرآنِ کریم نے دی ہیں' کس طرح ہمارے نزدیک قیمتی متاع قرار پائیں گی؟ ہمیں اطمینان ہو کہ واقعی یہ بڑی قیمتی چیز ہے' تو پھر اس بنا پر یہ وہ چیز ہے جو قرآن کے نزدیک منفرد حیثیت کی حامل ہے۔

قرآن وہ Values (اقدار) دیتا ہے جو انسانوں کی بنائی ہوئی نہیں ہیں' خدا کی متعین کردہ ہیں' وحی کے ذریعے دی ہوئی ہیں' اور ان کی اس طرح حکمت بیان کرتا ہے کہ اس کی Value یا قیمت کو ہم تسلیم کرنے لگ جاتے ہیں۔ وہ جسے آپ Legal Tender (قانونی پیش کش) کہتے ہیں' یہ ہوتا کیا ہے؟ یہ کاغذ کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ جو دس روپے کا یا سو روپے کا نوٹ ہوتا ہے' اسے آپ سنبھال کر کیوں رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ہمیں یقین ہے کہ اس کی قیمت دس روپیہ یا سو روپیہ ہے۔ یہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ ہم نے قانون کے ساتھ' Values (اقدار) کے ساتھ' ان کی حکمت بتائی' ان کو بتایا کہ اس کا پکا نتیجہ ہوگا۔ قرآن کی Values (اقدار) کی طرف آنے سے پیشتر' آیئے اسی معاشرے کی طرف چلیں' جس نے آج یہ کہہ دیا ہے کہ اگر مرد اور عورت دونوں راضی ہو جائیں' لڑکا لڑکی باہمی رضامند ہوں تو اس کے بعد یہ جنسی اختلاط کوئی جرم نہیں' معیوب نہیں۔ اب آپ اسی معاشرے کی طرف آیئے کہ اس کے ماہرین و دانشور اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ چونکہ قرآن کریم نے اس موضوع کو اتنی اہمیت دی ہے' اس سلسلہ میں جو عصر حاضر کا لٹریچر آتا ہے' تحقیقات آتی ہیں' مجھے وہ جہاں تک میسر آتی ہیں' میں ان کے اوپر نگاہ رکھتا ہوں۔ اب تو یہاں (پاکستان میں) کتابیں ہی میسر نہیں ❷ آ رہی ہیں' یوں لگتا ہے کہ اس ملک کے اندر کتاب کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ میں دیکھتا رہتا ہوں کہ ان کی اس سلسلے میں تحقیقات کیا ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ ایک کتاب ہے۔ میں اس کا اکثر ذکر کیا کرتا ہوں۔ وہ انون کی کتاب سیکس اینڈ کلچر ❸ ہے۔ وہ ابھی تک ان کے ہاں بھی مستند سمجھی جاتی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس شخص نے بڑی محنت کی اور نوع انسان پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس شخص نے ایک عمر اپنی اس تحقیق کے اندر صرف کر دی۔ وہ دنیا میں قریباً اسی (80) وحشی قبائل کے اندر جا کر رہا اور ''جنس اور کلچر'' (Sex and Culture) کے نقطہ نگاہ سے ان کی پوری تاریخ

---

❶ اسے آپ کہاں سنبھال کر رکھتے ہیں۔

❷ یاد رہے یہ بات اکتوبر ۱۹۷۷ء میں کہی گئی تھی۔

❸ Unwin,J D. (M.C.PH.D.Cantab.) (1934). Sex and Culture. London: Oxford University Press.

کا مطالعہ کیا کہ جنسی اختلاط پر جو پابندی کسی نے عائد کی ہے تو ان کی زندگی کس قسم کی تھی اور جہاں یہ پابندیاں کھول دی گئی تھیں، وہاں زندگی کس قسم کی ہوئی۔ پھر اس نے سولہ (16) مہذب قوموں کا مطالعہ کیا، ان کی تاریخ دیکھی، گزشتہ پانچ پانچ سو سال کی تاریخ کو وہاں دیکھا کہ انہوں نے یہ جو جنسی قیود اور حدود ہیں، ان کے متعلق اگر اپنے ہاں کوئی تبدیلیاں کیں، تو ان کی تمدنی ثقافتی معاشرتی زندگی کے اوپر کیا اثر پڑا۔ اب یہاں سے بات پتہ چلی کہ یہ جنسی اختلاط محض حصول لذت کا ایک حادثہ نہیں ہے، یہ ایک Event نہیں ہے کہ مرد اور عورت نے آپس میں ایک چیز پر رضامندی ظاہر کر لی اور اس کے بعد حصول لذت کے لیے ایک واقعہ (Event) ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ ان افراد کے اوپر ہی نہیں، پوری کی پوری قوم کے اوپر اس کا اثر پڑتا ہے۔ اس نے میٹریل (مواد) اکٹھا کیا ہے۔ آپ سوچیے کہ سولہ (16) مہذب قوموں کی پوری تاریخ اس نکتہ نگاہ سے کہ انہوں نے کہاں کہاں اور کن قیود اور حدود کے اندر تبدیلیاں کیں ان کی رسیوں کو ڈھیلا کیا، کھولا اور اس طرح سے ان کے ہاں کی یہ جو تمدنی ثقافتی زندگی ہے، اس پر کیا اثر پڑا؟

سیکس اینڈ کلچر کا پہلا فقرہ

❶ وہ اپنی کتاب کے مقدمہ کے بعد کتاب کے آغاز کے لیے پہلے ہی فقرے میں یہ لکھتا ہے کہ ''دنیا کے مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل، سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے''۔ یہ اس کتاب کے دیباچے کے بعد پہلے باب کا پہلا فقرہ ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ ''اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اس معاملے (Matter) پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ میری اس تحقیق کا ماحصل اور اس سے مستنبط نتائج اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں''❷۔ یہاں سے وہ بات شروع کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد دیباچے میں ذرا آگے چل کر لکھتا ہے کہ ''اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پہ ہے۔ ایک ان لوگوں کا نظام زندگی اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے

---

❶ J.D.Unwin,M.C.,PH.D(Cantab).

❷ Among both civilized and uncivilized peoples there is a close relation between sexual opportunity and cultural condition and I have thought it worthwhile to conduct a detailed inquiry in to the matter. The results of my inquiry, and the conclusions I have drawn from the facts are presented in the following pages. (Unwin (1934). Sex and Culture, London: Oxford University Press.P.B).

جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی تھی''۔ ❶ یعنی قوموں کی تمدنی سطح کا انحصار اس چیز پر ہے۔

قرآن کے نزدیک جنسی اختلاط مرد اور عورت کا انفرادی فعل نہیں ہے

عزیزانِ من! اگر آپ قدر (Value) کا ترجمہ ''قیمت'' کریں تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ پھر اس کی کتنی قیمت نظر آ رہی ہے۔ آپ اس موقع پر قوم کی تمدنی سطح کے دارومدار کے متعلق، ساتھ کے ساتھ سوچتے جایئے کہ قرآنِ کریم نے اس کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ یہ مرد اور عورت کا انفرادی فعل نہیں ہے جس کے خلاف اس نے یہ کچھ کہا ہے۔ آج یہ قومیں جن کے ہاں یہ قیود اور حدود اٹھ گئی ہیں، یہ کہہ رہی ہیں کہ قوموں کی تمدنی سطح کا انحصار اس پہ ہے۔

قوموں کے عروج وزوال کا انحصار جنسیاتی ضوابط (SexualRegulations) کی آزادی اور پابندی پر ہے

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لیے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے ہیں اور آگے چل کر اس نے ضوابط کی مختلف Categories (اقسام) بتائی ہیں، انہی کے تابع وہ قوموں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر انہی گروہوں کی وہ تاریخ بتاتا ہے کہ ان کی تمدنی سطح کتنی گری اور کتنی اونچی ہوئی، وہ نقشے بنا بنا کر اس میں ظاہر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی سے تھا۔

عزیزان من! یہ کام ہمارے کرنے کے تھے۔ مغرب کی ساری دنیا اس نتیجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ یہ ایک طبعی فعل (Physical Action) ہے۔ بقول ان کے فطرت کا تقاضا ہے۔ اس تقاضے کی تسکین کے لیے فریقین کی رضامندی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ ہو جائے تو پھر اس کا مضر اثر نہیں پڑتا۔ پوری مہذب دنیا یہ کہہ رہی ہے کہ پھر اس کا مضر اثر نہیں پڑتا۔ میں لفظ ''مہذب'' (Civilized) انہی کے الفاظ میں دہراؤں گا کہ وہ ❷ یہ کہتا ہے کہ اس طرح تو پھر وہ مہذب رہتی نہیں ہے۔ آج کی پوری دنیا، جسے ہم مہذب دنیا کہتے ہیں، ہم تو

---

❶ Briefly stated, my final conclusion is that the cultural behaviour of any human society depends first, on the inherent nature of the human organism, and, secondly on the state of energy into which, as the result of its sexual regulations, the society has arrived (Preface P.xiv).

❷ J.D.Unwin,M.C.,PH.D(Cantab)

ان کے نقال ہیں، جب وہ اس نتیجے پہ پہنچی ہے کہ اگر یہ فریقین کی رضامندی سے ہو تو اس سے قوم کو کوئی نقصان نہیں ہوتا، اسی قوم کے محققین اس نتیجے پہ نہیں پہنچے۔ آج اگر دیکھنا ہو کہ کیا یہ وہی برطانیہ ہے جس کی مملکت پہ سورج غروب نہیں ہوتا تھا، تو سنو! یہ وہی مملکتِ برطانیہ ہے جو اب دوسرے تیسرے بھی نہیں، چوتھے پانچویں چھٹے درجے پر قوموں کی سطح میں آ گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں یہ دیکھو کہ انہوں نے اپنے جنسی اختلاط کے معاملے میں کیا کیا تبدیلیاں کی تھیں اور وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد یعنی قریباً سوسال کے بعد نمودار ہوتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی قابلِ غور تعلیم

اب آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم نے اسے اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی ہے؟ بظاہر ہمارے ہاں اس دلیل کا جواز (Justification) نظر نہیں آتا کہ بھئی! ایک Grownup یعنی بالغ لڑکا، اور ایک Growup یعنی بالغ لڑکی باہمی رضامندی سے اس چیز پہ آجاتے ہیں تو سوسائٹی ایناں دی چاچا لگدی ہیگی اے یہ اس میں خوامخواہ کیوں دخل دے؟ [1] آپ نے دلیل دیکھی، بظاہر کتنی معقول ہے لیکن درحقیقت کتنی فریب انگیز ہے۔ فریب انگیز اس لیے کہ بات تو یہ ہے جو کچھ یہ مفکر کہہ رہے ہیں، محققین کہہ رہے ہیں، یہ انون کہہ رہا ہے کہ سوسائٹی کو اس لیے دخل دینے کی ضرورت ہے کہ سوسائٹی تباہ ہو جائے گی۔ اسی لیے قرآن نے جنسی مسئلہ کو، اختلاط کے اس مسئلے کو، اتنی اہمیت دی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی مثال

عزیزانِ من! انہوں نے جن اولوالعزم ہستیوں کا ذکر کیا ہے یہ وہ ہیں جنہیں انبیاء کرام علیہم السلام کہتے ہیں، ان کی ذاتی زندگی میں دو ہستیاں ہیں۔ ایک تو نبی ہے اور ایک ایسی خاتون ہے جسے بڑے ہی احترام کے الفاظ میں قرآن نے یاد کیا ہے۔ مردوں میں حضرت یوسف علیہ السلام ہیں۔ ان کی عظمتِ کردار میں ایک ہی تو واقعہ ہے کہ انہوں نے عزیز کی بیوی کو جذباتِ نفس کی تسکین کے لیے رضامندی نہیں دی۔ دوسری طرف امراۃ العزیز کی آتشِ جذبات کے تیز شعلوں سے جو اتنی مجبوری (Compulsion) پیش کی جا رہی ہے، قرآن نے اس مجبوری کا جس طرح نقشہ کھینچا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیا کہنے ہیں قرآن کے! اس واقعہ میں دوسری طرف سے عزیز کی بیوی، اپنی آنکھوں میں ترغیباتِ نفس کے گہرے پردے لیے جوشِ فریفتگی کے شعلۂ بیباک سے اس قدر کھینچ رہی ہے، جبر کر رہی ہے اور

---

[1] معاشرے کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔

یہ ❶ ہیں کہ اس کے باجود اپنا دامن چھڑا کر' بھاگ رہے ہیں۔ حفاظتِ عصمت کے سلسلہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان قرآن حکیم میں مسلسل ایک ہی سورۃ ❷ میں بیان ہوئی ہے اور اس بیان کردہ داستان کا نکتہ ماسکہ حفاظت عصمت ہی ہے۔ اس میں حسن یوسف علیہ السلام کی رعنائیاں ❸ ہیں۔

اس کے ساتھ قرآن کریم نے حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر کیا ہے۔ قرآن نے انبیاء کے لیے اصطفیٰ کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی چن لینا' برگزیدہ بنا دینا۔ یہاں سے مصطفیٰ کا لفظ ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام نبیہؑ تو نہیں ہیں لیکن قرآن کریم میں ان کے لیے اصطفیٰ کا لفظ آیا ہے اور ہر بار اس کے لیے یہ کہا ہے کہ اس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ آپ دیکھیے کہ قرآن کریم میں اسے اتنی اہمیت دی ہے۔ آج میں نے یہ کہا ہے کہ جو کام ہمارے کرنے کا تھا' دنیا کو یہ بتانے کا تھا کہ یہ صرف ایک مرد اور عورت یا لڑکے اور لڑکی کا انفرادی فعل نہیں ہے کہ اس کے پیمانے سے آپ ماپیں کہ کوئی چیز ایسی بری تو نہیں ہوئی' معیوب تو نہیں ہوئی' اس پر تو پوری پوم کے مستقبل کا دارومدار ہے کہ آپ اس پر کنٹرول رکھنے کے ضوابط کونسے رکھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بات سمجھ آئے گی کہ قرآن نے اتنی شدت سے یہ ضوابط کیوں مقرر کیے تھے۔

جنسی اختلاط کے سلسلہ میں کم از کم مواقعوں کا ہونا کیوں ضروری ہے؟

ڈاکٹر انون کی تحقیق میں ایک چیز اور قابل غور ہے۔ وہ مذہب کے نقطہ نگاہ سے یہ تحقیق نہیں کر رہا' اس لیے وہ نکاح کا لفظ تو نہیں لاتا لیکن جو لفظ لاتا ہے' میں سمجھتا ہوں کہ اس تحقیق کے لیے وہ لفظ اس نکاح سے کہیں زیادہ وسیع المعنی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جنسی اختلاط کے مواقع (Sexual Opportunities) کم کیے جائیں۔ اب یہ جو مواقع ہیں' ان کے لیے ہی' اگر سوسائٹی اپنے ہاں اس قسم کے

---

❶ حضرت یوسف علیہ السلام جن کی نگہ حقیقت رس ایسے خود فراموش ماحول میں بھی قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ رہی ہے۔

❷ سورۃ یوسف

❸ یہ وہ وادی ہے جہاں سیرت و کردار کی آزمائش کے لیے ترغیبات نفس کے صبر آزما اور نگاہ فریب مناظر' سامانِ صد بہار بداماں کیے دام ہمرنگ زمین کی طرح چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔ دونوں کا فرق ملاحظہ فرمایئے کہ ایک طرف حضرت یوسفؑ جس کی عمر اس وقت بھرپور جوانی کی تھی' تمدن و حضارت کی اعصاب شکن مصنوعی زندگی سے دور' دشت و بیاباں کی کھلی فضاؤں میں پرورش یافتہ' حسن' عفت' سونے پر سہاگہ' تندرست جوانی' قلب و نگاہ کی پاکیزگی لیے ہوئے اور ترغیبات نفس پر حدود اللہ کی سلطانی دوسری طرف عزیز کی بیوی' تہذیب و تمدن کی بیباکیوں کی تخلیق' عشرت و کامرانی کے ماحول کی پروردہ' دولت کی مرصع کاریوں سے جگمگاتا حسن' عشوہ طرازیوں کا فتنۂ مجسم' ہزاروں بجلیاں اپنے دامنِ نگاہ میں لیے جذباتِ نفس کی مکمل حکمرانی کی تصویر' اور ترغیباتِ نفس کے گہرے پردے میں ملبوس۔ انسان ہونے کی حیثیت سے جوانی کی امنگیں دونوں طرف مگر حضرت یوسف علیہ السلام ان نظر فریب مناظر کے دامِ تزویر میں' ان تمام خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن صاف بچا کر نکل جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غیرت' ضبطِ نفس سے پیدا ہوتی ہے اور ''تہذیب'' کی حکمرانی میں' عقل پرستی کی آڑ میں' خدا سے انکار کیا ہی اس لیے جاتا ہے کہ نفس کی کامرانیوں میں کوئی روک ٹوک باقی نہ رہے۔ (ماخوذ از پرویزؒ: جوئے نور' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور' ۱۹۹۴ء' ص ص 224 تا 230)

قانون بناتی چلی جائے کہ یہ مواقع زیادہ سے زیادہ ملتے جائیں تو پوری قوم کے مستقبل پر اس کے مضر اثرات پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ اب ایک تو یہ ہے کہ مغرب نے ایسا کیا کہ اس پر کوئی پابندی ہی عائد نہیں کی اگر پابندی بھی ایسی عائد کر دی جائے کہ جس میں مواقع زیادہ ہوں تو وہ شخص یہ کہتا ہے کہ آپ مذہبی نقطہ نگاہ سے تو اسے کہہ لیں گے یا قانونی نقطہ نگاہ سے تو کہہ لیں گے کہ یہ معیوب نہیں ہے لیکن جہاں یہ مواقع زیادہ ہوتے چلے جائیں گے ان کا بھی وہی اثر پڑے گا جیسا ان حدود کے اندر آپ ڈھیل دیتے ہیں تو پڑتا ہے اور یہ چیز ہمیں اور آگے لے گئی۔

❶ اس نے لکھا ہے کہ حدود اور پابندیوں کے ساتھ کم از کم مواقع کی شکل وہاں پیدا ہوتی ہے' جہاں Monogamy یا وحدتِ زوج کا قانون ہو یعنی ایک بیوی اور ایک میاں ہے۔ آج تو شاید یہ بات بڑی تعجب انگیز سی ہو' جو میں کہہ رہا ہوں کہ قرآن کا اصول ایک بیوی اور ایک میاں ہے' وحدت زوج ہے۔ وہ تو ازدواجی زندگی میں' جب کسی طرح نباہ کی کوئی بھی صورت نہ ہو تو قرآن میں آتا ہے کہ اسے فسق کر دیجیے۔ یہ موضوع ہی دوسرا آجائے گا۔ یہ باتیں آگے آئیں گی تو میں عرض کرونگا کہ اگر نباہ کی کوئی شکل نہ رہے تو اس کے لیے بھی قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ جو آپ نے نکاح کا معاہدہ کیا ہے' اسے فسق کر دیجیے۔ یہ وہی ہے جسے طلاق کہا جاتا ہے' پہلا نکاح توڑیئے' اس کے بعد دوسری شادی کیجیے۔ اب آپ دیکھیے کہ قرآن کو ماننے والی قوم نے کیا کیا کہ جس پر اتنا زور دیا کہ وہ ان مواقع کو Reduce (کم) کر کے Minimum (کم از کم) سطح پہ لے آئے' اس نے یہ کیا کہ چار بیویوں تک کا قانون بنا لیا جبکہ یہ کچھ کم وسعت نہیں ہے' پھر ان میں یہ چیز بھی رکھ لی کہ مرد کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ وہ ایک بیوی کو طلاق دیدے' اس کی جگہ دوسری بیوی لے آئے۔

ان کے ہاں کا بریفو ❷ ایک مفکر ہے۔ ان کے ہاں جو زیادہ چمکدار سی فکر کے لوگ ہیں' میں ان کا ذکر کیا کرتا ہوں۔ یہ بریفو بھی بہت اونچا مفکر ہوا ہے۔ اس کی ایک کتاب کا نام ہے ❸ The Making of Humanity۔ اس کتاب کی وجہ سے اس کی شہرت ہے۔ اس نے ایک اور کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کا نام ہے: The Mothers۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس میں ابتدا سے آج تک عورت کی تاریخ دی گئی ہے۔ وہ بھی ان مواقع کے متعلق بحث کرتا ہوا کہتا ہے کہ ''میں کسی کے مذہب پہ نہ حملہ کر رہا ہوں نہ اعتراض کر رہا ہوں۔ میرا یہ میدان بھی نہیں لیکن میں آپ کو ایک مثال بتاتا ہوں کہ یہ مواقع کس طرح زیادہ کیے جاتے ہیں''۔ وہ کہتا ہے کہ ''میں نے ساری دنیا

---

❶ J.D.Unwin,M.C.,PH.D(Cantab).

❷ Robert Briffault.

❸ اس کی شہرت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1919 میں چھپا تھا اور یہ کتاب آج بھی مستند اور مقبولِ عام و خاص ہے۔ اس کا مکمل حوالہ یہ ہے:

Briffault,Rober (1928). The Making of Humanity. London: George Allen Unwin Ltd.

میں تحقیق کی ہے''۔ یہ لوگ کرتے ہی یہ ہیں۔ یہ اپنے آپ کو ایک چیز کی تحقیق کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ وہ تو ایک کیڑے (Insect) کی تحقیق کے لیے اپنی تمام زندگی وقف کر دیتے ہیں' ایک پتے (Leaf) کی تحقیق کے لیے زندگی وقف کر دیتے ہیں۔ یہ تو مسائل ہی بہت اہم ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ اس نے دوران تحقیق ایک کرد [1] (Kurd) کو دیکھا۔ یہ یہاں شام وغیرہ کے علاقہ میں ہوتے ہیں۔ اس کرد نے بتایا کہ میں نے تو ساری زندگی میں ایک ہی بیوی رکھی ہے' یہ الگ بات ہے کہ موجودہ بیوی چالیسویں ہے اور بالکل شرعاً درست۔ ایک بیوی کو طلاق دیجیے' دوسری لے آیئے' ایک وقت میں تو ایک ہی بیوی رہی۔ اس نے کہا کہ میں تو اس پہ بھی نہیں آیا کہ میں ایک وقت میں چار بیویاں کرلوں'۔ بیوی لانے کے لیے بھی کیلنڈر کے ایک سال کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے کہ دسمبر والا آخری پرچہ پھاڑے تو پھر اگلا کیلنڈر آئے۔ یہاں تو بات یہ ہے کہ جب جی چاہے' پھاڑ کے دوسرا کیلنڈر لے آیئے' جب جی چاہے طلاق دیجیے اور دوسری بیوی لے آیئے۔

مودودی مرحوم کی طرف سے لاتعداد بلا نکاح لونڈیاں رکھنے کی اجازت

چلو یہ تو بیویوں تک کا قصہ ہوا۔ آپ کے ہاں تو لاتعداد لونڈیاں بلا نکاح بھی جائز ہیں۔ میں دقیانوسی زمانے کی قدامت پرستی کی بات نہیں کر رہا۔ اس دور میں قرآن کریم کی آپ کی جو Latest (جدید ترین) تفسیر ہے' یہ ہمارے ہاں کے بہت ماڈرن انداز کے مفکر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب [2] کی تحریر کردہ ہے۔ اس میں جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر ان کا فدیہ نہ ہو یا ان کی تبدیلی نہ ہو' تو انہیں حکومت سپاہیوں میں تقسیم کر سکتی ہے' تعداد کی کوئی پابندی نہیں۔ میری بیٹیاں معاف رکھیں یہ الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس کے بعد وہ سپاہی جب جی چاہے' اسے کسی دوست کی طرف بطور تحفہ بھی منتقل کر سکتا ہے' اس کو فروخت بھی کر سکتا ہے۔

---

[1] Kurd. A member of a formerly nomadic Muslim people living chiefly in Kurdistan. Kurdistan is area of western Asia, lying west and southwest of the Caspian Sea, it was split between southeast Turkey, north Syria, north Iraq, northwest Iran, and south USSR with the dissolution of the Qttoman Empire (1918). Its inhabitants, the Kurds, have been fighting in all these countries for the establishment of an independent State (Readers Digest (1990). Universal Dictionary. London: Reader's Digest Association Limited. P.856)

[2] یاد رہے یہ بات اکتوبر 1977 کی 7 تاریخ کو کہی گئی ہے۔

پارلیمنٹ میں مولانا نعمت اللہ جمعیت علمائے اسلام کے رکن کا مطالبہ اور بیان

عزیزان من! آپ کو تو شاید یاد نہ رہا ہو، مجھے یاد رکھنا پڑتا ہے کہ یہاں ہمارے ہاں 1973ء میں پارلیمنٹ میں مولانا نعمت اللہ صاحب، جمعیت علماء اسلام کے ایک رکن، نے یہ بات کہی تھی کہ غلام اور لونڈیاں ختم کر کے آئین کی یہ دھاندلی تو تم کر رہے ہو لیکن کم از کم ایک لونڈی کی اجازت تو ضرور ہونی چاہیے۔ یاد رہے کہ آپ کے ہاں آئین میں یہ بات بھی موجود ہے کہ غلامی منسوخ کی جاتی ہے۔

جی ہاں، مولانا نعمت اللہ صاحب، جمعیت علماء اسلام کے رکن قومی اسمبلی مجلس دستور ساز کے 1973ء کے اسپرنگ سیزن (Spring Season) میں، موسم بہار کے سیشن میں، اپنی تقریر میں، یہ بھی فرمایا تھا کہ غلامی کو منسوخ کرنا خلافِ اسلام ہے، جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ کم از کم ایک لونڈی رکھ سکے۔ ''انتظام کیا جائے''۔ یعنی ڈپو کھولے جان تے پرچیاں ونڈیاں جان [1]۔ پاکستان ٹائمز کی یکم مارچ 1973ء کی اشاعت میں یہ Proceeding شائع ہوئی ہے: آج 1973ء میں مولانا نعمت اللہ جمعیت العلمائے اسلام کے رکن اسمبلی فلور پہ یہ کہتے ہیں۔ یہ خبر ساری دنیا کے اندر نشر ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ غلامی کا بند کرنا خلافِ اسلام ہے، اگر آپ اس طرح خلافِ اسلام آئین پاس کرنے پہ تل ہی گئے ہیں تو بابا! کم از کم اتنا تو انتظام کیا جائے کہ کم از کم ایک لونڈی کی تو اجازت ہو۔ عزیزان من! یہ ہنسی نہیں ہے، یہ خون کے آنسوؤں کا رونا ہے۔ باہر کی دنیا کوئی مولوی نعمت اللہ یا یہاں کی اسمبلی نہیں ہے۔ باہر کی دنیا آپ کی قوم کے متعلق کیا کہے گی، آپ کے اسلام کے متعلق کیا کہے گی؟ دنیا کے بدترین ممالک نے بھی غلامی کو منسوخ کیا، امریکہ کے اندر Slavey (غلامی) کو Abolish (منسوخ) کرنے کے متعلق اتنی جنگ ہوئی۔ آپ کے ہاں اسلامی مملکت، جس کا مذہب اسلام، جس میں کوئی چیز کتاب وسنت کے خلاف نہیں، اس کی اسمبلی میں ایک رکن قومی اسمبلی، بہرحال ان کو دین کا ایک مستند عالم قرار دیا گیا ہے اور وہ آپ کے ہیں بھی مولانا، وہ یہ کچھ کہہ رہے ہیں۔

بہرحال بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ انون (J.D.Unwin) نے یہ کہا ہے کہ اس جنسی اختلاط کے مواقع کم از کم رکھنے چاہئیں۔ قرآن نے جو کہا تھا وہ یہی تھا۔ اس لیے اس کے مواقع کم از کم کیے تھے، لیکن ہمارے ہاں اس قسم کے قانون شریعت بنائے گئے کہ زیادہ سے زیادہ مواقع اس کے اندر آجائیں۔ یہ قوم ہزار سال سے، عزیزان من! اس ایک Issue (مسئلے) پہ یعنی جنسی اختلاط کے مسئلہ پہ، اپنی یہ روش رکھتی چلی آرہی ہے، میں نے جتنی چیزیں گنائی ہیں، انہیں نہ قانوناً جرم قرار دیا گیا، اور نہ معاشرے نے اس کو معیوب سمجھا۔

---

[1] ڈپو کھولے جائیں اور پھر راشن کی پرچیاں تقسیم کی جائیں۔

خلیفہ ہارون الرشید کے ہاں لونڈیوں کی تعداد

آج بھی آپ کے ہاں بڑے فخر سے تاریخ کے اندر یہ باتیں آ رہی ہیں کہ فلاں خلیفہ کے محل سرا کے اندر اتنی لونڈیاں تھیں۔ خلیفہ ہارون رشید (170-193AH بمطابق 786-809AD) کے ہاں اتنی لونڈیاں تھیں۔ یہ جو ہمارے بڑے بڑے ہارون الرشید جیسے خلیفے کا نام لیتے ہیں تو ذہن میں آتا کہ صاحب! اسلام کے بہت بڑے درخشندہ خلیفہ گنے جاتے ہیں۔ ان ایک ایک کے ہاں تین تین ہزار لونڈیاں تھیں۔ آج بھی میں ان ممالک کے نام نہیں لینا چاہتا جن کے ہاں یہ چیزیں موجود ہیں۔ ہزار برس سے جو قوم اس طرح زندگی بسر کر رہی ہو اور اسے معیوب بھی نہ سمجھے بلکہ فخر کے ساتھ ان چیزوں کو بیان کیا جائے اور فخر بھی اس حد تک! کہ میرا خیال ہے کہ عباسی خلفاء میں زیادہ سے زیادہ تین یا چار ایسے تھے جو آزاد ماؤں کے بیٹے تھے [1] یہ باقی سب لونڈیوں کے بیٹے تھے۔ انون (J.D.Unwin) کی بات سن لیجیے۔ اس نے کہا تھا کہ ایک سو سال کے بعد اس کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہوتے ہیں اور ہزار سال میں تو پھر آپ دیکھیے کہ ان کا جو Accumulative' (بہ ہیت مجموعی) اثر ہے' وہ کس قدر پڑتا ہے۔

کثرت سے جنسی اختلاط میں مبتلا قوم تحقیقاتی صفات سے محروم ہو جاتی ہے

ڈاکٹر انون (J.D.Unwin) کہتا ہے کہ جو قوم اپنے ہاں جنسی اختلاط کے مواقع میں اتنی وسعت پیدا کر لے اور پھر اس پہ اطمینان خاطر سے کاربند رہے' اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی' وہ واقعات کے اسباب و علل Causes and Effects کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی' جو کچھ ہوتا ہے اسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ ایک غیر مسلم محقق اپنی فکر کی تحقیق کا یہ نتیجہ لکھ رہا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے جس کے مطابق وہ چلے جاتے ہیں اور اس میں کبھی تبدیلی کرنے کی نہیں سوچتے۔ عزیزان من! آپ اسباب زوال کے لیے کمیٹیاں بٹھاتے ہیں' کمیشن بٹھاتے ہیں' آپ کتابیں لکھتے ہیں۔ اسباب کو چھوڑ دیجیے' غیر مسلم مفکر سے پوچھیے۔ وہ ایک ہی سبب بتا رہا ہے۔ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کو دیکھتے چلے جائیے اور پھر اسے آپ پوری مسلمان قوم کے اوپر' ہزار سال کی تاریخ پر

---

[1] عباسی خلفا کا دور حکومت 132 تا 656 ہجری پر محیط ہے۔ یہ 524 سالہ دور حکومت ہے جسے مورخین عروج و زوال کے لحاظ سے تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں: (1) نمود و عروج کا دور 132 تا 247 ہجری (2) زوال و انحطاط کا دور 247 تا 447 ہجری اور (3) سلجوق ترکوں کا عروج اور عباسیوں کی تباہی کا دور 447 تا 656 ہجری۔ [رؤف' ڈاکٹر (1994)۔ تاریخ اسلام (انگریزی زبان میں): لاہور: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ' ص ص۔ 69-29]

منطبق کرتے چلے جایئے۔ اس آئینے میں اپنا یہی چہرہ نظر آتا ہے جو اس نے کہا ہے کہ زندگی کے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے جس کے مطابق وہ چلتے جاتے ہیں' ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

خانقاہیت' تعویذ' گنڈے' نذر نیاز' اس قوم کا معمول بن جاتا ہے

انون کہتا ہے کہ اس قوم میں فکر کی وہ قوت نہیں رہتی جس سے وہ اپنے معاملات میں راہ نمائی حاصل کرے۔ اس قوت کا مظہر (Manifestation) کبھی پتھروں کو سمجھتا جاتا ہے' کبھی درختوں کو' کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں' کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے' جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے اور مقبروں اور خانقاہوں پر جا کر سجدے کیے جاتے ہیں۔ یہ کچھ غیر مسلم محقق لکھ رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنی اس کتاب میں تعویذ' ورد وظائف' گنڈے تعویذ ان سب چیزوں کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قوم کے اندر نذر' نیاز' ہوتی ہیں' غرض یہ کہ زمانے کا گزر جانا' ٹائم کا Passage (گزرنا)' ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا' اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں' اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں' یہ انسان نہیں ہوتے حیوان ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا' عزیزان من! کہ یہ جنسی مسئلہ انفرادی مسئلہ نہیں ہے کہ اگر ایک جوڑا باہم راضی ہو جائے تو پھر اسے نہ معیوب جانئے' نہ قانون کی دست اندازی اس کے اندر ہو' یہ تو بڑا گہرا قومی نہیں بلکہ انسانیت کا مسئلہ ہے۔

قرآن چور کو نہیں چور کی ماں کو مارتا ہے

عزیزان من! اب اس تحقیق کی روشنی میں آپ پھر اسے Appreciate (پسند) کریں گے کہ قرآن کریم نے اسے اتنی اہمیت کیوں دی ہے لیکن قرآن کا تو اپنا انداز ہی منفرد ہے۔ وہ ہے جو محاورے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چور کو نہیں چور کی ماں کو مارتا ہے کہ چور پیدا ہی نہ ہو۔ وہ معاشرے میں اس قسم کی جو انسانیت سوز روش ہے' اس کو روکنے کے لیے یہی نہیں کرتا کہ وہ ایک دم قانون نافذ کر دیا کہ اس کو قتل کر دو' اس کو بیت مار دو' اس کو درے لگا دو۔ ہماری نگاہ تو اسی پہ جاتی ہے کہ قرآن نے یہ کہہ دیا۔ میں ابھی بتاؤں گا کہ **اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ** (24:2) زانی مرد یا زانی عورت کو سو سو درے یا کوڑے لگاؤ۔ ہمارے ہاں تو اتنا ہی ہے لیکن قرآن یہاں تک پہنچنے سے پہلے وہ تمام دروازے بند کرتا ہے جو انسان کو اس طرف لے جاتے ہیں۔ وہ ایسی فضا پیدا کرتا ہے جس میں اس طرف نگاہ کا رخ اٹھے ہی نہیں۔

تغیر نفس کے بغیر باہر کا تغیر ممکن ہی نہیں

قرآنی قوانین یا جنہیں تعزیرات کہتے ہیں یا سزائیں کہتے ہیں' ان کے لیے یہ اصول یاد رکھیے کہ قرآن پہلے اپنے ہاں دین کا ایک نظام قائم کرتا ہے' ایک فضا قائم کرتا ہے' انسان کی ذہنیت کے اندر' ایک تغیر پیدا کرتا ہے' ایسی فضا پیدا کرتا ہے کہ انسان اس کام کی طرف آنے ہی نہ پائے۔ اس کے بعد اگر اس قسم کے کوئی افراد رہ جاتے ہیں جو سرکشی برتتے ہیں تو انہیں وہ صرف سزا سے روکتا ہے۔ تغیر نفس کے بغیر تو باہر کا تغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ خالی سزائیں کبھی بھی جرائم نہیں روک سکتیں' اس لیے کہ پہلے تو پورے طور پر انفرادی تغیر نفس کرنا ہے' ذہنیت بدلنا ہے یعنی یہ جو اقدار ہیں پہلے ان کی قدر و قیمت کو ایمان بنانا ہے پھر معاشرے کے اندر اس قسم کے احکام دینا ہیں۔ میں یہاں صرف دو چار احکام ہی پیش کر سکوں گا' وقت بھی بھاگا جاتا ہے اور ''احباب کا تقاضا بھی ہوندا اے' پئی اے قرآن شریف ختم کدوں ہوئے گا؟ نہ تہانوں ختم ہون دی ہوئی ہیگی اے ایہدی' اے مکے گا کس دن؟ ساڈے وی جیہڑا جشن ہوندا اے ختم شریف ہوندا اے۔ ختم دلایا جی اوہدا' مک گیا سیاپا''۔ ❶

قرآن حکیم کے آغاز شریف کی بجائے قرآن کے ختم شریف کی محفلیں

کبھی آپ نے کسی کو آغاز شریف کا جشن مناتے ہوئے دیکھا ہے۔ ''اج فلاں حضرت صاحب کا ختم ہے۔ میں چلیاں جی' ختم شریف ہوریا اے جی۔ قرآن شریف اج ختم ہونا ہیگا۔ اوتہاڈا استیاناس' کدوں کوئی گل شروع دی وی تے کرو''۔ ❷ اس لیے' عزیزان من! اپنے آپ کو اس فریب میں بھی نہ رکھیے۔ پہلے بھی اس طرح سے مجھے ختم شریف پہ زور دیا تھا جب 1967 کے دسمبر میں قرآن پاک ❸ ختم کیا

---

❶ احباب کا بھی تقاضا ہوتا ہے کہ یہ قرآن شریف کب ختم ہوگا؟ آپ کو تو اس کے ختم کی لگی ہوئی نہیں ہے کہ یہ کب ختم ہوگا؟ ہمارے ہاں بھی جشن منایا جاتا ہے۔ وہ اس کے ختم کا ہی ہوتا ہے۔ ''جی اس کا ہم نے ختم دلا دیا ہے''۔ مصیبت ختم ہوئی۔

❷ (یہی ہوتا ہے کہ) آج فلاں حضرت صاحب کا ''ختم'' ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں جی! ختم شریف ہو رہا ہے۔ آج قرآن شریف ختم ہونا ہے۔ ارے تمہارا استیاناس ہو' کبھی کوئی بات شروع کی بھی کرتے ہو۔

❸ قرآنِ کریم کے ہفتہ واری درس کا سلسلہ (غالباً) 1950 میں کراچی سے شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے دہلی اور شملہ میں متفرق خطابات کے ذریعے اس فریضہ کو سرانجام دیا جاتا تھا۔ درس کا پہلا سلسلہ جو لاہور میں شروع کیا گیا آٹھ سال کے بعد دسمبر 1967ء میں تکمیل تک پہنچ گیا تھا۔ پھر اتوار 17 مارچ 1968ء کو اس سلسلۂ نو کا آغاز بہار کے موسم سے ہوا۔ سلسلۂ اول میں درس کا انداز زیادہ تر خطیبانہ تھا۔ مارچ 1968ء کے اس سلسلہ نو میں درس کا انداز معلمانہ ہے۔ قرآن کریم کو ایک نصاب کی کتاب کی طرح احباب کے سامنے پیش کیا گیا ہے یعنی اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح کرتے ہوئے متعلقہ آیت کا مفہوم متعین کیا گیا ہے اور پھر اس آیت کا ربط دیگر آیات کے ساتھ قائم کرتے ہوئے قدم آگے بڑھایا گیا ہے۔ چہ عجب کہ وہ قرآنی حقائق' جو سلسلۂ اول میں نگاہوں سے پوشیدہ رہ گئے' اس دفعہ بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں۔ (ماخوذ از پرویز: درسِ اول' قرآن کریم کے سمجھنے کا طریق' طلوعِ اسلام اپریل 1968ء لاہور' ص ص 33-18) نیز درسِ قرآن کی مختصر تاریخ کے لیے دیکھئے مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006' ص ص 29-32۔

اس وقت سے میرا تو انداز یہ ہے کہ میں جب آخر میں والناس پہ آتا ہوں ہے تو والناس کے فوراً ہی بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ پڑھ دیا کرتا ہوں' اسی دن سے پھر اس کا' آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ ایک دائرہ ہے' عزیزان من! دائرہ میں کہیں ''ختم'' (End) نہیں ہوتا۔

میں قرآن کے اس نورانی سفر پر 50 سال سے گامزن ہوں

عزیزان من! کوئی میرے دل سے پوچھے۔ مجھے اس دائرے میں کم از کم پچاس سال ہو گئے ہیں۔ میرا انداز یہی ہے۔ میرا یہ درس قرآن مسلسل چلا آ رہا ہے خواہ ایک ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔ جب مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ (114:6) آتا ہے تو میں اسی وقت بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ کہہ دیتا ہوں۔ یہ تو وہ چیز ہے۔ ❶

فواحش کا مفہوم

عزیزان من! قرآن یہ کہتا ہے کہ زنا یعنی جنسی اختلاط کا' جو ایک آخری فعل ہے' اس Event کا انجام' ایک ہے۔ اس سے پہلے' جتنی مبادیات زنا کی طرف لے جانے والی چیزیں ہیں' انہیں وہ فواحش کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ بڑا جامع لفظ ہے۔ میں اس کا کیا ترجمہ کروں؟ اسے بے حیائی بھی کہا جاتا ہے۔ انسان کے اندر جنسی جذبات کو انگیخت کرنے کی یہ جتنی چیزیں ہیں ان سب کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ پوچھا کرتے ہیں کہ قرآن کی رو سے حرام کیا کیا چیزیں ہیں؟ ہمارے ہاں تو ایک ہی چیز پہ زور رہ گیا ہے کہ سور حرام ہے۔ اوتے ایتھے مہنگا ایناں ہوندا اہیگا' کھا کون سکدا اونوں۔ آ معاشرے دا سور واقعی بڑا سستا ہو گیا ہو یا ہیگا اے۔ اوسور تے بڑا مہنگا ہے۔ ❷ ہمارے ہاں کی بس یہ ایک ہی بات ہے۔

عدالت میں غالب ❸ کا بیان: میں آدھا مسلمان ہوں

تاریخ بتاتی ہے کہ غالب ❸ جب ایک مقدمے میں پیش ہوا ہے تو اس کے باپ کا نام لینے کے بعد عدالت نے اس سے سوال میں

---

❶ قرآن کریم کے اس نورانی سفر پر 50 سال کی ایک ہلکی سی جھلک پچھلے صفحہ کے فٹ نوٹ نمبر 3 پر' دروس قرآن کے حوالے سے' دی جا چکی ہے۔

❷ وہ تو یہاں اتنا مہنگا ہے کہ اسے کوئی کھا ہی نہیں سکتا لیکن معاشرے کا یہ سور تو یہاں بہت ہی سستا ہو چکا ہے۔ وہ سور (جسے حرام کہتے ہیں) بہت ہی مہنگا ہے۔

❸ مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869) کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب ترک خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو سمرقند سے ہندوستان آ کر بس گیا تھا۔ وہ اپنا شجرہ نسب افراسیاب بادشاہ توران (ترکستان) سے ملاتے تھے۔ (حوالہ: ضیائی امپوری' شادانی طاہر اور احسن حفیظ الرحمٰن: تحسین اردو' ایوان ادب' لاہور' 1992' ص۔ 77)

کہا کہ کیا تم مسلمان ہو؟ اس نے کہا کہ جی، میں آدھا مسلمان ہوں۔ یہ عدالت میں اس کا بیان تھا۔ یہ عجیب شخص تھا۔ جج کہنے لگا: اوئے ادھا مسلمان کیسے؟ غالب کہنے لگا: جی، شراب پیتا ہوں مگر سور نہیں کھاتا۔ یہ شخص بڑی چیپت لگاتا تھا۔ اس میں کتنا گہرا طنز ہے کہ مسلمانی تو اتنی رہ گئی ہے: سور نہ کھاؤ، شراب نہ پیو، مسلمانی ہوگی۔ غالب نے کہا کہ میں آدھا مسلمان ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ **قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ** (7:33) بتادو کہ میرے پروردگار نے فواحش کو حرام قرار دیا ہے۔ تو حرام کیا چیز ہے؟ یہ فواحش ہے جو حرام ہے۔ ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بڑا جامع لفظ ہے۔ ہمارے ہاں، ہر وہ شے جو انسان کے اندر جنسی جذبات کی انگیخت کا موجب بن جائے فواحش میں آجاتی ہے اور اسی لیے یہاں یہ جمع کے صیغے میں آیا ہے۔ مگر یہ تو پتہ نہیں کہ اس میں کتنی چیزیں شامل ہونگی۔ عزیزان من! قرآن کی انفرادیت دیکھیے کہ کہا گیا ہے کہ **حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ** ❶ (7:33)۔ وہ فواحش جو یوں سامنے آجائیں یا دلوں کے اندر چٹکیاں لینے والے ہوں، ان کے لیے کہا کہ **حَرَّمَ رَبِّیَ** (7:33) میرے رب نے فواحش کو حرام قرار دیا ہے، جو **مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْیَ** (7:33) خواہ وہ کھلی ہوئی ہوں، پوشیدہ ہوں، خواہ وہ اکیلے اکیلے اپنی ہی ذات میں کرو اور اس طرح اضمحلال واقع ہو جائے یا مل کر کرو اور سرکشی پیدا ہو جائے۔ یہ دونوں حرام ہیں۔ غور کیجیے کہ قرآن اس میں کیا کیا کہہ گیا ہے اور اثم میں کیا کیا چیزیں آجاتی ہیں۔ اسی البغی میں کیا کیا چیزیں آجاتی ہیں۔ یہ سب حرام ہیں۔

قرآن میں حرام چیزوں کا بیان

کیا آپ کو معلوم ہے کہ قرآن میں کون کونسی چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں؟ یہ ہیں مردار، بہتا ہوا لہو، لحم خنزیر، اور چوتھی ❷ وہ چیز ہے جس کو زبان پہ لاتا ہوں تو کفر کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔ مجھ پہ جو کفر کا فتویٰ لگا تھا اس میں ایک یہ بھی تھا۔ اس چوتھی چیز کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ **مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ** (2:173) ہر وہ شے جو اللہ کے سوا کسی شخص کی طرف منسوب کی جائے۔ یہ چوتھی چیز حرام ہے۔ یہ لو جی، اے نذر نیاز نوں وی حرام قرار دیندا جی ❸۔ گویا یہ کچھ میں حرام قرار دیتا ہوں۔ خیر، یہ قرآن کی رو سے حرام مطلق ہے لیکن اس میں ایک استثنا ہے۔ اس کے لیے یہ کہا ہے کہ اگر ایسی اضطراری ❹ حالت پیدا ہو جائے کہ جان پہ بن آئے۔ اور کھانے کو کچھ اور نہ مل سکے تو جان کے

---

❶ میرے نشو ونما دینے والے نے ہر قسم کی بے حیائی کی باتوں کو، خواہ وہ کھلی ہوئی ہوں یا پوشیدہ (عملاً ہوں یا ان کی آرزوئیں دل میں کر دئیں لیتی ہوں) حرام قرار دیا ہے۔

❷ **انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اهل به لغیر الله** (2:173) خدا نے تم پر حرام قرار دیا ہے: مردار، بہتا ہوا خون (6:146) خنزیر کا گوشت، اور ہر وہ شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔

❸ یہ لو جی! یہ اس نذر نیاز کو بھی حرام قرار دیتا ہے۔

❹ **فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیه** (2:173) پھر اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کھانے کے لیے اور کچھ نہ ملے، اور تم (جان بچانے کے لیے) مجبور ہو جاؤ تو ایسی حالت میں، ان چیزوں کو بھی کھا سکتے ہو جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ تم واقعی مجبور ہو جاؤ اور تمہاری نیت (Intention) قانون شکنی، یا ہوس پرستی کی نہ ہو۔

بچانے تک ان میں سے کوئی چیز بھی کھا سکتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان میں یہی لحم خنزیر یا مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (2:123) ہی ہو سکتا ہے کیونکہ مردار یا بہتا ہوا لہو تو کوئی نہیں کھاتا۔ بہرحال قرآن نے جان بچانے کے لیے' اضطراری حالت کے لیے' ایک استثنا یا Exception کر دی ہے۔

جنسی اختلاط کے لیے کوئی اضطراری حالت نہیں ہوتی

آپ حیران ہوں گے کہ جنسی اختلاط کے لیے کوئی Exception (استثنا) نہیں' کوئی اضطراری حالت نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیا بات ہے؟ حالانکہ اگر آج یہ چیز پوچھیے تو وہ کہیں گے کہ صاحب! اس میں اضطراری حالت پیدا ہوتی ہے۔ بھوک تو پھر بھی آدمی ضبط کر لیتا ہے' اس پہ تو ضبط ہی نہیں ہو سکتا۔ عزیزان من! سنیے! بھوک کسی کے لگائے سے نہیں لگتی' پیاس کسی کے انگیخت سے نہیں لگتی۔ وہ جسم کی یا زندگی کا طبعی تقاضا ہے جو از خود اندر سے پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ کتنے ہی کسی اہم کام میں محو بیٹھے ہوئے ہوں' کسی بات کا' ماحول کا' اِدھر اُدھر کا خیال نہ ہو' اپنے آپ کو بھی بھول گئے ہوں' پیاس لگنی شروع ہو جائے گی۔ آپ کے خیال کا' ارادہ کا' اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ لگنی شروع ہو جاتی ہے۔

آپ خیال نہ بھی کریں تو بھی وہ اور بھڑکنی شروع ہو جاتی ہے اور اس کے بعد ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ آپ کو کام نہیں کرنے دیتی۔ اٹھ کے پانی پینا پڑتا ہے' اور آپ اس کو کچھ عرصہ کے لیے روکیں تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس میں آپ کے اپنے اختیار اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ از خود (From Within) اٹھتی ہے لیکن جنسی خواہش کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ یہ آپ کے خیال سے بیدار ہوتی ہے' آپ خود خیال نہ کریں تو یہ از خود پیاس کی طرح' بھوک کی طرح' اندر سے نہیں ابھرتی اور نہ ہی یہ صورت ہے کہ اگر اس کی تسکین نہ کی جائے تو بھوک اور پیاس کی طرح موت واقع ہو جائے۔ موت تو ایک طرف رہی اس سے تو انسان کو بہت ہی زیادہ توانائیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ان توانائیوں کا ان لوگوں سے پوچھو جو مغرب کے مفکر ہیں۔

آج ہمارے ہاں فواحش کی کیفیت

قرآن نے کہا ہے کہ فواحش کو معاشرے کے اندر آنے سے روکو یعنی ہر وہ چیز' جو اس خیال کو بیدار کر دے' جس کا تعلق جنسی جذبے سے ہے' اس کا معاشرے کے اندر آنا بند کرو۔ اس خیال کو ادھر نہ آنے دو۔ آج کے دور میں تو پوچھو ہی نہیں کہ کس قدر ان کی یلغار ہے۔ جس طرح وبائی امراض کے اندر اتنے جراثیم پھیلے ہوئے ہوتے ہیں کہ آپ لاکھ احتیاط برتیں وہ سانس کے ساتھ آپ کے اندر چلے جاتے ہیں' آج تو آپ کے معاشرے میں فواحش کی کیفیت یہ ہو گئی۔ پہلے تو پھر بھی آپ کو اس کے لیے کہیں جانا پڑتا تھا' کہیں راستے سے

گزرتے تھے تو یہ سینما والوں کی قدآدم بہیمانہ تصاویر تھیں جو یہ کیفیت پیدا کرتی تھیں کہ سینما کے اندر یہ کچھ ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں فواحش کی یہی چیزیں تھیں۔ یہ سب کچھ تھا' کبھی کبھی کسی جگہ کوئی اس قسم کا گانا ہوا جس کے اندر کوئی فواحش کی بات ہوگئی' وہ بھی کہیں ہوتا تھا' جو جا کے سننا پڑتا تھا۔ اب تو گھر کے کونوں اور کھدروں کے اندر یہ آ گھسا ہے۔ یہ طاعون کے چوہے' ہل چلانے والا بیل کے ہل کے ساتھ' ٹرانزسٹر (Transister) کی صورت میں لگا ہوا ہوتا ہے کہ اوہدے وچوں فیر جیہڑے اونغے نکلدے نیں تے اوگیت نکلدے ہیگے نیں' ❶ ان کا تو ایک لفظ بھی میں دہرا نہیں سکتا۔ آپ ان سے بچ کے ہی نہیں جا سکتے۔ بچے رہیے اور سنیے! میں یہاں کمرے کے اندر بیٹھا رہتا ہوں' کہیں نہیں جاتا۔ ہوا یا روشنی کے لیے ادھر کی کھڑکی سے سارا دن اس سڑک کے اوپر ''پہلی ملاقات ہے جی' پہلی ملاقات ہے'' ''جو شروع ہوندا اے قصہ جناب شام تک چلا اے۔ ❷ وہاں سے رکیے' اندر کی طرف آیئے۔ وہاں سے ایک ریڈیو چلا آ رہا ہوتا ہے۔ اس سے آگے جایئے' ٹی وی لگا ہوا نظر آ رہا ہے۔ یہ تمام لٹریچر طوفان کی طرح چلا آ رہا ہے۔ آپ کے ہاں یہ پہلے ہی کچھ کم نہ تھا۔ یہ جو آپ کے ہاں شاعری عام ہوئی ہے وہ فواحش پھیلانے میں کچھ کم نہیں تھی لیکن بہرحال پہلے کہیں مشاعرہ سننے جانا پڑتا تھا' کوئی کتاب خریدنی پڑتی تھی' اب تو اس کی صورت یہ ہے کہ یہ آپ کے ایک ایک گھر کے اندر چھ چھ گھنٹے تک موجود ہے۔ اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ فردوس گوش ہی بنے' ٹی وی (Television) تو لذت نگاہ بھی بنتا ہے۔ میں نے تو نہیں دیکھا۔ کہتے ہیں کہ رنگین تصاویر بھی آ رہی ہیں اور کشش درکشش چلی آ رہی ہیں۔ شاید اگلی تحقیق کچھ یہ ہو کہ اس کے لیے خود مجسمے کے طور پہ بھی آ جانا شروع کر دیں۔ اس کے بعد کیا آ جائے گا؟ فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے اس لیے کہ یہ ایسی چیز ہے۔ یہ فواحشات دیکھیے' کوئی نئی چیز آئے تو کچھ عرصہ کے لیے اس کے اندر کشش ہوتی ہے' بعد میں وہ معتدل ہو جاتی ہے' گھس پٹ جاتی ہے' اس میں جاذبیت نہیں رہتی۔ آدمی اتنی سی افیون لینے سے شروع کرتا ہے۔ ہفتے دو ہفتے کے بعد اس سے کچھ نہیں بنتا تو پھر ذرا زیادہ بڑی گولی ہو جاتی ہے۔ فواحش کی بھی یہی کیفیت ہے' لیکن وہاں فواحش کی جو اس قدر فیکٹریاں (Factories) لگی ہوئی ہیں ان کے لیے مارکیٹس (Markets) ہمارے جیسے ملک ہیں' بھرمار پڑی ہوئی ہے۔ قرآن کریم نے کہا تھا کہ ایک ایسا دور بھی آئے گا جہاں **شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا** ❸ (76:7) Evil اور شر اڑ کر چمٹ جایا کرے گا' آج اڑ کے چمٹ جاتا ہے۔ ان نوجوانوں کے پیچھے آپ لٹھ لیے پھرتے رہتے ہیں۔ کم بختوں نے' ان کے لیے اور آپ لوگوں نے بھی فواحش کے بہت زیادہ راستے کھول دیئے ہیں' راستے ہی نہیں کھول دیئے' ان جراثیم سے فضائیں بھرپور کر دی ہیں۔

---

❶ جس سے جو نغمے نکلتے ہیں' جو گیت ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔

❷ جو شروع ہوتا ہے تو شام تک چلتا ہے۔

❸ معاشرے میں چاروں طرف شر پھیل جائے گا (ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو جائے گا۔ ساری فضا اس سے متاثر ہو جائے گی۔ اس کی چنگاریاں اڑ کر دور دور تک پہنچ جائیں گی)۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
بعض می گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

کہتا ہے کہ ''کپڑیاں سمیت بھنور دے اندر سٹ دتا ای مینوں' تے اُتوں کیندا ایں پئی دیکھیں تیرے کپڑے تے پانی دا داغ نہ کوئی لگے۔''❶ تعلیم کے نصاب میں آپ دیکھیے تعلیمی درسگاہوں میں دیکھیے' اساتذہ کے اندر دیکھیے' کہاں کہاں آپ کو بتایا جائے۔ مکتب اور دارالعلوموں کے اندر جا کے دیکھیے۔ وہ تو کبھی میں نے موضوع ہی نہیں چھیڑا۔ یہ آپ کے ہاں فقہ کے جو مسائل وہاں پڑھائے جاتے ہیں ان پر اتنی اتنی ضخیم کتابیں ہیں۔ عزیزان من! 75% ان کے اندر جنسیات سے متعلق مواد ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے فواحش کے متعلق کہا کہ یہ حرام ہے' زنا کے متعلق تو بات بعد میں آئے گی۔ فواحش کو قرآن نے ہی حرام قرار نہیں دیا بلکہ کہا کہ **اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ** (24:19) جو لوگ مسلمانوں کے معاشرے کے اندر فواحش کو پھیلاتے ہیں' اشاعت بمعنی فواحش کا پھیلانا تو یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے لیے کہا کہ ان کو اس دنیا میں بھی الم انگیز سزا دو اور پھر کہا کہ آخرت میں ہم نمٹ لیں گے۔

عذاب فی الآخرت کا مفہوم

یاد رکھیے! قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی آخرت کی سزاؤں کا ذکر آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ وہ جو تم نے جس (Value) قدر کو بھی توڑا ہے' ایک تو اس کی سزا' دنیا کے اندر' معاشرہ دیتا ہے' وہ معاشرہ جو اس کو جرم قرار دیتا ہے اس میں اس کی سزا ملتی ہے۔ یہ دہری سزا ملتی ہے۔ ایک سزا تو اس (Value) قدر کے توڑنے کی' معاشرے کی طرف سے بدن کو ملتی ہے اور اس Value (قدر) کے توڑنے کی سزا انسان کی ذات (Self) کو ملتی ہے۔ اسے کہتے ہیں عذاب فی الآخرت۔ غور کیجیے گا یہ عجیب چیز ہے۔ معاشروں میں جینے والوں کو تو اکہری سزا ملتی ہے۔ یہ سوسائٹی (معاشرے) کی سزا ہے اور اس سے وہ بچ بھی جاتا ہے۔ یہاں تو یہ کیفیت ہے۔ وہ اس سزا سے نہ بھی بچے' سوسائٹی (معاشرہ) اسے سزا بھی دیدے تو بھی اس کو وہ سزا جو اس (Value) قدر کو توڑنے کی ہے' جو اس کی ذات (Self) کے اوپر وارد ہوئی ہے' اسے تو سوسائٹی (معاشرے) کی بھی کوئی سزا معاف نہیں کر سکتی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اسے وہ معاشرے کی سزا ہو گئی تو اس سے اس کی ذات پر وارد ہونے والی سزا بھی مل گئی' نہیں' ایسا نہیں ہے۔ بالآخرۃ کے معنی یہ ہوتے ہیں۔

نظر کے ساتھ جب عقل و فکر مل جائے تو وہ بصر بن جاتی ہے

یہ جو کہا جاتا ہے کہ جب باہر چلو تو نگاہیں نیچی کر کے چلو (24:30-31)۔ پھر اس پر اعتراضات ہوتے ہیں کہ صاحب!

---

❷ مجھے کپڑوں سمیت بھنور میں پھینک دیا ہے اور پھر اس پہ کہتا یہ ہے کہ دیکھنا' کہیں تمہارے کپڑوں پر پانی کا داغ نہ لگ جائے۔

یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (24:30) کے معنی آنکھوں کو یوں کرنا نہیں۔ اس ''یغضوا'' کے معنی ہیں ''نگاہوں کو آوارہ اور بیباک نہ ہونے دیں''۔ اس میں دیکھنے کی بات نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں ''ابصار'' کہا ہے۔ نظر اور بصر میں قرآن اور عربی زبان کی رو سے بڑا فرق ہوتا ہے۔ ''نظر'' تو صرف Eye Sight (نگاہ) ہوتی ہے اور جب Eye Sight (نگاہ) کے ساتھ آپ کی توجہ اور فکر بھی مل جائے تو وہ ''بصر'' ہوتی ہے۔ یہاں ابصار کے متعلق کہا ہے کہ اپنی نگاہوں کو آوارہ اور بیباک نہ ہونے دیں۔ نگاہیں وہ کھڑکیاں ہیں جن سے انسان کے دل میں چور داخل ہوتے ہیں اور معاشرے میں بے حیائی کے راستے کھلتے ہیں۔ اس سے منع کیا گیا ہے۔

عصمت کی نقب زنی کا پہلا ذریعہ

قرآن کریم میں پہلے **قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ** (24:30) آیا ہے۔ یاد رکھو! مردوں سے پہلے حکم کیا گیا ہے اور اس کے بعد کہا ہے کہ **قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ** (24:31) مومن عورتوں سے بھی یہ کہو کہ باہر چلیں تو نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں۔ دونوں جگہ ہے کہ **يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ** (24:30) اور **يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ** (24:31) تا کہ ان کی عصمت محفوظ رہے۔ تو عصمت کی نقب زنی کے لیے یہ چیز ہے۔ نگاہوں سے ہی تو یہ ساری بات شروع ہوتی ہے۔ یہ دریچے چوروں کے لیے بڑے خطرناک ہیں۔ قرآن نے یہاں، ان کے متعلق، پہلے تو یہ کہا کہ فواحش نہ پھیلاؤ پھر دوسری چیز یہ کہی کہ باہر چلو پھرو تو نگاہوں کو کبھی بیباک نہ ہونے دو۔ پردہ کرنے کا قصہ تو پھر میں کبھی لاؤں گا۔ پردے کی صورت یہ نہیں ہے۔ کہا کہ ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ ان سے کہو کہ **وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ** (24:31) آرائش کی چیزیں ہوتی ہیں، مگر آرائش و زیبائش کی چیزوں کی عمداً نمود نہ کرو۔ اس کے لیے کہا کہ **اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا** (24:31) جس قدر وہ چلتے پھرتے از خود ظاہر ہو جائیں، انہیں اتنا ہی ظاہر ہونے دیں۔ انہیں خود نمایاں نہ کریں۔ انہیں بالارادہ نمایاں کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کے دل میں نمائش حسن کا جذبہ کروٹیں لے رہا ہے۔ اس لیے یہ کہا ہے۔ چلتے پھرتے غیر ارادی طور پر تو جو چیز یونہی ظاہر ہو جاتی ہے اس میں وہ بات نہیں ہے مگر کیا بات ہے قرآن کی! کہا ہے کہ عمداً ان کی نمود نہ کرو۔ جب عمداً نمود کی جائے گی تو یہ وہ صورت ہوگی جس میں عورت کے دل میں نمائش حسن کا خیال پیدا ہوگا، وہ عمداً نمود کرے گی۔ اس کے لیے قرآن کریم نے دوسری جگہ ''تبرج'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ابھار ہوتے ہیں، اور اس کا نتیجہ نمائش حسن کا جذبہ ہوتا ہے۔ کیا کیا بات بتاؤں! وہ سامنے والی گھڑی بھی تو بڑی تیز چلتی ہے۔ وقت ہے کہ بھاگا جا رہا ہے۔ اب پھر اگلی بات قرآن نے وہ بتا دی مگر ان تمام احتیاطوں کے باوجود کہا کہ یاد رکھو: **وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا** ❶ (24:33) اگر اس پابندی کے مطابق یہ چیز نہ ہو، جسے اس نے نکاح کہا ہے، میں آگے چل کر اس کی بات کروں گا۔ یہاں یہ کہا ہے کہ تم اپنی عصمت کی حفاظت کرو۔ اس کا ترجمہ Self

---

❶ اور جن لوگوں کے لیے رشتے کا انتظام نہ ہو سکے۔

Control (ضبطِ خویش) ہے۔

عزیزانِ من! یہاں یَسۡتَعۡفِفۡ [1] فِی الَّذِیۡنَ آتا ہے۔ عصمت کا لفظ اس سے ہی نکلا ہے کہ اگر یہ چیز نہیں ہے یعنی رشتے کا انتظام نہ ہو سکے تو اس کے بعد یہ Self Control (ضبطِ خویش) ہے' اپنے آپ پہ ضبط [2] رکھنا ہے۔ کھانے پینے کے معاملے کی طرح نہیں۔ قرآن کریم نے کہا کہ وہ اس کے بس کی بات نہیں ہے کہ پیاس کو کنٹرول کرے۔ جنسی جذبے پہ کہا ہے کہ اس پہ کنٹرول کرو۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ معاشرے کو حکم دیا کہ ان چیزوں کو پھیلنے نہ دو' اگر کہیں کوئی تھوڑی بہت گنجائش رہ گئی ہو تو ان کو یہ کہا کہ نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دو۔ اس کے بعد کہا کہ اگر اس کے باجود کوئی صورت ہے تو خیال اِدھر نہ آنے دو۔ اس کے بعد یہ ہے کہ جب لوگوں کی کوئی Exceptional (استثنائی) چیزیں ایسی رہ گئیں' معاشرے میں اس قسم کے لوگ رہ جاتے ہیں کہ ان احتیاطی تدابیر کے باوجود کوئی چیز ہے جو سرکشی پہ آئے تو اس کے لیے ہے کہ اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡھُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ [3] (24:2)۔ یہ سزا ان کے لیے ہے جو قرآن نے مقرر کی ہے۔ یہ میں اگلے درس میں بتاؤں گا کہ یہ جلدۃ' جو قرآن نے کہا ہے' کوڑے یا درے جو کہا جاتا ہے' آج اس کو بید کہا جاتا ہے' یہ تھی کیا چیز؟ یہ سزا ہے کیا چیز' جو قرآن نے کہی ہے؟ کس کس جرم کے لیے یہ چیز کہی گئی ہے؟ کیا کیا جائے؟ مگر مشکل یہ ہے کہ

مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

(اقبال: بالِ جبریل)

وہ یہ کہتے ہیں۔ بہت اچھا جی! آئندہ درس میں ہم اس کی سزا کے متعلق بات کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّاۤ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

---

[1] اس کا مادہ ''ع ف ف'' ہے۔ تاج العروس' محیط المحیط اور المفردات فی غریب القرآن میں لکھا ہے کہ العفۃ نفس کا ایسی حالت میں پہنچ جانا جس کے ذریعہ وہ غلبہ شہوت سے محفوظ رہے۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: پرویزؒ۔ لغات القرآن جلد سوم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1961' ص ص۔ 1175 تا 1176

[2] قرآن کریم نے بھوک کے معاملہ میں اضطراری حالت میں حرام چیزوں کے کھانے کی (بقدرِ ضرورت) اجازت دی ہے (6:146) لیکن جنسی خواہشات کے ضمن میں حرام کاری کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے کہ بھوک پر انسان کا اپنا کنٹرول نہیں اور غذا نہ ملنے سے انسان بیمار ہو جاتا ہے اور مر بھی جاتا ہے۔ لیکن جنسی خواہش کی بیداری انسان کے اپنے کنٹرول کی چیز ہے اور اس کی تسکین نہ ہونے سے کچھ ہرج واقع نہیں ہوتا۔ اس لیے اس میں اضطراری حالت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' ص۔ 803 (فٹ نوٹ 1)۔

[3] زانی عورت اور زانی مرد کو سو سو کوڑوں کی سزا دو۔

تیسرا باب: سورۃ النور (فلسفہ سزا اور آیات 1 تا 2)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝۱ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۠ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَاۗىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝۲

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1977ء کی 14 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورۃ النور کی ابتدا ہی سے ہو رہا ہے، پچھلے دو دروس سے پہلی دو آیات ہی ہمارے زیرِ نظر ہیں۔

زیرِ نظر موضوع کی اہمیت

شاید بعض احباب کے دل میں یہ خیال گزرتا ہو کہ ان آیات میں بات تو اتنی سی تھی کہ زانی مرد اور زانی عورت کو سو سو کوڑوں کی سزا دی جائے، میں نے گزشتہ دو درس اس پہ صرف کر دیئے اور آج کا تیسرا درس بھی اسی کی نظر ہو جائے گا تو یہ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ اس اتنی طوالت کی ضرورت کیا ہے؟ لیکن آپ نے گزشتہ دو درسوں میں دیکھ لیا ہوگا کہ اس کی ضرورت تھی۔

جنسی بدنہادی اور اس کی سزا کا باہمی تعلق

اسے میں پھر دہرا دوں کہ اس سزا کے متعلق بھی اس لیے ضرورت ہے کہ آج کل [1] ہمارے ہاں عام طور پہ یہ ہو رہا ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام یا نظامِ مصطفی ﷺ قائم کیا جائے گا۔ اس میں صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ صاحب! اس میں چور کے ہاتھ کاٹے جائیں گے، زانی کو کوڑے لگائے جائیں گے، یا ان کو سنگسار یعنی رجم کیا جائے گا اور بس۔ یہ کیا اور سمجھ لیا کہ اس سے نظامِ مصطفی ﷺ قائم ہو گیا۔ اس کی اتنی اہمیت قرار دی جا رہی ہے کہ گویا اگر یہ سزائیں مل گئیں تو نظامِ مصطفی ﷺ کے قیام کا مقصد پورا ہو گیا۔ یعنی وہ تفصیل ہی اتنی بتاتے ہیں۔ جہاں بھی ان کا یہ مطالبہ ہو وہاں یہی ہوتا ہے کہ شرعی نظام نافذ کیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ سزائیں دینی شروع کر دیجیے۔

بس یہ سزائیں دیں' اور انہوں نے سمجھا کہ نظام نافذ ہوگیا۔ دوسری طرف غیر مسلم ہیں۔ ان کے آئے دن اعتراضات ہوتے رہتے ہیں کہ آپ کے ہاں تو اس قدر وحشت ناک سزائیں تجویز کی گئی ہیں جو بقول ان کے کسی عہدِ جاہلیت یا عہدِ بربریت کی یادگار ہیں۔ یہ تھی اس موضوع کی وہ اہمیت جس کے لیے مجھے پہلے دو درس بھی اس پر صرف کرنے پڑے اور آج بھی میں اسی کے متعلق کچھ وضاحت کرونگا۔

اصل میں تو سوال اصولی طور پر یہ آ گیا تھا کہ جرم اور سزا کا باہمی تعلق کیا ہے' قرآن اس سے کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے' اور اس میں ضمناً یہ جنسی تعلقات کے متعلق بات چھڑ گئی تھی کہ یہ صرف دو افراد کے درمیان ایک حادثہ یا واقعہ کا ذکر نہیں ہے۔ آپ نے سابقہ درس میں دیکھ لیا ہوگا کہ اس کا اثر قوموں کے مستقبل پر پڑتا ہے۔ قوموں کے فنا اور بقا کا ایک سبب وہ احتیاط یا بے احتیاطی ہے جو جنسی تعلقات کے بارے میں قوم برت رہی ہے۔ اب آج کے درس میں' میں پہلے بات سزا سے ہی شروع کرتا ہوں' پھر اس کی ذرا تفصیل آگے چل کر بیان کرتا ہوں۔ سزا کے طور پہ **اَلزَّانِیَةُ وَ الزَّانِیْ** کہا گیا ہے۔ یہاں لفظ ہے **جَلْدَةٍ** (24:2)۔ زانی مرد اور زانی عورت' دونوں کو یکساں سزا دو۔

زانی کی یہ سزا زنا بالجبر کے لیے نہیں ہوسکتی

پہلی چیز تو یہی ذہن میں رکھیے کہ جسے ہم زنا بالجبر کہتے ہیں وہ تو اس میں شامل ہی نہیں ہوگا۔ کوئی فعل جس کا کسی سے بالجبر ارتکاب کرایا جائے' وہ تو جرم ہی نہیں ہوتا۔ یہ جو رضامندی سے یہ عمل سرزد ہوگا' یہ **جلدة** اس کے متعلق ہے۔ یہ جلد' جنوں اسی کیندے آناں [1] یہ جسے Skin کہتے ہیں' یہ لفظ وہاں سے ہے۔ ہر جانور کی کھال کو یہ جلد کہتے ہیں۔ یہ لفظ ہمارے ہاں بھی شامل ہے۔ اس لفظ کے معنی میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ چمڑے کا بنا ہوا ایک طمانچہ سا ہوتا تھا اور دوسری چیز اس کے اندر یہ ہے کہ اس کے مارنے کا اثر صرف Skin (جلد) تک رہے' اس سے آگے نہ جائے۔ اس کے اندر یہ دونوں چیزیں آجاتی ہیں۔

مسلمانوں میں میت پر نوحے کی رسم

عرب جاہلیہ کے اندر نوحہ کرنے والی عورتیں ہوتی تھیں۔ یہاں تو اب معلوم نہیں کہ آیا اندرون شہر ابھی تک یہ رسم ہے یا نہیں لیکن ہمارے ہاں پرانے گاؤں کے زمانے میں یا شہروں میں بھی یہ رسم تھی۔ اصل میں ہم نے یہ بہت سی چیزیں ہندوؤں سے لی تھیں۔ ان کے ہاں میت پہ نوحہ کرنے والی آتی تھیں اور پھر ہمارے ہاں مسلمانوں میں بھی یوں نوحے ہوتے تھے۔ اور اس لیے میں خاص طور پہ کہتا ہوں

---

[1] جسے جلد ہم کہتے ہیں۔

کہ ہم راجپوت تو نومسلم تھے۔ ہمارے ہاں بالکل یوں تھا کہ او ''رام'' جانداای جائے گا تے ''رحیم'' اونداای آئے گا۔ ❶ ہمارے ہاں گھروں کے اندراسی نوے فیصد رسومات ہندوانہ چلی آتی تھیں۔ وہ جومیت پہ نوحہ کرتی تھیں' کیندے سن اونوں تے او گالوں کو پیٹتی تھیں ❷: ہائے ہائے شیرا کوئی نہیں تیرا۔ ایویں گیوں پہلے ملے موت داپاٹا۔ یہ ہاتھوں سے طمانچے مارتی تھیں۔ تو انہوں نے اپنے ہاں کچھ چمڑے کا طمانچہ سا بنا رکھا تھا وہ چمڑے سے یوں مارا کرتی تھیں۔ اسے بھی المجلد کہا کرتے تھے یعنی چمڑے کی کوئی چیز جس سے کچھ ایسے مارا جائے۔

کوڑوں کی کیفیت اور حقیقت

یہ جو ''جلدۃ'' کی سزا ہے' اب میں اس کا ترجمہ تو نہیں کرونگا' اس کا ترجمہ ''کوڑے'' کیا جاتا ہے۔ اس سے ہمارے ذہن میں کوڑوں کا تصور آتا ہے جو جیل خانے میں لگتے ہیں۔ اس لحاظ سے لفظ جلدۃ کا ترجمہ کچھ ''کوڑے'' کا سا کرلیا جاتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ دیکھیے کہ یہ کوڑے جو یہاں لگتے ہیں' یہ سزا وہ ''جلدۃ'' کے زمرے میں نہیں آتی۔ اگلے ہی دنوں ایک کو کوڑے ❸ لگے۔ خدا نہ کرے کہ میرے جیسے آدمی کے ساتھ یہ کچھ ہو۔ مجھ جیسا تو شاید دیکھ ہی نہ سکے' بہت رقیق القلب ہوں۔ اس وقت وہ ڈاکٹر تک بھی مجرم کے متعلق یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بڑا سخت جان تھا' اس کی تندرستی بڑی تھی' وہ تو دس کوڑے تک بھی اس طرح کھا سکتا تھا' مگر ہوا یہ کہ وہ پانچ ہی کوڑے کھانے کے بعد بے ہوش ہو گیا۔ گویا وہ ایسے کوڑے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ اتنے تک ہی کھا سکتا ہے۔ یہاں سو کوڑوں کا ذکر ہے۔ اگر یہ جلدۃ وہ سو کوڑے ہوں تو آپ اس کا اندازہ لگا لیجیے پھر تو وہ سو پورا کرنے کے لیے یہی ہے۔ کہ تم نے ایک ہی دفعہ مار دیا۔ کوئی یہ نہیں کر رہا' وہ کرتا یہ ہے کہ ایک دفعہ مارو' پھر زندہ کرو' پھر مارو پھر زندہ کرو تو یوں یہ سو جلدۃ کی یہ سزا ہے۔ یہ کوڑے ہیں' بہر حال یہ وہ سزا تو نہیں ہے جو ''جلدۃ'' کے زمرے میں آتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو سو تک کوئی کھا سکتا ہے۔

---

❶ رام' دیر سے جائے گا اور ''رحیم' دیر سے آئے گا۔

❷ وہ جو موت پہ نوحہ کرتی تھیں' اسے کہتے تھے کہ وہ رخساروں کو پیٹتی تھیں۔

❸ یاد رہے یہ بات اکتوبر 1977 کی 14 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ یہ وہ دور ہے جب جنرل ضیاء الحق (1988-1924) نے 5 جولائی 1977ء کو ملک میں تیسرا مارشل لا لگایا تھا اور کوڑوں کی سزائیں دی جا رہی تھیں۔

قرآن نے دو جرائم کی سزا کوڑے تجویز کی ہے

عزیزانِ من! دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن کریم میں صرف دو جرم ہیں جن کے لیے ''جلدۃ'' کی یہ سزا ہے۔ایک تو یہ زنا کے جرم کی ہے اور دوسرا شریف زادیوں پر تہمت لگانے کی ہے۔زنا میں سو کوڑے ہیں اور تہمت میں اسی (80) ہیں۔ان کے علاوہ قرآن کریم میں کسی اور سزا کے لیے یہ ''جلدۃ'' بھی نہیں ہے۔یہ صرف دو جرائم ہیں۔اس دوسرے جرم کا ذکر بھی ابھی آگے آتا ہے۔یہ اسی سورۃ کی چوتھی ہی آیت میں آیا ہے۔تو یہ ہیں وہ ''جلدۃ'' جو سزا کے لیے ہیں۔قرآن نے زنا کی صرف یہی سزا تجویز کی ہے۔

زنا کے سلسلہ میں رجم کی سزا یہودیوں کی تھی، قرآن کی نہیں ہے

عزیزان من! ہمارے ہاں جو احکام شریعت ہیں، اب ان میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ جو سزا ہے یہ غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا ہے، شادی شدہ کی سزا رجم یا سنگسار کرنا ہے۔قرآن کریم میں اس کا کہیں ذکر نہیں البتہ جرم یا سنگسار کرنے کی یہ سزا یہودیوں کے ہاں ہوتی تھی جسے بعد میں انہوں نے بھی اپنے ہاں منسوخ کر دیا تھا اور پھر اس کی جگہ یہی ''جلدۃ'' تھا۔اب اگر میں کوڑے کہہ دوں تو آپ کا ذہن جیل خانے میں لگنے والے کوڑوں کی طرف چلا جائے گا۔آپ اپنے ذہن میں یہ ''جلدۃ'' ہی رکھیے کہ یہ سزا انہوں نے اپنے ہاں تجویز کر لی تھی۔وہ کوڑے لگاتے تھے اور مجرم کا منہ کالا کر دیتے تھے۔یہ جو منہ کالا کر دینا ہے، یہ وجہ تذلیلِ انسانیت ہے۔قرآن نے منہ کالا کرنے والی جو بات تھی اسے تو حذف کر دیا اور صرف جو کوڑے یا جلدۃ تھی وہی سزا رکھی۔رجم کوئی سزا نہیں رکھی۔

قرآن نے سزا کے سلسلہ میں بھی تکریمِ انسانیت کو ملحوظ رکھا ہے، پھر حرامی بچے کی تذلیل کیوں؟

قرآنِ کریم کی بنیاد یہ ہے کہ یہ انسانیت کی تکریم کو برقرار رکھتا ہے، یہ جرم اور مجرم میں فرق کرتا ہے۔جرم ایک ایسی لغزش ہوتی ہے جس کی سزا ملنی چاہیے لیکن جس سے یہ جرم سرزد ہوتا ہے وہ انسان تو بہرحال رہتا ہی ہے، اس کی انسانیت اس سے نہیں چھن جاتی۔کتنی دور تک یہ بات جاتی ہے کہ تکریمِ انسانیت پہ حرف نہ آنے پائے۔یہیں سے ایک بات ضمناً سامنے آ گئی۔ہمارے ہاں اور میں سمجھتا ہوں شاید ساری ہی دنیا میں یہ یہی ہے۔میں اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے آج خاص طور پہ معذرت خواہ ہوں کہ مسئلہ ایسا سامنے آ گیا ہے، موضوع ایسا آ گیا ہے کہ اس میں بار بار اس چیز کا ذکر آئے گا، وہ ناگزیر ہے لیکن معذرت ضروری ہے۔میں بیٹیوں اور بہنوں کے سامنے یہ الفاظ بھی نہیں دہرایا کرتا۔وہ بات یہ ہے کہ عام طور پہ جسے حرامی بچہ کہا جاتا ہے، جسے ''ولدُ الزنا'' بھی کہا جاتا ہے، وہ حرامی بچہ ساری عمر معاشرے کے اندر ذلیل وخوار رہتا ہے، نہایت قابلِ نفرت رہتا ہے۔اس کے متعلق کبھی کسی نے سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ اس کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے جو ساری عمر اسے ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس بچے کے تو اپنے اختیار میں نہیں ہوتا کہ وہ منکوحہ میاں بیوی کے

اختلاط کی وجہ سے پیدا ہو یا اس قسم کے اختلاط کی بنا پہ پیدا ہو۔ اس کا تو اس میں کوئی اختیار ہی نہیں ہوتا۔ جرم تو انہوں نے کیا تھا' اس نے کیا جرم کیا ہے؟ وہ ساری عمر کتنا ہی نیک شریف پاکبار زندگی کیوں نہ بسر کرے لیکن یہ بات کہ صاحب! حرامی بچہ ہے بس اتنی سی چیز اس کے ڈبو دینے کے لیے کافی ہے:

ایں طرفا تماشہ بیں ناکردہ گناہ گار

کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ اس نے کیا گناہ کیا ہے' اس نے کیا جرم کیا ہے؟ اور پھر ہر جرم کے بعد اگر کوئی توبہ کرتا ہے' معافی ملتی ہے تو جرم دھل جاتا ہے مگر اس ناکردہ گناہگار کا جرم وہ ہے جو دھل ہی نہیں سکتا۔ یعنی اب وہ کیا توبہ کرے گا۔ وہ جو تصور عیسائیت تھا کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ' اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کا بوجھ' اپنی پشت پہ لے کر پیدا ہوتا ہے' ساری عمر وہ داغ دھل نہیں سکتا۔ انہوں نے اس میں پھر بھی ایک شکل نکال لی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے کفارے پہ ایمان لے آئے تو وہ اوّلین گناہ (Original Sin) دھل سکتا ہے ورنہ نہیں دھلتا یعنی وہ جو گناہوں کا بوجھ لے کر آیا ہے وہ اس کا جرم وقصور نہیں ہے' اولیں ماں باپ نے کوئی گناہ کیا' اس کا دھبہ وہ لے کر آ رہا ہے اور مٹ نہیں سکتا بعینہٖ یہ تصور ہے جو آپ اس قسم کے بچے کے متعلق ذہن میں رکھتے ہیں کہ اس کے ماں باپ نے ایک گناہ کیا' جرم کیا' اس جرم کا داغ لے کر' بقول ہمارے' یہ پیدا ہوا اور یہ عیسائیت کے اس تصور کی طرح ساری عمر مٹ ہی نہیں سکتا' اس بیچارے کے لیے کتنی قیامت ہے۔ عزیزانِ من! وہ ایک انسان کے بچے کو' جس نے خود کوئی غلطی اور جرم یا قصور نہیں کیا' اس کو معاشرے میں اس قدر قابلِ نفرت اور قابلِ ذلت تصور کیا جائے اور اس کے لیے گنجائش نہیں کہ وہ اپنے اس داغ کو دھو سکے۔

اس سلسلہ میں حضور ﷺ کی ایک چمکتی ہوئی حدیث

یہاں سے بات یاد آ گئی اور نظر آ گیا کہ جسے ہم حضور رحمۃ للعلمین ﷺ کہتے ہیں ان کی نگاہ رحمت و کرم کہاں تک جاتی تھی! صاحب! ایک حدیث ہے جو عام طور پہ مشہور نہیں ہے لیکن میں نے جب اس پہ نگاہ ڈالی تو اس کے اندر مجھے تو چمکتا ہوا وہ ہیرا نظر آیا۔ صاحب! وہ حدیث یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ قیامت میں لوگ اپنی ماؤں کے نام سے پکارے جائیں گے۔ کیا بات ہے اس رحمۃ للعلمین ﷺ کی! کہاں تک نگاہ گئی ہے! باپ کے نام سے پکارنے میں درمیان میں یہ بات آ جاتی تھی' ماں کے نام سے پکارنے سے کوئی ایسی بات نہیں آتی۔ تکریمِ انسانیت کی کہاں تک رعایت رکھی گئی ہے کہ محشر کے میدان میں بھی کوئی شخص اس وجہ سے' وہاں بدنام نہ ہو کہ وہ باپ ایسا تھا کہ جس کی یہ اولاد ہے۔ ماں کے متعلق تو شبہ ہی نہیں' وہ ایک ہی ماں ہوتی ہے' اس کی ماں کے نام سے یہ پکار لیے جائیں۔

ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہودیوں نے اپنے ہاں اس جرم کی سزا میں کوڑے بھی رکھے تھے اور وہ منہ کالا کرتے تھے۔ قرآن نے منہ کالا کرنے والی بات تو سزا میں سے اڑا دی کہ یہ وجہ تذلیل انسانیت ہے لیکن تمدنی زندگی میں' سوسائٹی کی زندگی کے اندر' جرم کی سزا ضروری

ہے اور وہ جیسا میں نے ابھی کہا ہے' سوکوڑے ہے۔ ''جلدۃ'' دراصل چمڑے کا ایک طمانچہ سا بنایا ہوا ہوتا تھا۔ اس میں بھی ایک شرط ہوتی تھی کہ اس کے اندر کہیں گرہ نہ ہو۔ وہ سپاٹ سا ہوتا ہے۔ اب سوچ لیجیے کہ وہ کیا ہوتا ہوگا کہ اس سے سو درے کھا کر بھی وہ اسے زندہ رکھتے تھے۔ یہ اس کے لیے ہے۔ قرآن نے اس کے لیے قتل کی سزا نہیں دی۔

ہمارے ہاں یہ سزائیں آئیں کہاں سے؟

میں نے عرض کیا ہے کہ گو ہمارے ہاں یہ سزا نہیں ہے ''شریعت'' میں یہ ہے کہ اگر شادی شدہ ہوں تو انہیں رجم یا سنگسار کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں سنگسار کرنے کی یہ سزا کہیں بھی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ اب مجھے معاف فرمائیے گا مجھے ذرا اور وضاحت میں جانا پڑا ہے کہ یہ سزائیں ہمارے ہاں کہاں سے آ رہی ہیں اور کیسے یہ چلی جا رہی ہیں؟

کہا یہ گیا کہ صاحب! اسلام دینِ فطرت ہے۔ بہت اچھا جی' مگر کوئی یہ نہیں بتاتا کہ یہ کس طرح دینِ فطرت ہے؟ بخاری شریف تو آپ جانتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہماری احادیث کی کتابوں میں یہ اصح الکتب ہے۔ پہلے تو چھ کتابیں [1] الگ کر لی گئی ہیں۔ انہیں صحاح ستہ کہتے ہیں یعنی احادیث کی چھ صحیح ترین کتابیں۔ ان میں سے سب سے سرِ فہرست صحیح بخاری کو کہا جاتا ہے۔ صحیح بخاری میں یہ ایک روایت ہے: حضرت عمر بن محمود رضی اللہ عنہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں یعنی قبل از اسلام میں' میری بیٹیاں معاف رکھیں' جنگل میں دیکھا کہ ایک زانی بندر کو سنگسار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی اس کو پتھر مارے تھے۔ تو گویا یہ فطرت کے مطابق تھا کہ بندر یا حیوان جرمِ زنا کا مرتکب ہو۔ اس روایت میں مروی ہے کہ کچھ بندر اسے سنگسار کر کے اس کے جرم کی سزا دے رہے تھے۔ میں بیٹیوں کی وجہ سے اتنی ہی حد تک محدود رہنا چاہتا ہوں ورنہ ایک تو یہ کتابیں ہیں اور دوسرا ہمارے ہاں حدیث کی ان کتابوں کی تشریح ہے جیسے قرآن کی تفسیر ہوتی ہے۔ گویا ان کی تفسیر بھی آ گئی ہے۔ یہ جو روایت ہے وہ تو اتنی سی ہے۔ اس تفسیر میں جو اس کی تفصیلات اور باریکیاں دی ہوئی ہیں' انہیں میں اس محفل میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ امام ابن حجر ہیں۔ ان کی کتاب فتح الباری ہے جو صحیح بخاری کی شرح ہے۔ اس کے اندر بڑے ہی طول طویل طریق سے' بڑی لذت لے لے کر اس کی تفصیلات بیان کی ہوئی ہیں۔ اب آپ نے یہ دیکھ لیا کہ رجم کی سزا کے سلسلہ میں یہ سند کہاں سے ملی۔ آپ کہیں گے کہ صاحب! یہ تو بہرحال انہوں نے عہد جاہلیہ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے تو اس کے لیے ہمارے ہاں سند کیسے آ گئی؟ سند بھی موجود ہے۔

---

[1] ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 215-200۔

قرآن کو مرتب کرنے کے لیے خود قرآن کی شہادت

ان روایات کی رو سے قرآن کریم کی اہمیت وعظمت کو کم کرنے کے لیے' نگاہوں سے گرانے کے لیے' آپ کو معلوم نہیں کہ کتنی ہی روایات ہیں۔ان کی بنیاد اس پہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس قرآن کریم کو خود اس مرتب شکل میں' کتاب کی شکل میں' جمع کر کے دے کر ہی نہیں گئے تھے۔ چلیے تو پھر یہ کس شکل میں تھا؟ اس کتاب عظیم کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی ہے ❶ (15:9)۔رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (5:67) جو تمہیں دیا جاتا ہے اسے ان تک پہنچاؤ۔قرآن کریم میں یہ بات تحریر ہے کہ یہ نہایت معزز ❷ کاتب ہیں جو اسے لکھتے ہیں (80:13-16)۔خود ہمارے ہاں کی انہی روایات میں ہے کہ چھبیس (26) کاتب تھے جو وحی کو لکھتے تھے۔ان کے تو نام بھی روایات میں موجود ہیں اور یہ بھی روایت موجود ہے کہ مسجد نبوی میں ایک بہت بڑی مستند کاپی (Master Copy) ایک ستون کے قریب صندوق میں رکھی رہتی تھی۔ یہ وہ نسخہ تھا جس میں نبی اکرم ﷺ سب سے پہلے وحی یعنی قرآن کریم کو لکھواتے تھے۔قرآن میں ہے کہ یہ ہرن کی کھال کے اوپر لکھا جاتا تھا۔ ❸ اس زمانے میں یہی کاغذ مضبوط ترین ہوتا تھا۔اب بھی ہمارے ہاں جو پرانی دستاویزات لکھی جاتی ہیں' وہ ایک قسم کا گرے سا کاغذ' کھال سا ہوتا ہے تو یہ جو ہرن کی کھال کی چھیل تھی وہ کاغذ بنایا کرتے تھے جو مضبوط ہو اور کبھی ضائع نہ ہو سکے۔قرآن میں یہ ہے کہ یہ رق کے اوپر لکھا ہوا محفوظ صحیفہ ہے۔چھبیس چھبیس کاتب اس کے لکھنے والے تھے۔آپ قرآن میں یہ کہتے رہے۔تو ہوا کرے لیکن ہمارا کہنا یہی ہے کہ نہیں' رسول اللہ ﷺ تو اس کو ایسے ہی چھوڑ گئے تھے' کسی کاتب نے اپنے ہاں کھجور کے پتے پہ لکھ لیا ہے' کسی نے اونٹ کے شانے کی ہڈی پہ لکھ لیا' کسی نے ایک پتھر کے ٹکڑے پہ لکھ لیا' کسی نے تختی پہ کوئی حصہ لکھ لیا' بکھرا ہوا ہے:

---

❶ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) ہم نے اس ضابطہ حیات کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔یہ اس قسم کی حفاظت ہے کہ کوئی غیر خداوندی بات اس کے قریب تک نہ پھٹک سکے: لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (41:42) باطل اس کے آگے یا پیچھے کہیں سے بھی' اس کے پاس نہیں آ سکے گا۔

❷ فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ کِرَامٍ بَرَرَةٍ (80:13-16) (یہ وحی) ایسے صحیفوں میں محفوظ کر دی جاتی ہے جو نہایت واجب العزت ہیں۔یہ رفیع الشان اور ہر قسم کی غلطیوں اور آمیزش سے پاک اور صاف' ایسے کاتبوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی' جو معاشرہ میں بڑی ہی عزت وتعظیم کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

❸ کِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (52:2-3) پھیلے ہوئے رق پر لکھی ہوئی کتاب۔حفاظت کی غرض سے اسے عام طور پر ان اوراق پر لکھا جاتا تھا جو اس زمانے کے رواج کے مطابق باریک کھال (رق) سے بنائے جاتے تھے۔(پرویز: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1996 ص۔138)

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

بقول ان کے یہ کہیں مدون شکل میں نہیں تھا' تو حضور ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا۔ آپ اندازہ لگائیے کہ یہ قرآنِ کریم مملکت کا آئین ہے' پوری امت کا دستور (Constitution) ہے' خدا اس کی حفاظت کا ذمہ لے رہا ہے' رسول اللہ ﷺ اس کتاب کو دینے کے لیے مامور ہوئے تھے اور یہ وہ چیز ہے کہ جس کا الحمد کے بعد جو قرآن شریف کی پہلی سورۃ شروع ہوتی ہے' جس میں کہا ہے کہ وہ Book (کتاب) ہے کہ جس کی یہ خصوصیات ہیں۔ یہ پہلی سطر میں پہلا لفظ لکھا ہوا ہے' اس کے متعلق لکھا ہوا ہے' مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں' یہ Book (کتاب) کی شکل میں تھا ہی نہیں' تو پھر خیال آیا کہ اس کو اکھٹا کرو' ادھر سے کسی کو بلایا' کسی کو اُدھر سے بلایا' کوئی ہڈیاں لے کر آ گیا' کوئی اپنا پتھر لے کر آ گیا' اور وہ بیٹھے جوڑ رہے ہیں اور قرآن مدون ہو رہا ہے۔ جب یہ مدون ہو گیا تو انہوں نے یہ کہا کہ صاحب! اس میں دو آیات تھیں' ایک وہ آیت ہے جو بچے کا ماں کے ساتھ دودھ پینے کے متعلق ہے اور جو اس وقت زیرِ نظر بحث نہیں اور دوسری وہ آیت ہے جو رجم کی سزا کے متعلق ہے۔ وہ اس قرآن کریم میں نہیں ہے۔ لہٰذا سنیے! کہ پھر روایتیں کیسے بنتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! قرآن شریف میں یہ دو آیات ہم رسول اللہ کے زمانے میں پڑھا کرتے تھے' وہ اس قرآن میں نہیں ہیں جو جمع کیا گیا ہے۔ اس کمیٹی سے پوچھا گیا۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! ہم نے بہتیری ڈھنڈیا پیٹی تھی۔ اب یہ دو آیتیں کہیں سے نہیں آئیں تو ہم کیا کریں۔ یہ جمع کرنے والے بھی صحابی رضی اللہ عنہ اور وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے قریب ترین زمانے کے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم انہیں پڑھا کرتے تھے' یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو معلوم نہیں ہیں' ہمیں کیا پتہ۔ عمر بھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے۔ اُس زمانے میں قرآن ہی قرآن تھا۔ اس کا اتنا چرچا ہوا کرتا تھا مگر یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو پتہ نہیں۔ او بھئی! ڈھونڈو کہیں سے کیونکہ کہنے والے تو بڑے معتبر تھے۔ ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45AD) بھی تھے یعنی ایسے صحابی رضی اللہ عنہ کہ جی ٹھیک ہے ہم تو پڑھا کرتے تھے۔ یہ اس روایات میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم رجم کیا بھی کرتے تھے۔ یا اللہ! کیا ہوا اس آیت کو! اب ڈھونڈ رہے ہیں' تلاش ہو رہی ہے۔

روایات کے سلسلہ میں شیعہ حضرات کی کتابیں الگ ہیں

عزیزانِ من! یہ کہیں کوئی تاریخ کا افسانہ نہیں ہے جو میں عرض کر رہا ہوں۔ یہ خود بنیادی روایات میں ہے۔ یہ ان میں ہے جو صحاح ستہ میں نے بیان کی ہیں یعنی سنی حضرات کے ہاں حدیث کی چھ معتبر ترین کتابیں۔ یاد رکھیے گا' شیعہ حضرات کی اپنی الگ کتب احادیث ہیں۔ یہ سنی حضرات کی ہیں۔ ان میں سنن ابن ماجہ کی حدیث کی کتاب کے اندر ہے کہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے انہوں نے کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جائیے کیونکہ حضور ﷺ تو وہاں قیام کرتے تھے اور وہیں حضور ﷺ کی وفات ہوئی تھی۔ ان سے پوچھیں۔ ان سے جا کر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہاں بیٹا! یہ دونوں آیتیں تھیں۔ انہوں نے کہا کہ پھر وہ ہمیں دیدیجیے۔ پھر سن لیجیے معاذ اللہ یہ کوئی افسانہ

نہیں ہے۔ کہیں حدیث کی کتاب کی روایت ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ بیٹا! یہ کھجور کے پتوں کے اوپر لکھی ہوئی تھی اور وہ جو کھجور کے پتے تھے وہ اندر کمرے میں کہیں پلنگ کے پائنتی یا سہارے رکھے ہوئے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو ہم اہل خانہ تو اس افراتفری میں، پریشانی میں، مصروف ہو گئے، ہوش ہی نہیں رہا۔ صحن میں میری بکری بندھی ہوئی تھی اس نے جو شور سنا تو رسی تڑا کر بھاگ کے اندر چلی گئی اور وہ اس پتے کو کھا گئی۔ اب ان آیات کو ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر یعنی اب دنیا میں کہیں ان آیتوں کا وجود نہیں ہے، وہ ایک ہی پتے پہ لکھی ہوئی تھیں اور اہمیت خود رسول اللہ ﷺ کے گھرانے میں بھی قرآن کی آیتوں کی یہ تھی کہ وہ لکھی ہوئی ہیں تو وہ کہیں وہاں رکھی ہوئی ہیں اور بکری جاتی ہے، وہ انہیں کھا جاتی ہے اور اس طرح وہ آیتیں کم ہو گئیں۔

رجم کی آیت قرآن میں شامل تو نہیں کی گئی مگر عمل اس کے مطابق ہو رہا ہے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45AD) کو لوگوں نے کہا۔ پہلے بھی کہا اور ان کے زمانہ خلافت (634-644/45AD) میں بھی کہا کہ اب تو اقتدار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن کریم کی وہ دو آیات جو آپ کہتے ہیں کہ ہم قرآن میں پڑھا کرتے تھے، ان پہ عمل ہوتا تھا، اگر وہ اس طرح نہیں تو اتنے معتبر ہیں، شاہد ہیں، انہیں قرآن میں داخل کر دیجیے۔ کہنے لگے کہ میں ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے جی! صاحب! عمر نے بھی قرآن میں اضافہ کر دیا۔ ڈرتا ہوں یاد رہے، یہ اضافہ کر دیا۔ کہنے لگے کہ پھر ہوگا کیا، خدا کا حکم ہے یہ کوئی آیت ایسی نہیں ہے کہ یونہی حقائق سے متعلق ہو کہ اچھا! ارے اتنا بڑا حکم ہے خدا کا، وہ گم ہو رہا ہے، دوسری جگہ قرآن میں کہیں ہے نہیں، وہ آیت کسی جگہ موجود نہیں ہے تو اب کیا کریں؟ انہوں نے فرمایا یعنی ان کی روایتوں کے مطابق انہوں نے فرمایا کہ آپ ایسا کریں کہ قرآن میں اسے داخل تو نہ کریں لیکن عمل اس کے اوپر ہو تو خدا کا منشاء یہی تھا کہ اس کے مطابق عمل ہو تو ٹھیک ہے، عمل کر لیجیے جناب! چنانچہ یہ آیات قرآن کے اندر نہیں ہیں عمل ان کے اوپر ہے۔

کیا قرآن کی پانچ سو آیات منسوخ ہیں؟

کیا آپ کو معلوم ہے کہ موجودہ قرآن کی جو شکل ہے، اس کے متعلق عقائد کیا ہیں؟ اس قرآن کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں، قریباً پانچ سو کے قریب گناتے ہیں، کہ اتنی سی کتاب میں پانچ سو کے قریب آیات ایسی ہیں جو پڑھی جاتی ہیں لیکن ان کے اوپر عمل منسوخ ہے، یہ قرآن میں لکھا ہوا نہیں ہے کہ اس آیت کا عمل منسوخ ہے، نہ یہ انہوں نے فیصلہ کیا ہوا ہے۔ خدا نے اپنی کتاب کے اندر وہ حکم دیا ہوا ہے، اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہوا ہے اور بعد میں ان علماء حضرات نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ منسوخ ہے۔ وہ منسوخ ہے تو بے شمار آیات جو ہیں وہ ابتدا میں جو گنی تھیں، قریباً پانچ سو بنتی تھیں، کہ پڑھی جاتی ہیں۔ کیوں بھئی! پڑھی پھر کیوں جاتی ہیں؟ انہوں نے کہا

کہ ان کی تلاوت سے ثواب ہوتا ہے اور کچھ ایسی آیات ہیں کہ جو قرآن کے اندر تو نہیں ہیں لیکن ان کا حکم جاری ہے! کیا بات ہے اس کتاب کی جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے!! عزیزان من! مجھے تو نہ ان لوگوں سے کچھ کہنا ہے جنہوں نے یہ ساری روایات خود وضع کیں اور ان افسانوں کو لٹریچر میں شامل کر دیا۔ ان کے سامنے ایک سازش تھی' ایک اسکیم تھی۔ اس کے تحت انہوں نے یہ سب کچھ کیا۔ انہیں تو میں کچھ نہیں کہہ رہا' میں پوچھتا یہ ہوں کہ اس تیرہ سو سال کے اندر مسلسل اور متواتر یہ ساری چیزیں آپ کے ہاں آئمہ کرام' علمائے عظام اتنے اتنے مفسر' اتنے بڑے بڑے محدث آئے اور یہ ساری امت مسلسل چلی آ رہی ہے' یہ سب ان کتابوں کو جن میں یہ سب کچھ موجود ہے' سینے سے لگائے لگائے چلے آ رہے ہیں اور جس نے بھی کبھی ان کے خلاف آواز اٹھائی' اسے پھانسی پہ چڑھا دیا۔

قرآن کے خلاف سازشیں

بہرحال' عزیزان من! میں کہا کرتا ہوں کہ میں تو اب زندگی کے آخری دور میں ہوں۔ آپ احباب میری ان چیزوں کے شاہد ہیں۔ میرا ایمان یہ ہے کہ یہ کتاب عظیم ہے' اس کا ہر حرف اور لفظ جس طرح اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو دیا' حضور ﷺ نے اسی طرح محفوظ مکتوب کتاب کی شکل میں امت کو دیا اور آج ہمارے ہاتھ میں یہ اسی شکل کے اندر موجود ہے' اس میں ایک حرف کا تغیر اور تبدل تسلیم کرنا خدا کے اس وعدے کو جھٹلانا ہے جو اس نے کہا ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ میرا ایمان یہ ہے۔ جو کچھ اس کے خلاف ہے وہ انسانوں کا وضع کردہ ہے' سازشیں ہیں۔ مجھے اس سے پرواہ نہیں کس نے کیا اور کس نے نہیں کیا لیکن میں انہیں قرآن کے خلاف گہری سازشیں کہا کرتا ہوں۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم اور اس کا نظام دنیا میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دے گا

بہرحال دین کو' قرآن کو' اور رسول اللہ ﷺ کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں کیا عرض کروں کہ ہم پہ کیا بیتی ہے' ہم پہ کیا گزری ہے۔ یہ کتاب عظیم دنیا میں ایک بہت بڑا انقلاب ہے' یہ مفاد پرست گروہوں کے خلاف ہے' ان گروہوں کی طرف سے خاص سازش تھی کہ اس کو کسی طرح ختم ہی کر دیا جائے۔ اب یہ جو' جس شکل میں یہ یوں ہے' یوں ختم کر دینا' اس کا مٹا دینا' ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اسے فزیکل شکل میں' کتاب کی شکل میں' آپ کے پاس رہنے دیا لیکن انہوں نے اس کا جو بھی اثر' نتیجہ یا مقصد تھا' وہ سارا ختم کر کے رکھ دیا ہے۔

قرآنِ حکیم کے متعلق مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خطرناک بیان

یہ اس کتاب کے متعلق عقائد ہیں اور یہ سلسلہ کوئی پرانے زمانے کا نہیں۔ میرے تو کلیجے میں ناسور ہیں' عزیزان من! زخم بھی نہیں۔

یہ رستے رستے ناسور بن گئے ہیں۔ ابھی حال میں ہمارے ہاں مودودی صاحب ❶ کا یہ بیان آیا ہے جسے طلوع اسلام میں بھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ انہوں نے کہا ہے کہ قرآن کریم سات زبانوں میں نازل ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سات زبانوں میں نازل کیا' رسول اللہ ﷺ نے اسے سات زبانوں میں امت کو دیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (573-656AD) کے زمانے (645-656AD) تک یہ قرآن سات زبانوں میں موجود تھا۔ انہوں نے اپنی مرضی سے ان میں سے چھ زبانوں کے قرآنوں کو جلا دیا اور صرف اپنی مرضی سے ایک قرآن کو باقی رکھا حالانکہ اس کے لیے نہ خدا نے حکم دیا تھا' نہ رسول نے حکم دیا تھا۔ یہ جسے آپ (معاذ اللہ) قرآن کہہ کر لیے پھرتے ہیں اس کی تو یہ پوزیشن ہے۔ ❷ ہاں' عزیزان من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ رجم کی سزا قرآن میں نہیں ہے۔

---

❶ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979)

❷ قرآن کریم کے خلاف کی جانے والی ان تمام سازشوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورہ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 242-221۔

ان سازشوں کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو یہ (قرآن) **بعینہٖ** اس شکل اور ترتیب میں' جس میں یہ اس وقت ہمارے پاس ہے' لاکھوں مسلمانوں کے پاس موجود' اور ہزاروں سینوں میں محفوظ تھا۔ اس کی مستند کاپی (Mater Copy) مسجد نبوی ﷺ میں ایک ستون کے قریب ایک صندوق میں رکھی رہتی تھی۔ یہ وہ نسخہ تھا جس میں نبی اکرم ﷺ سب سے پہلے وحی کو لکھوایا کرتے تھے۔ اسے امام یا ام کہتے تھے اور اس ستون کو جس کے قریب یہ نسخہ رہتا تھا ''اسطوانہ مصحف'' کہا جاتا تھا۔ اسی ستون کے پاس بیٹھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم ﷺ کی زیر نگرانی' اس مصحف سے اپنے اپنے مصاحف نقل کیا کرتے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت اس قدر عام ہو چکی تھی کہ جب نبی اکرم ﷺ نے اپنے آخری حج (حجۃ الوادع) کے خطبہ میں' لاکھوں نفوس کو مخاطب کر کے پوچھا: کیا میں نے تم تک خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے' تو چاروں طرف سے یہ آواز گونج اٹھی کہ ہاں' آپ نے اسے پہنچا دیا ہے۔ یہی تھی وہ کتاب' جس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے ''آخری لمحات میں'' دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں فرمایا تھا کہ ''حسبنا کتاب اللہ'' ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے.....

عربی زبان میں ''کتاب'' تو کہتے ہی اسے ہیں جو مرتب شکل میں موجود ہو.....امام ابن حزم نے لکھا کہ خلیفہ اول کے زمانہ میں کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں لوگوں کے پاس بکثرت قرآن کریم کے نسخے نہ ہوں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں' مسلمانوں کے پاس اس کتابِ عظیم کے لکھے ہوئے نسخے ایک لاکھ سے کم نہ تھے۔ (حوالہ: کتاب الفصل' الملل والنحل)۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں جو سات (یا بعض روایات کے مطابق آٹھ) مستند اور مصدقہ نسخے مرتب کرائے تھے اور ان میں سے ایک مدینہ میں رکھ کر باقی مختلف شہروں میں بھیجے تھے' ان کی تفصیل کتب تاریخ میں ملتی ہے.....حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جو ''جامع القرآن'' کہا جاتا ہے' تو یہ صحیح نہیں ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ جامع القرآن نہیں تھے۔ دیگر خلفاء کی طرح ناشر قرآن ہی تھے۔ انہوں نے البتہ اس کا اہتمام ضرور کیا تھا کہ کہیں کوئی ایسا نسخہ نہ ہے جو ان مستند اور مصدقہ نسخوں کے مطابق نہ ہو.....(پرویزؒ: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور' 1966' ص ص 141-140)

قرآن نے ماحول اور افراد کی نفسیاتی تربیت کے مطابق سزا کا تعین کیا ہے

میں کہا کرتا ہوں کہ مذہب میں پہنچ کر عقل کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ سوچیے کہ اسی قرآن میں ہے جو میں آگے چل کر بیان کرونگا کہ قرآن سزا دینے میں ماحول' افراد کی نفسیات اور ان کی تربیت کا کتنا لحاظ کرتا ہے۔ قرآن میں یہ چیز ہے کہ یہ سزا ان شریف زادیوں کے لیے ہے جن کی اچھے گھرانوں میں تربیت ہوئی ہو جنہیں ہمارے ہاں مہذب گھرانے کہا کرتے ہیں' قرآن ان کو محصنات کہا کرتا ہے۔ اس نزول قرآن کے زمانے میں عربوں کے ہاں گھروں کے اندر یہ لونڈیاں ہوتی تھیں جنہیں اب تو آپ ملازمہ بھی کہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں ہوتی تھیں جو ان لونڈی کی کیفیت ہوتی ہے یعنی نہ اس کی تعلیم ہوتی تھی نہ تربیت۔ وہ کچھ نہیں ہوتی تھی۔ قرآن نے ان شریف زادیوں اور لونڈیوں دونوں میں فرق کیا ہے اور کہا یہ ہے کہ چونکہ ان لونڈیوں کی تعلیم و تربیت نہیں ہوئی ہوتی تھی ان کو زیادہ احساس نہیں ہوتا تھا اس لیے قرآن میں یہ ہے کہ ان کی سزا شریف بیویوں کی سزا سے آدھی ہے۔

ان حضرات سے کوئی شخص پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا

ہزار سال سے کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اگر شریف زادیوں کی سزا یہ ہے تو لونڈیوں کو اس کی آدھی سزا کہاں دی جائے گی یعنی ادھا حصہ اوناں دے پتھر مارے جان گے' دوئے پاسے نہیں مارے جان گے ❶۔ تو رجم کی آدھی سزا کیسے ہوگی؟ وہ گنتی کے سو دروں کی تو آدھی یعنی پچاس درے ہوگئی یہ جو رجم ہے' سنگسار کرنا ہے آدھا آدھا گاڑ کے زمین میں پتھر مار مار کے مارنا ہے' اس کی آدھی سزا کیا ہوگی؟ اب یہ کس کو جرأت ہے کہ ان سے یہ پوچھے۔ ان سے پوچھے تو کفر کا فتویٰ لگے۔ بہر حال قرآن میں کوڑوں کی یہ سزا' جلدۃ کی سزا ہے۔

زنا کے بارے میں فقہ کا قانون

اب ہمارے ہاں سزا تو یہ ہے۔ آپ اس کا کیا کریں۔ آگے فقہ آتی ہے۔ پھر بیٹیوں سے معافی چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں فقہ میں شرط یہ ہے کہ یہ جو اختلاط کا' زنا کا عمل ہے' اس کے لیے چار عینی گواہ ہونے چاہیں۔ سنیے' عزیزا من! کہنے لگا: اوئے کی قیمت ہے ایہدی؟ کہنے لگا: سو روپیہ۔ کہنے لگا: اوئے اینی سو روپیہ قیمت! کہنے لگا: ایویں ڈرنا؟ ساڈیاں چھوٹاں نوں وی تے تک نا ❷۔ کہا: ڈرنے کی کیا بات

---

❶ یعنی ان کے آدھے حصے پہ' ایک طرف پتھر مارے جائیں گے دوسرے آدھے حصے پہ نہیں۔

❷ کہنے لگا: ارے' اس کی کیا قیمت ہے؟ جواب دیا: سو روپیہ۔ کہنے لگا: ارے! اتنی زیادہ قیمت! جواب میں کہا کہ کیوں ڈرتے ہو؟ ہماری رعایت (Concession) پر بھی تو نظر کرو۔

ہے۔ ذرا دیکھیے تو سہی، شرط کیا عائد ہوئی ہے: چار عینی گواہ، شاہد Eye witnesses کبھی آج تک کسی صورت میں بھی یہ جو شرط ہے یہ پوری ہو سکتی ہے؟ عزیزان من! میں فقہ میں کبھی نہیں جایا کرتا۔ یہاں تو بڑی عجیب عجیب شرائط ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر دارالحرب کے اندر کوئی شخص اس طرح سے اس فعل کا ارتکاب کرے اور اس کے بعد وہ باب السلام کی طرف آ جائے تو پھر یہ جرم نہیں ہوتا یعنی جیہڑی لکیر ہیگی ہے نا اونوں ٹپ کے پرلے کھیت اچ اے کچھ ہووے تے اوہدے بعد فیر کوڈی کوڈی کردا ایدر آ جاوے تے فیر جرم کوئی نہیں ❶۔ عزیزان من! میں تو یہ کچھ بتانے کے لیے یہ عرض کر رہا ہوں کہ آپ دیکھیے کہ جسے ہم کہتے ہیں کہ یہاں اسلامی نظام وغیرہ نافذ ہوگا تو یہ ہے وہ فقہ جس کے احکام نافذ ہوں گے۔

مولانا مودودیؒ کی نظر میں زنا کی متعلق بوڑھے شخص کی سزا

اگر مواقع مل جائیں، جرم بھی ثابت ہو جائے تو اس پہ بھی دل پسیج جاتا ہے، سو کوڑوں پر تو دل میں رحم آ جاتا ہے کیونکہ اب یہاں کے یہ کوڑے یوں سمجھے گئے جیسے یہ بیت مارنا (Canning) ہیں۔ مودودی صاحب سے پوچھا گیا کہ یہ تو بڑی سخت سزا ہے۔ آپ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اگر بوڑھا ہو، کمزور ہو، سمجھا جائے کہ برداشت نہیں کر سکے گا تو یہ نہیں ہوگا کہ اس کو معاف کر دیا جائے، نہیں۔ کہنے لگے کہ قانون قانون ہے، اس کا تقاضا پورا کرنا ہوگا۔ صاحب! پھر کیسے کرنا ہوگا؟ کہنے لگے کہ ایک جھاڑو لو۔ اس میں تنکے باندھ لو یعنی سو تنکوں کا جھاڑو بنا لو۔ پھر اسے یوں ایک دفعہ چھوا دو۔ جرم کا تقاضا پورا ہو گیا۔ یہ کچھ تفسیر میں لکھا ہے، عزیزان من! زبانی کلامی کوئی بات مجلس کی نہیں ہوئی۔ وہ تفسیر میں لکھا ہے جس کے ترجمے باقی زبانوں کے اندر ہو رہے ہیں۔ آپ کے اس اسلام کے متعلق باقی قومیں کیا کہیں گی! آیت کے باقی الفاظ پورے کر لوں تو پھر میں آگے بتاؤں گا کہ قرآن کی سزائیں کن شرائط سے مشروط ہیں، کس ماحول میں دی جاتی ہیں؟ میں پوری آیت پڑھ لوں۔ آپ شاید پنجابی نہیں سمجھیں گے لیکن میری دشواری یہ ہے کہ اوتوں بغیر گل نئیں ہوندی۔ پنڈاں وچ ساڈے ہل وہون والے جیہڑے ہوندے نیں، تے اوکیندے نیں: تھوڑی جی دھوں کڈ لے ایہدی بول دی۔ ❷ یہ کوئی نہیں سمجھے گا کہ یہ بات کیا ہوئی ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ بیل کے کندھے پہ جوا ہوتا ہے۔ وہ یہاں دیا ہوتا ہے۔ بیل کے مسلسل چلنے سے اس کے اندر بڑی

---

❶ جو خطِ امتیاز ہے، اسے پار کر کے دوسرے کھیت میں یہ کچھ ہو جائے اور پھر کبڈی کبڈی کرتے ہوئے واپس اپنے کھیت میں آ جائے تو یہ کوئی جرم نہیں ہے۔

❷ اس کے بغیر بات پوری نہیں ہوتی۔ دیہاتوں میں جو ہل چلانے والے ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں: اس بیل کو ذرا روک کر اس کا جوا تار دو، تاکہ اس کے کندھے پر سے وہ گرمی نکل جائے اور وہ کام کے لیے ذرا تر و تازہ ہو جائے۔

ہیٹ (گری) پیدا ہو جاتی ہے۔ ذرا سا اس بیل کو روک کر اس جوے کو ذرا سا اونچا کرتے ہیں۔ دھوں دے معنی ہوندے ہیگے نیں: دھوں کے لے جاندا اے پیا۔ اوتے اوکیندے نیں تھوڑی جی دھوں کڈالے ایہدی یعنی کھلار کے' تھوڑا جیا جوا اتار۔ اے شیخ صاحب ❶' دھوں کڈادیندے نیں میری ایس طراں نال ❷۔

زانی کو نرمی کے ساتھ بیت مارنے کی وضاحت

عزیزان من! وہ آیت یوں ہے **فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا مِائَةَ جَلۡدَةٍ ۖ وَّ لَا تَاۡخُذۡكُمۡ بِهِمَا رَاۡفَةٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ** (24:2)۔ اس آیت کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ پھر ہر ایک کو سو سو کوڑوں کی یہ سزا دینے میں تمہاری نرم دلی' رقیق القلبی' آڑے نہ آئے' اس سے دین اللہ میں نرم دلی سے کام نہ لینا اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ اس سے ذہن میں یہ آتا ہے کہ پھروٹ کے مارنا جنوں کیندے ہیگے نے ہاں۔ ❸ ذرا سی نرمی بھی نہ برتنا۔ یہ بیت مارنے یا ''جلدۃ'' مارنے کے متعلق نہیں ہے۔ یہ ہے کہ **لَا تَاۡخُذۡكُمۡ** (24:2)۔ ججوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ یاد رکھو! تم عدالت کی کرسی پہ بیٹھے ہوئے ہو' تمہارے جذبات کہیں اس حکم کو نافذ کرنے کے راستے میں روک نہ بن جائیں' تمہیں اس چیز سے روک نہ دیں' عدل کا معاملہ ہے' عدل کے معاملے میں تم جرم کی جو بھی سزا سمجھتے ہو' تمہیں اسے نافذ کرنا ہوتا ہے۔ ''تاخذ'' کے معنی ہوتا ہے: کسی چیز کا دامن کش ہو جانا' اس کو پکڑ لینا۔ وہ جج بھی تو انسان ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے اندر بھی کچھ مختلف قسم کے جذبات ہوں۔ اس میں ججوں کے متعلق بڑی چیز کہی گئی ہے کہ ان کی انفرادی یا طبعی' جو اندر کی خصوصیات ہیں' کوئی نرم دل ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی سخت دل بھی تو ہوتا ہے۔ اس کا سوال ہی نہیں کہ وہ نرم دل ہے یا سخت دل ہے' اس نے تو قانون کے مطابق جرم کی سزا کا تعین کرنا ہے۔ اس کے نزدیک تو یہ قانون کا معاملہ ہے۔ اس لیے کہا کہ اس میں کسی قسم کی نرمی نہ برتو۔ اگر تم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو یاد رکھیے جو یہ تمہارے ذاتی جذبات ہیں وہ اس سزا کے راستے میں روک نہیں بننے چاہئیں یعنی تم اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہو کہ یہ احکام خداوندی ہیں اور ان کے نتائج تمہارے سامنے آ کر رہیں گے' خواہ اس دنیا میں یا اس کے بعد کی زندگی میں۔

---

❶ شیخ سراج الحق مرحوم جو ان دروس کو ٹیپ کرنے کا کام سرانجام دیتے تھے۔

❷ ''دھوں'' کے معنی ہوتے ہیں: یہ کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اس کی تھوڑی سی ''دھوں'' نکلوا دے یعنی اسے روک کر اس کا جواذرا اتار دو۔ یہ ہمارے شیخ صاحب! مجھے ذرا روک کر اس حدت کو نکالنے کا موقع فراہم کر دیتے ہیں۔

❸ پھر یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ زور سے مارنا۔

سزا دیتے وقت مومنین کا دنگل اکٹھا کرنا نہیں ہوگا

اس آیت کا اگلا ٹکڑا یہ ہے کہ وَ لۡيَشۡهَدۡ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ(24:2)۔اس کے معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ اگر سزا دینی ہوتو پھر جماعت مومنین کا پورا ایک دنگل اکٹھا کرواوران کے سامنے یہ سارا کچھ کرو۔آپ سوچیے کہ جو قرآن تکریمِ انسانیت کی اتنی پاسداری کرتا ہو' کیا اس کے ہاں یہ ہوگا کہ مجرم کو یہ سزا دی جانی ہے تو اس کے لیے ایک انبوہ اکٹھا کرو' اس کے لیے ایک مجمع لگاؤ؟ یہ جو وَلۡيَشۡهَدۡ ہے' یہ اس قسم کی بدنی سزا دینے کے لیے ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاں ڈاکٹر کھڑا ہوتا ہے۔ یہ وَ لۡيَشۡهَدۡ (24:2) ہے۔ یہ گواہ اس امر کی صرف شہادت ہے کہ یہ جو چیز ہے یہ تنہائی کے اندر' اس کوٹھڑی کے اندر ایسے ہی نہ ہو کہ وہاں صرف وہ مجرم ہو اور یہ جلاد ہو۔آپ نے یہ جلاد کا لفظ دیکھا' یہ جلدۃ سے ہی تھا۔ بات تو یہ تھی یعنی وہ یوں مارنے والا اور اب جلاد کا لفظ آپ جانتے ہیں' ہمارے ہاں کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں کہا کہ یہ صورت نہ ہو کہ تنہا وہ ہو اور تنہا یہ جلاد ہو۔اس جلاد میں جو خود مارنے والا ہے' بھی جذبات حائل ہو سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ذاتی طور پر اس کو بھی اس سے کچھ کد ہو اس لیے یہ کہا کہ یہ دو ہی نہیں ہونے چاہئیں۔اس کے ساتھ کوئی Witness (شاہد) بھی کھڑا کرو جو یہ دیکھے کہ وہ سزا اس کے مطابق ہے جو دی جارہی ہے' کہیں سختی نہ برتی جارہی ہو' کہیں اس میں رعایت نہ برتی جارہی ہو۔اس میں لفظ شاہد ہے' مجمع نہیں ہے' یہ شہادت میں ہے۔آج کے قانون میں بھی میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر بھی ہوتا ہے' شاید جیل کا کوئی افسر بھی ہوتا ہے قرآن کا یہ وہ وَ لۡيَشۡهَدۡ (24:2) ہے تاکہ تنہائی میں یہ کچھ نہ ہو کہ وہ ایک کوٹھڑی کے اندر جلاد ہو اور مجرم ہو اور وہ جلاد جس طرح جی چاہے کرے' اس کے سامنے وہ شاہد ہونے چاہئیں' یوں یہ سزا دی جانی چاہیے۔ یہ صرف ایک آیت جرم زنا کی سزا کے متعلق ہے۔

قرآن نے صرف چار جرموں کی سزا کا تعین کیا ہے

اب آیئے اُن سزاؤں کی طرف جو قرآن نے خود تجویز کی ہیں۔ وہ کونسے جرائم کی ہیں؟ عزیزانِ من! وہ چار ہی تو جرائم ہیں جن کی سزائیں خدا نے خود تجویز کی ہیں۔ وہ ہیں جرمِ بغاوت' جرمِ قتل' سرقہ اور یہ جرمِ عصمت' جو باقی ہیں انہیں حرام قرار دیا ہے' معیوب قرار دیا ہے۔ان کی سزائیں اسلامی مملکت پہ چھوڑی دی ہیں کہ وہ حالات کے تقاضے کے مطابق خود سزائیں تجویز کرے' اپنے ضابطہ قانون میں خود ان کا تعین کرے۔

سزا کے یہ احکام اسلامی مملکت کے لیے ہیں

یہ جو سزائیں قرآن نے تجویز کی ہیں یا جن کے تعین کے متعلق اسلامی مملکت کو اجازت دی ہے اس کا تعلق اسلامی مملکت سے ہے۔

یہ صرف اسلامی نظام کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ اسلامی نظام وہ ہوتا ہے جس میں اقدار خداوندی عملاً نافذ ہوتی ہیں۔ اقدارِ خداوندی سے پہلے اس میں اول شرط یہ ہے کہ یہ تغیر نفس ہے' ذہنیتیں بدلی جاتی ہیں' نفسیاتی کیفیتیں بدلی جاتی ہیں' تعلیم و تربیت سے اس کے اندر ایک انقلاب پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے جن میں یہ تغیر نفس آچکا ہوتا ہے۔ ایمان نام ہی اس چیز کا ہے کہ جو اندر کی تبدیلی ہے' اس کا اقرار زبان سے کرے۔ اگر اندر تبدیلی نہیں ہے' تو زبان سے اس قسم کے الفاظ دہرانے کا نام ایمان نہیں ہے۔ یہ مومنین کی جماعت کا ذکر ہو رہا ہے' یہ اسلامی مملکت اور اسلامی نظام کا ذکر ہو رہا ہے جسے کہا جا رہا ہے کہ **اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ** (24:2) اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو یعنی اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہو کہ یہ احکامِ خداوندی ہیں اور ان کے نتائج تمہارے سامنے آکر رہیں گے' خواہ اس دنیا میں یا اس کے بعد کی زندگی میں۔

اسلام کا نظام عدل اور اس کے لوازمات

اب دیکھیے کہ اس اسلامی نظام میں کیا کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں اسی نظام عدل کو لیتا ہوں۔ اس میں عدل کا دارومدار شہادت پر ہوتا ہے۔ یہ شہادت بڑی اہم چیز ہے۔ یہ Law (قانون) جاننے والے حضرات آج بھی جانتے ہیں کہ سب سے مشکل ترین جو قانون ہے' وہ قانونِ شہادت ہے۔ شہادت کا قانون جو جی میں آئے بنا لیجیے۔ اسلامی نظام میں آپ کہیے تو میں کہہ دوں گا کہ مسلمانوں میں' مگر اس سے میری مراد یہ ہے کہ وہ حقیقت میں مسلمان ہیں' ہم نہیں۔ اسلامی نظام میں آپ دیکھیے جسے ہم گواہ کہتے ہیں اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے کہ **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ** (4:135) اے اس طرح سے اپنے اندر تغیر نفس پیدا کرنے والو! اے ایمان لانے والو! عدل کا قائم کرنا تمہارا ایک فریضہ ہے۔ اس کے لیے جب شہادت دینے کے لیے جاؤ تو نہ مدعی کی طرف سے جاؤ' نہ مدعا علیہ کی طرف سے جاؤ' خدا کی طرف سے گواہ بن کے جاؤ۔ عزیزان من! ہم تو آج ان لفظوں کے بھی معنی نہیں سمجھ سکتے۔ یہاں کہا کہ مدعی یا مدعا علیہ کی طرف سے نہیں' ملزم اور مستغیث کی طرف سے نہیں' بلکہ خدا کی طرف سے جا کر شہادت دو' خدا کی طرف سے۔ سنیے' عزیزان من! قرآن کہتا ہے کہ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر کھڑے ہو اور ہمیشہ عدل و انصاف کو مدنظر رکھ کر سچی سچی شہادت دو۔ **وَ لَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ** (4:135) خواہ وہ شہادت تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ یا اللہ!! سن رہے ہیں یہ کونسے شاہد ہونگے؟ قرآن کہتا ہے کہ خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف کیوں نہ جائے اور اس سے آگے ہے کہ خواہ وہ شہادت **اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ** تمہارے ماں باپ کے خلاف بھی کیوں نہ جائے۔ آگے چلیے' قرآن کہتا ہے کہ خواہ وہ شہادت **وَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ** (4:135) تمہارے اعزہ اور رشتہ داروں کے خلاف بھی کیوں نہ جائے۔ جی وہاں کھڑے ہو کے عدالت میں یہ سچی شہادت دو اور **اِنۡ یَّکُنۡ غَنِیًّا اَوۡ فَقِیۡرًا** (4:135) یہ نہ دیکھو کہ جس کے خلاف بات ہو رہی ہے وہ دولت مند ہے یا غریب آدمی ہے۔ اس کی پوزیشن کو

مت دیکھو۔اس باب میں امیر اور غریب میں کوئی خط امتیاز قائم نہ کرو حتیٰ کہ دشمن سے بھی عدل کرو(5:8)۔اسے ذہن میں بٹھالو کہ **فَاللّٰہُ اَوۡلٰی بِہِمَا**(4:135)تم تو خدا کی طرف سے گواہ بن کے آئے ہو فریقین کی طرف کیوں دیکھ رہے ہو اللہ کا حق ان کے مقابلے میں زیادہ فائق ہے اس لیے **فَلَا تَتَّبِعُوا الۡہَوٰۤی اَنۡ تَعۡدِلُوۡا** (4:135) صحیح بات کہنے میں تمہارے اپنے ذاتی جذبات قطعاً دخل انداز نہ ہو جائیں نیز **وان تلوا** گول مول بات نہ کرو صاف دوٹوک بات کرو ذو معنی بات نہ کرو اس کے ساتھ ہی **اَوۡ تُعۡرِضُوۡا** (4:135) گریز کی راہیں تلاش نہ کرو کہ شہادت کے لیے جانا ہی نہ پڑے سمن ہی نہ ہونے دو۔ایسا کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔تم پر تو خداوندی فریضہ ہے اور اگر یہ کچھ کرو گے تو ہو سکتا ہے کہ عدالت کو یا وہاں جو حاضر ہیں ان کو تو تم کسی طرح فریب دے لو لیکن **فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا** (4:135) اس خدا کو کیا جواب دو گے جو تمہارے دلوں کے حالات سے بھی واقف ہے۔عزیزان من! یہ ہے وہ نظام جس میں یہ سزائیں ہیں! سزاؤں کے تعین کا اختیار اسے دیا گیا ہے۔

گواہی دینے والا یقینی طور پر محفوظ رہے گا

عزیزان من! دوسری جگہ اس جماعت مومنین کو یہ کہا کہ یاد رکھو **وَ لَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّ لَا شَہِیۡدٌ** (2:282) نظام اس کی ضمانت دے کہ کاتب کو اور گواہ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی نہ اس کو نقصان ہوگا۔وہاں یہ پورا انتظام ہوگا اس نظام کے اندر یہ ساری چیزیں جو قانون کی ہیں جو قرآن نے دی ہیں یا جو جرائم کی سزائیں مقرر کی ہیں انہیں قائم رکھو اور یہ بھی کہ اس نظام میں گواہ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی۔یہ تو ہوئے گواہ اور اس نظام میں ججوں کے متعلق احکام۔

حضرت داؤدؑ اور رسولِ خدا ﷺ کی شخصیت کو جج کی حیثیت سے احکامِ قرآنی کی تاکید

کیا آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم میں مخاطب کس کو کیا گیا ہے؟ جج کی حیثیت سے بھی ایک نبی سے کہا جا رہا ہے کہ **یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰکَ خَلِیۡفَۃً فِی الۡاَرۡضِ** (38:26) تم لوگوں میں الحق کے مطابق فیصلے کرو۔الحق تو وحی خداوندی کو کہتے ہیں۔کہا کہ تم وحی خداوندی کے مطابق فیصلے کرو اور اگلی بات یہ ہے کہ **وَ لَا تَتَّبِعِ الۡہَوٰی** (38:26) اپنے ذاتی جذبات کو قطعاً اس میں دخل انداز نہ ہونے دو۔صاحب! یہ کوئی آسان بات نہیں ہے کہ ذاتی جذبات اور ذاتی خیالات اس کے اندر آنے ہی نہ پائیں لیکن قرآن تو تربیت ہی اسی قسم کی کرتا ہے۔نبی سے کہا جا رہا ہے کہ تم جج کی حیثیت سے عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہو اپنے جذبات کو قطعاً اس کے اندر دخل انداز نہ ہونے دو اس لیے کہ **فَیُضِلَّکَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ**(38:26) ذاتی جذبات آئے تو تم اللہ کے راستے سے گمراہ ہوئے۔یہ حضرت داؤد علیہ السلام سے کہا اور اس سے بھی آگے وہ اس ذات اقدس و اعظم ﷺ کہ جس سے بڑھ کر آسمان کی آنکھ کسی عادل کا تصور نہیں کر سکتی سے

حکم ہوا ہے کہ وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:49) ان کے خیالات وجذبات کی قطعاً رعایت نہ کرو۔ یہ تم پر کسی طرح بھی اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ جب وہ انبیائے کرام علیہم السلام اور رسل کو تاکید کر رہا ہے تو آپ سوچ لیجیے کہ جو بھی ان کی جانشینی میں عدالت کی کرسی پر بیٹھے گا' اس پہ کیا کیا ذمہ داریاں نہ آئی ہونگی۔ گواہ ہوں تو وہ ہوں اور ججوں کی یہ کیفیت ہو۔

جرائم کو ختم کرنے کے لیے صاف ستھرے ماحول کا پیدا کرنا ضروری ہوگا

عزیزان من! اس کے بعد اگلی چیز جو قرآن نے کہی ہے وہ صاف ستھرے ماحول کی ہے۔ وہ پورا ماحول ایسا Create (پیدا) کرتا ہے جس کے اندر یہ جرائم صرف Exception (استثنیٰ) کی شکل اختیار کر لیتے ہیں' معاشرے میں عام نہیں ہوتے۔ پہلی چیز جو میں نے آپ سے کہی ہے' وہ یہ ہے کہ قرآن نے خود کہا ہے کہ شریف زادیوں کے مقابلے میں لونڈیوں کی سزا آدھی ہے (4:5)۔ پہلی بات تو یہی آ گئی حالانکہ معاشرہ ایک ہی ہے۔ اس معاشرے میں بھی مختلف افراد ہیں جن کی تعلیم وتربیت میں فرق ہے۔ اس زمانے میں جو لونڈیاں تھیں ان کی تو حیثیت ایسی تھی کہ اب ہم اس کی مثال ہی نہیں دے سکتے' ملازمہ کی مثال بھی اب نہیں دی جاسکتی۔ قرآن نے خود کہہ دیا کہ نہیں' ان کی تربیت اور ذہنی سطح اتنی اونچی نہیں ہوئی تھی کہ وہ جرم کا اچھی طرح احساس کر سکیں' ان کی خود ہی آدھی سزا تجویز کر دی اور اس کے مقابلے میں نبی اکرم ﷺ کی گھرانے کی خواتین سے کہا کہ اگر تم سے کبھی خدانکردہ اس قسم کا جرم سرزد ہوا تو دگنی سزا دی جائے گی۔ جی' دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے سامنے تین (Categories) (اقسام) تو یہی ہو گئیں۔ ایسے عوام جن کی عام تربیت وتعلیم ہوئی ہے۔ یہ وہ عوام ہیں جن کی ابھی تک تعلیم وتربیت نہیں ہوئی یعنی جو ابھی تک گنوار ہیں یہ سزا ان کے لیے آدھی ہے۔ اور جن کی خاص طور پہ تربیت وتعلیم ہو چکی ہے ان کی سزا دگنی ہے کیونکہ تمہارے ان اعمال کا اثر تمہاری ذات تک نہیں رہے گا معاشرے پر بھی ہوگا کیونکہ معاشرہ تمہاری طرف دیکھ رہا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔

احکامات کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول زریں

آپ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ (45AD/ 581-644) کا وہ قول یاد ہے کہ آپ ﷺ جب بھی کوئی حکم نافذ کرتے تو Announce (اعلان) کرنے کے بعد سب سے پہلے گھر آتے۔ اپنے گھر والوں سے کہتے کہ آج میں نے یہ بات Announce (اعلان) کی ہے' اچھی طرح احتیاط برتو کہ اس کی ذرا سی بھی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ یاد رکھو! باہر والے لوگ تمہاری طرف پرندوں کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ تمہاری ذرا سی حرکت ان کے لیے نظیر بن جائے گی۔ اگر تم نے ایسا کیا تو قرآن کے الفاظ میں تمہیں دگنی سزا دونگا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد کی ایک عظیم مثال

اسلامی معاشرہ کے اندر تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے (634-644/45AD) کے یہ واقعات موجود ہیں۔ایک شخص کے ملازموں نے' یہ سمجھ لیجیے کہ غلاموں نے کسی کی اونٹنی چوری کی' ذبح کیا' کھا گئے اور گرفتار ہوئے۔شاید عدالت ماتحت نے چوری کے جرم کی سزا دیدی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45AD) نے ان سے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ان کی وہ اونٹنی کیوں چرائی' یہ چرا کر اس کا گوشت کیوں کھایا؟انہوں نے کہا کہ صاحب! ہمارا مالک' ہمیں کتنے کتنے دن بھوکا رکھتا ہے' بہتیری کوشش کی کہ ہمیں وہاں سے کھانے کے لیے مل جائے' ہم تو بھوک کے مارے مرے جا رہے تھے' ہم کیا کرتے؟ باہر نکلے' یہ ایک اونٹنی تھی' ہم نے اس کو ذبح کیا اور کھالیا۔آپ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اچھا یہ بات ہے۔تم نے تو پھر کوئی جرم نہیں کیا اور مالک کو بلایا۔اس سے کہا کہ اس جرم کی سزا تمہیں ملے گی کیونکہ تم نے انہیں اس جرم کے ارتکاب کے لیے مجبور کیا۔

اصل سزا مملکت کو ملنی چاہیے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45AD) نے قحط کے زمانے میں غلہ کی چوری پر سزا ہی معاف کر دی تھی۔انہوں نے یہ کہا تھا کہ اگر اپنی بھوک کی وجہ سے' کہیں سے کوئی چیز اپنی بھوک مٹانے کے لیے چوری کر کے کھالیتا ہے تو اس کی سزا مملکت کو ملنی چاہیے کیونکہ اس کو روٹی دینا مملکت کی ذمہ داری تھی۔اس کو جو روٹی نہیں ملی تو مملکت نے اپنے فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے تو جرم تو مملکت کا ہے۔انہوں نے کہا کہ اندھیر ملاحظہ فرماؤ کہ جو خود مجرم ہے' وہ عدالت بن کے جرم کی سزا عائد کر رہا ہے' جو خود مجرم ہے وہ قاضی بن رہا ہے۔عجیب شخصیت تھی آپ کی' کہاں نگاہ جاتی ہے! مجرم قاضی بن رہا ہے' ان کے جرم کی سزا عائد کر رہا ہے مگر سوچ نہیں رہا کہ جرم کس کا ہے۔یہی چیز تھی جو آپ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ انسان تو ایک طرف' اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمر رضی اللہ عنہ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ان کا یہ کہنا ہے کہ یہ جو اس قسم کے جرائم ہوتے ہیں' ان کی اس فرد کے خلاف جرم کی درخواست نہیں دینی چاہیے' مملکت یعنی حکومت کے خلاف درخواست دینی چاہیے کہ تم نے انتظام صحیح نہیں کیا' اس لیے میرا نقصان ہوگیا۔انہوں نے کہا تھا کہ اگر کسی کی اپنی غفلت کی وجہ سے کسی کی چوری نہیں ہوتی تو مملکت کا یہ فریضہ ہے کہ جس کی چوری ہوئی ہے' جو کچھ اس کا گیا ہے وہ مملکت پورا کرے کیونکہ مملکت نے یہ حلف اٹھایا تھا کہ میں تمہاری جان مال عزت آبرو کی حفاظت کروں تو ہم تو اس کی حفاظت کرنے میں قاصر ہیں۔

اب اگلی بات جو مجرم کی ہے' جسے آپ مجرم کا معاملہ کہتے ہیں' ہم سے ہے۔وہ تو ہم سمجھ لیں گے۔یہ جس کا نقصان ہوا ہے اس کے لیے مجرم ہم ہیں۔اب تو ہمارے ہاں الفاظ ہی رہ گئے ہیں مثلاً......State Versus۔یعنی وہ جس میں سرکار کہتے ہیں کہ وہ مستغیث بن

جایا کرتی ہے۔ یہاں وہ نہیں ہو رہا کہ جس کا نقصان ہوا ہے اس کے نقصان کی تلافی سرکار کرتی ہے۔قرآن کریم میں اس بات کے لیے بڑی اہم چیز آئی ہے۔وہ بات (2:85) میں آئی ہے اور یہودیوں کے ضمن میں کہی گئی ہے لیکن اس کے اندر اصول بڑا اہم ہے۔قرآن کریم نے کہا کہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ **ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَ تُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ ؕ وَ اِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ** (2:85) تم ہو کہ ایسے محکم قول واقرار کے بعد باہمی خون ریزیاں کرتے ہو اور اپنے غریب بھائیوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے ہو اور بجائے اس کے کہ تمہاری سوسائٹی ان مجرمین کے خلاف کوئی کاروائی کرے تم الٹے ان غریبوں کے خلاف ظلم وتشدد میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو: کہیں کمزوروں کو کمزور بنانے سے اور کہیں ان سرکشوں کی حوصلہ افزائی کرنے سے اور ستم ظریفی یہ کہ جب ان گھروں سے نکالے ہوئے غریبوں کو دوسرے لوگ پکڑ کر لے جاتے ہیں تو تم خدا ترس بننے کے لیے آگے بڑھتے ہو اور ان کا زرِفدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا لیتے ہو اور اس سے سمجھتے یہ ہو کہ تم نے بڑا نیکی کا کام کیا! حالانکہ خود ان کو گھروں سے نکالنا وہ سنگین جرم تھا جس سے تمہیں منع کیا گیا تھا (2:85)۔

حالات میں بگاڑ پیدا کرنا ہی سب سے بڑا جرم ہے

عزیزان من! اس آیت (2:85) میں یوں کہا گیا ہے کہ پہلے تم اس قسم کی Situation (حالات) پیدا کر لیتے ہو کہ تمہارے اپنے ہاں کے ہی معاشرے کے جو غریب کمزور مسکین لوگ ہیں تم ان کو گھروں سے نکال دیتے ہو۔ جب دوسرے لوگ ان کو غلام بنا کے لے جاتے ہیں تو پھر تمہارے ہاں کے ارباب شریعت کہتے ہیں کہ غلاموں کو غلامی سے چھڑانے میں بڑا ثواب ہوتا ہے اور پھر تم بیٹھ کے ان غلاموں کو چھڑانے کے لیے چندے اکھٹے کرتے ہو اور فریب دے لیتے ہو کہ ہم بڑے ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ **وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ** (2:85)۔تم سمجھتے نہیں ہو کہ ان کو گھروں سے نکالنا سب سے بڑا جرم تھا جو تمہارے اوپر عائد ہوتا ہے۔تم Situation (حالات) ایسی Create (پیدا) کر دیتے ہو کہ جس سے دوسرے ان کو غلام بنالیں۔اس کو تو تم کبھی نگاہ میں نہیں رکھتے بس غلامی کے چھڑانے کا تم نے سوچ رکھا ہے کہ یہ بڑے ثواب کا کام ہے۔ایسے اسباب پیدا کرنا جس سے کوئی دوسرا غلام بن جائے اسے تو تم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ یہ بھی کوئی جرم ہے۔

عزیزان من! اسلامی نظام کا اصل جرم ایسے حالات پیدا کرنا ہے، جس میں لوگ جرائم کے لیے مجبور ہو جائیں۔ یہ باطل کا نظام ہے۔اسلام کا نہیں رہتا۔ایسا کرنے کے بعد تم ان جرائم کی سزا کے لیے، اس کی تلافی کے لیے، جتنا جی چاہے انتظامات کرتے چلے جاؤ، اس سے وہ نظام اسلامی نہیں بن جاتا۔اصل بات تو وہ ہے کہ تم نے اس قسم کا ماحول Creat (پیدا) کیا جس کے اندر یہ جرائم عام ہونگے۔وہ

بار بار اس نظام کو مجرم قرار دیتا ہے۔

ضروریاتِ زندگی کا احسن طریق سے پورا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے

اب آپ اس کی روشنی میں سوچیے کہ پھر وہ کون لوگ رہ جائیں گے جو اس قسم کے جرم کے مرتکب ہوں؟ ہر شخص کو اور اس کے بال بچوں کو رزق کی، ضروریاتِ زندگی کی، باہم رسانی، حکومت کا فریضہ ہے۔ اگر یہ سب کچھ ملتی ہوں، کسی کی ضرورت رکی ہوئی نہ ہو اور اس کے بعد بھی کوئی شخص کسی سے چوری کر کے کچھ لیتا ہے تو اسے تو گولی مار دینی چاہیے۔ سائیکالوجی کے اندر بعض اس قسم کی نفسیاتی بیماریاں لکھی گئی ہیں کہ یہ سارا کچھ کرنے کے باوجود ان کا رجحان قانون شکنی کی طرف ہی جاتا ہے اور وہ خود یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کی بیماریوں کا علاج خوف کے ذریعے کرایا جا سکتا ہے۔ یہ جو سزائیں آپ کہیں کہیں دیکھتے ہیں یہ صرف اس قسم کی نفسیاتی بیماروں کے لیے ہیں اور وہ تو معاشرے میں Exception (استثنا) ہوتے ہیں۔ صحیح معاشرے کا معمول Normal Conditions (معمول کے حالات) کا قیام ہے، حالات کی صحت ہونی چاہیے بیماری تو Exception (استثنا) ہے یعنی اسی طرح فرد کی زندگی کے اندر بھی زندگی تندرستی کی رہنی چاہیے۔ یہ نارمل ہے۔ بیماری کے اندر Exception (استثنا) آتی ہے۔

اسلامی مملکت کا پہلا فریضہ

معاشرے کے اندر قانون کے مطابق عمل کرنا اسلامی معاشرے کا معمول ہے۔ اس میں اس قسم کی قانون شکنی کے واقعات Exception (مستثنیٰ) ہیں۔ یہ Exceptions (مستثنیات) اس ذہنیت کی وجہ سے ہیں۔ پہلی چیز اس معاشرے نے یہ کی تھی کہ تغیر نفس کیا۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (2:129) نبی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ قانون کی تعلیم دے اور اس کی غرض و غایت بتائے۔ وَ يُزَكِّيهِمْ (2:129) اور اس طرح ان کی ذات کی نشوونما کرے۔ یہ اسلامی مملکت، اسلامی نظام کا پہلا فریضہ ہے۔ جب وہ معاشرہ یہ کچھ کرے، معاشرے کے اندر اس قسم کے مریض رہ جائیں جو قانون شکنی کی طرف جاتے ہیں تو انہیں وہاں سے روکنے کے لیے یہ تکلیف دینا جسے آپ ڈر کہتے ہیں، جسے آپ سزا کہتے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے۔

کمزور یا بیمار ذہنیت کا علاج

قرآن کریم نے سزاؤں کے ساتھ کہا ہے کہ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ (5:39) دیکھ لو کہ یہ اس کا جو فیصلے کا ڈر ہے کہ اس سے یہ ہو جائے گا، اسے فیصلہ سناؤ اور دیکھو کہ اگر تمہیں اس میں اصلاح کی گنجائش نظر آتی ہے تو پھر سزا والی بات نہیں ہوگی۔ بات تو یہ تھی کہ وہ قانون کا پابند رہے۔ یہ چیز کبھی تو سہواً ہو جاتی ہے۔ وہ بھی میں نے جیسا کہا تھا کہ انسان کی ذات کے استحکام کی کمزوری

ہوتی ہے۔اس میں عزم نہیں ہوتا لیکن بعض اوقات اس قسم کی چیزیں' اس ذہنیت کی بھی ہوتی ہیں جو میں نے ابھی کہا ہے کہ ''مریض ذہنیت'' ہوتی ہے۔اگر وہ خوف یعنی Actually وہ چیز نہ کی جائے' بلکہ اس کو بتایا جائے کہ یہ ہوگا' اگر اس سے ہی اس کے اندر اصلاح ہوگئی ہے اور اس نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ واقعی مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا' آئندہ نہیں کرونگا تو کہا کہ عدالت کو تسآب اس کا اطمینان ہوجائے اور اس کے بعد اصلاح ہو پھر اس کو اس طرح سے معافی دے اور اس کے بعد مملکت اس کے اوپر نگاہ رکھے کہ وہ اس کے بعد اپنی اصلاح کرتا ہے تو قرآن کہتا ہے کہ ٹھیک ہے: اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (5:39) قانون خداوندی میں اس کے لیے معافی کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ایسے شخص کو سزا سے بھی محفوظ رکھا جائے گا اور عام سہولتوں سے بھی محروم نہیں کیا جائے گا۔

ہمارے ہاں کا نظامِ عدل اور ہمارے ہاں کی مروجہ سزائیں' نتیجہ تباہی و بربادی

آپ دیکھیے کہ سزاؤں کے ساتھ قرآن کی تفاصیل پورے اس نظام کے اندر Fit in ہوتی ہے۔ساری بات یہ ہے کہ معاشرہ یہ ہو' ماحول یہ ہو' اس کے اندر معمول کے مطابق زندگی اس طرح سے بسر ہو رہی ہو' اس میں (Abnormally) غیر معمولی طور پر اس قسم کے حادثے آئیں' ان کے لیے اس قسم کا نظام عدل ہو' اس قسم کا نظام شہادت ہو' اس کے بعد خوف دلانے والی ایک چیز ہے' جسے سزا کہا جائے گا۔

اگر اسی سے اس کے اندر اصلاح کا پہلو غالب آجاتا ہے تو پھر اس کو اصلاح کا موقعہ دیا جائے۔یہ سارا کچھ سامنے رکھنے سے پھر بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کے یہ جرائم کیا ہیں' ان کی سزائیں کیا ہیں؟ ان میں سے ان عوامل کو ہٹا کر اگر صرف اتنے ہی ٹکڑے کو اپنے سامنے رکھ لیا جائے کہ اس کو سو کوڑے مارو' وہ جو یہاں ہمارے ہاں موجودہ جیل خانوں کے اندر ہوتے ہیں۔تو اس کے بعد یہاں کے نظام عدل' نظامِ شہادت کے لیے مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔اس کے ہر نظامِ عدل اور نظامِ شہادت میں یوں ہوتا ہے کہ پھڑلے عملاں والیاں نوں' چھڈ دے اوگنہارنوں۔ [1] اس پس منظر میں رکھ کے قرآن کی ان سزاؤں کو یا جرائم کو نہیں دیکھنا چاہیے۔

قرآن کا نظامِ حیات ناقابل تقسیم وحدت ہے

قرآن ایک کلی چیز ہے' اس کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جاسکتا۔اس کا اپنا پس منظر ہے' یہ نظام ناقابل تقسیم اکائی ہے۔وحدت ہے جیسے ایک انسان پورے کا پورا انسان ہوتا ہے تو سارا بیمار ہوتا ہے اسی طرح قرآن زندگی کو ایک ناقابلِ تسخیر وحدت قرار دیتا ہے۔ناقابل تقسیم وحدت کے لیے قرآن ضابطہ حیات ہے۔اس کے کسی حکم کو بھی آپ نے دیکھنا ہو تو یہ جو اس کا کلی نظام ہے' اسے اس کی روشنی میں دیکھو پھر

---

[1] عمل کرنے والوں کو گرفتار بلا کرلے اور گنہگاروں کو شتر بے مہار کردے۔

اس کی حکمت سمجھ میں آئے گی۔ وہ تو ہر بات اور ہر حکم کے لیے کہتا ہے کہ ہم حکیم ہیں یعنی یہ خدا کی ایک مستقل صفت ہے' ایک مستقل قدر ہے' وہ Reason (استدلال) کو کسی وقت بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ کس قسم کے پس منظر میں' کس قسم کے ماحول میں' یہ چیزیں کہی گئی ہیں تو پھر عزیزان من! ان کا صحیح مفہوم سامنے آئے گا۔

معاشرہ سزاؤں سے نہیں بدلتا' سوچ سے ذہنیت کے بدلنے سے بدلتا ہے

اگر چیزوں کو اس پس منظر' ماحول یا نظام میں نہ دیکھا جائے تو پھر یہی نعرے ہوتے ہیں کہ اسلامی نظام نافذ کرو' چور کے ہاتھ کاٹ دو' اور زانی کو سنگسار کرو اور اگر پس منظر کا ماحول یا نظام دیکھنے سے چیزوں کا صحیح مفہوم سامنے آجائے تو اس کے بعد آپ دیکھیے کہ کس طرح اصلاح ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر یہی ہو کہ بہت اچھا ٹھیک ہے جی' اسلامی سزائیں نافذ کردو: جرم قتل کی سزا موت ہے۔ اسلام میں' شریعت میں' موجودہ قانون میں بھی وہ سزا ہے تو یہ اسلامی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا سزا دینے سے جرائم رک جاتے ہیں؟ یہاں تو

بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں ہر سزا کے بعد

یہاں ہر سال ان جرائم کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور ہمارے ہاں صرف یہی بحثیں (Discussions) ہوتی ہیں کہ آیا اسلامی سزا ہے یا نہیں؟ جرائم صرف سزاؤں سے نہیں رکتے۔ یہ تو صرف اندرونی تبدیلی ہے' جس سے یہ رکتے ہیں۔ اب کرنے کی دو چیزیں ہیں: پہلے آپ کو اس نظام کو بدلنا ہوگا' وہ ماحول Create (پیدا) کرنا ہوگا جس میں ہر بھوکے کو روٹی ملے تاکہ وہ روٹی کی خاطر جرم کرنے پر آمادہ ہی نہ ہو اس لیے پہلے اس مروجہ نظام کو بدلو۔ وہ کہنے والا کیا بات کہہ گیا ہے! باطل نظام کی تفصیل دینے کے بعد کہتا ہے کہ

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

جب تک یہ باطل نظام تہ و بالا نہیں ہوتا' اس وقت تک دانش و تہذیب و دیں سودائے خام ہیں۔

کیا بات ہے! اور اس کے بعد وہ یہ کہتا ہے کہ قانون کے ذریعے سے یہ تبدیلیاں لانے والے' جو ذہن میں لیے بیٹھے ہیں' سن لیں:

نیست ایں کار فقیہاں اے پسر
با نگاہ دیگرے او رانگر

یہ قانون والوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ زاویہ نگاہ بدل' اور اس کے بعد اسے دیکھ' پھر بات سمجھ میں آئے گی۔ خالی (Mechanically) قانون کو کہیں بھی نافذ کر دینے سے نتائج نہیں پیدا ہو سکیں گے۔ یہ جو نگاہ دیگر ہے' یہ ہے اصل شے۔ اسی لیے یہ کہا

ہے کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ❶ (2:129) تعلیم کتاب وحکمت' اور انسانی ذات کی نشوونما۔ اس نفسیاتی تغیر کے بعد' عزیزان من! نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ یہی چیز ہے جو قرآن کہتا ہے کہ کسی چیز کو بھی آپ مکینکلی نافذ کریں گے تو کچھ نہیں ہوسکتا۔

یہ ہے عزیزان من! پورا پس منظر جس کے تابع میں سمجھتا ہوں کہ آج ہم نے پہلی دو آیات ختم کی ہیں۔ آئندہ درس میں سورۃ النور کی تیسری آیت لیں گے اور پھر تو انشاءاللہ رواں چلے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ یہ جو میں نے تین درس اس کے پس منظر کے لیے پیش کیے ہیں' آپ کے لیے ان حقائق کا سمجھنا نہایت ضروری ہے' یہ اس کو سمجھنے کے لیے مفید رہے ہونگے کہ قرآن کی رو سے جرم وسزا کی نوعیت کیا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀❀ ..... ❀❀❀ ..... ❀❀

---

❶ انہیں اس ضابطہ (کتاب) کی تعلیم بھی دے' اور یہ بھی بتا کہ ان قوانین کی غرض وغایت کیا ہے اور ان پر عمل کرنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے (2:231;17:39;33:34)۔ اور (صرف نظری طور پر ہی یہ تعلیم نہ دے' بلکہ عملاً ایسا نظام متشکل کردے جس میں) لوگوں کی صلاحیتوں کی برومندی اور ان کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے۔ (پرویز: مفہوم القرآن' ص۔47)

چوتھا باب: سورۃ النور (آیات 3 تا 20)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوۡ مُشۡرِکَۃً ۪ وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنۡکِحُہَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوۡ مُشۡرِکٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی
الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَۃِ شُہَدَآءَ فَاجۡلِدُوۡہُمۡ ثَمٰنِیۡنَ جَلۡدَۃً وَّلَا
تَقۡبَلُوۡا لَہُمۡ شَہَادَۃً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴﴾ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَاَصۡلَحُوۡا ۚ فَاِنَّ
اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۵﴾ وَالَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ اَزۡوَاجَہُمۡ وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہُمۡ شُہَدَآءُ اِلَّاۤ اَنۡفُسُہُمۡ فَشَہَادَۃُ اَحَدِہِمۡ
اَرۡبَعُ شَہٰدٰتٍۭ بِاللّٰہِ ۙ اِنَّہٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۶﴾ وَالۡخَامِسَۃُ اَنَّ لَعۡنَتَ اللّٰہِ عَلَیۡہِ اِنۡ کَانَ مِنَ
الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۷﴾ وَیَدۡرَؤُا عَنۡہَا الۡعَذَابَ اَنۡ تَشۡہَدَ اَرۡبَعَ شَہٰدٰتٍۭ بِاللّٰہِ ۙ اِنَّہٗ لَمِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۸﴾ۙ وَالۡخَامِسَۃَ اَنَّ
غَضَبَ اللّٰہِ عَلَیۡہَاۤ اِنۡ کَانَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۹﴾ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہٗ وَاَنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ
حَکِیۡمٌ ﴿۱۰﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ جَآءُوۡ بِالۡاِفۡکِ عُصۡبَۃٌ مِّنۡکُمۡ ؕ لَا تَحۡسَبُوۡہُ شَرًّا لَّکُمۡ ؕ بَلۡ ہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ لِکُلِّ
امۡرِیًٔ مِّنۡہُمۡ مَّا اکۡتَسَبَ مِنَ الۡاِثۡمِ ۚ وَالَّذِیۡ تَوَلّٰی کِبۡرَہٗ مِنۡہُمۡ لَہٗ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۱﴾ لَوۡلَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡہُ
ظَنَّ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بِاَنۡفُسِہِمۡ خَیۡرًا ۙ وَّقَالُوۡا ہٰذَاۤ اِفۡکٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۲﴾ لَوۡلَا جَآءُوۡ عَلَیۡہِ بِاَرۡبَعَۃِ
شُہَدَآءَ ۚ فَاِذۡ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِالشُّہَدَآءِ فَاُولٰٓئِکَ عِنۡدَ اللّٰہِ ہُمُ الۡکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۳﴾ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہٗ
فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ لَمَسَّکُمۡ فِیۡ مَاۤ اَفَضۡتُمۡ فِیۡہِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۴﴾ۙ اِذۡ تَلَقَّوۡنَہٗ بِاَلۡسِنَتِکُمۡ وَتَقُوۡلُوۡنَ
بِاَفۡوَاہِکُمۡ مَّا لَیۡسَ لَکُمۡ بِہٖ عِلۡمٌ وَّتَحۡسَبُوۡنَہٗ ہَیِّنًا ۖ وَّہُوَ عِنۡدَ اللّٰہِ عَظِیۡمٌ ﴿۱۵﴾ وَلَوۡلَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡہُ قُلۡتُمۡ
مَّا یَکُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّتَکَلَّمَ بِہٰذَا ۖ سُبۡحٰنَکَ ہٰذَا بُہۡتَانٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۶﴾ یَعِظُکُمُ اللّٰہُ اَنۡ تَعُوۡدُوۡا لِمِثۡلِہٖۤ اَبَدًا اِنۡ
کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۷﴾ۚ وَیُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ
الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا
تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہٗ وَاَنَّ اللّٰہَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۰﴾

عزیزان من! آج اکتوبر 1977ء کی 21 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورۃ النور کی آیت 3 سے ہو رہا ہے: (24:3)۔

جنسیات کا مسئلہ دو افراد کا ہی مسئلہ نہیں بلکہ یہ پوری قوم کا ہے

آپ کو یاد ہوگا کہ سورۃ النور کی پہلی ہی آیات میں جنسی تعلقات کے متعلق ہدایات دے دی گئیں اور آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ اس کی مبادیات کے متعلق' اس کی اہمیت بتانے کے لیے' میں نے تین درس صرف کیے کہ یہ جنسی تعلقات کا مسئلہ دو افراد کا ذاتی مسئلہ نہیں ہے۔ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ یہ ایک مرد اور ایک عورت کا ایک ذاتی سا اختلاط کا مسئلہ ہے لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے مغربی محققین کی تحقیقات کے نتائج آپ کے سامنے پیش کیے تھے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ انفرادی فعل نہیں اور اس کا وہ تعلق دو ایک جوڑے تک محدود نہیں رہتا۔ اس کا تعلق تو پوری قوم کی تمدنی زندگی پر پڑتا ہے' پوری قوم کی قوتیں' پوری قوم کی ترقیاں' قوم کا آگے بڑھنا' قوم کا عروج' قوم کا زوال' اس کا بیشتر انحصار اس بات پر ہے کہ اس قوم نے اپنے ہاں جنسی تعلقات کے لیے کس قسم کے ضوابط مقرر کر رکھے تھے۔ یہ وجہ ہے جو قرآنِ کریم اس خاص موضوع کو اتنی اہمیت دے رہا ہے۔ آپ دیکھیے کہ بعض بڑے بڑے اہم مسائل ایسے ہیں جن کے متعلق ایک آدھ مرتبہ قرآن ذکر کرتا ہے' تاکید کرتا ہے اور پھر دوسرا موضوع شروع ہو جاتا ہے لیکن یہ جنسی تعلقات کا موضوع ایسا ہے کہ اب ایک سورۃ کی ابتدا ہی یہاں سے ہوئی ہے اور اس میں بھی آپ دیکھیں گے کہ قرآن یہ چیزیں مسلسل بیان کرے گا اور اس کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی بڑی تفصیل سے وہ اس کا ذکر کرتا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر کہ یہ محض انفرادی مسئلہ نہیں ہے' اس کا تعلق قوموں کے عروج و زوال سے ہے۔ پہلی دو آیات کے اندر اس نے بتایا تھا کہ جرمِ زنا کی سزا کیا ہے۔ تیسری آیت میں اب جو ہمارے سامنے آئی ہے وہ یہ بتا رہا ہے کہ **اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِکَةً ۫ وَّ الزَّانِیَةُ لَا یَنْکِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ**[1] (24:3)۔

---

[1] زنا کوئی معمولی جرم نہیں۔ ذرا اس کی نفسیات پر غور کرو۔ اس قسم کے جنسی تعلق ☆ کے لیے وہی عورت رضامند ہوگی جو حفاظتِ عصمت کو مستقل قدر ہی نہ سمجھے یا سرے سے (خدا کی جگہ) اپنی خواہشات ہی کو اپنا معبود بنا لے کہ ان کے ہر تقاضے کے سامنے جھک جائے (45:23)۔ اسی طرح اس قسم کے تعلق کے لیے وہی مرد آمادہ ہوگا جو اپنی خواہشات کا غلام ہو اور انسانی اور حیوانی زندگی میں کوئی تمیز نہ کرے۔ (اس سے ظاہر ہے کہ زنا اسی صورت میں سرزد ہوتا ہے جب مرد اور عورت دونوں ہم خیال اور یک رنگ ہوں (24:26)۔ اگر ان میں سے ایک بھی پاکباز ہو تو زنا کا امکان نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ زنا کی سزا مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے)۔ مومنین کے لیے اس قسم کے تعلقات حرام ہیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن' ص۔ 794)

☆ یہاں "ینکح" سے مراد جنسی تعلقات قائم کرنا ہے نہ کہ اصطلاحی نکاح۔ "نکاح" کا لفظ لغت میں ان معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ یاد رہے کہ زنا بالجبر کی نوعیت مختلف ہے۔ اس میں عورت مجرم نہیں قرار پا سکتی اور مرد کا جرم بھی دہرا ہوتا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوع اسلام (ٹرسٹ)' لاہور' فٹ نوٹ 1' 2' ص۔ 794)

اس سلسلہ میں ایک پیدا کردہ الجھن کا نتیجہ

عزیزان من! اس آیت (24:3) کا غلط مفہوم یا غلط ترجمہ پیش کرنے سے بہت سی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پہلے یہ الجھنیں پیدا کر لیتے ہیں پھر انہیں جس طرح سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ سلجھتی نہیں ہیں۔ اس کا عام طور پر یہ ترجمہ کر دیا جاتا ہے کہ زانی تو صرف زانیہ کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے یا کسی مشرکہ کے ساتھ۔ اسی طرح سے زانیہ عورت زانی کے ساتھ ہی نکاح کر سکتی یا مشرک کے ساتھ۔ آپ سوچیے کہ اس سے کتنی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں کہ جرم زنا کا ارتکاب کسی ایک دفعہ ہو گیا تو اب اس کے بعد وہ نکاح کے لیے کسی زانی عورت یا زانی مرد کو تلاش کرتے پھریں یا مشرک کو، اس کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا، اگر دیکھا جائے تو مشرک کے ساتھ مسلمان کا نکاح ہی حرام ہے۔ میں ان آیات میں اس مقام پہ زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

اس میں کہا یہ گیا ہے کہ یہ سزا، جو پہلے تجویز کی گئی ہے، وہ زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر دونوں میں سے ایک کی بھی مرضی نہ ہو تو اس فعل کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا۔ زنا بالجبر کو چھوڑ دیجیے کیونکہ جس پہ جبر کیا جائے وہ مجرم ہی نہیں قرار پاتا یہ فعل رضامندی کے ساتھ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ دونوں اس پر آمادہ ہوں۔ اس لیے یہ دونوں برابر کے مجرم تصور کیے جائیں گے اور وہ اسی صورت میں ہی ہے کہ یا تو جنسی جذبے کا غلبہ ان کے اوپر اتنا زیادہ ہو جائے کہ عقل و ہوش ہی کھو بیٹھیں اور یا وہ خدا کے قوانین کو سرے سے مانتے ہی نہ ہوں۔ یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں جن میں یہ کہا ہے کہ **حُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ**[1] (24:3)۔ یعنی جن چیزوں، یا جن افعال کے لیے خاص طور پر حرام کا لفظ آیا ہے اس میں یہ زنا بھی ہے۔ دوسری جگہ بھی قرآن نے اس کے لیے حرام کا لفظ کہا ہے اور کہا ہے مومنین کے لیے۔ تو یہ چیز حرام میں داخل ہے۔

تہمت بھی ایک سنگین جرم ہے

اس کی اہمیت کے پیش نظر اگلی آیات میں بھی آپ دیکھیے اسی سلسلے کو جاری رکھا گیا ہے کہ **وَ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ**[2] (24:4)۔

---

[1] مومنین کے لیے اس قسم کے تعلقات حرام ہیں۔

[2] جب عصمت اس قدر متاعِ گراں بہا اور مستقل قدر ہے، تو اس کی حفاظت کے لیے بڑی پختہ تدابیر کرنی چاہیں۔ اس سلسلہ میں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور اپنے بے گناہ ہونے کے ثبوت میں چار گواہ نہ لائیں تو انہیں اسی (80) کوڑے لگاؤ اور اس کے بعد ایسے ساقط الاعتبار لوگوں کی جو دوسروں کے خلاف بے بنیاد الزامات لگائیں، گواہی قبول نہ کرو اور انہیں ان حقوق سے بھی محروم کرو جو اسلامی مملکت کے شریف انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ اس پر بھی اس سے باز نہ آئیں تو انہیں اس سے بھی زیادہ سخت سزا دو (24:4) اس لیے کہ یہ لوگ صحیح راہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 794)

اس آیت میں کہا ہے کہ جولوگ شریف عورتوں پر تہمت سازی کریں' ان کے خلاف الزام لگائیں' تو سنو! یہ بہت بڑا جرم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس فعل سے معاشرے میں عورت کی قیمت (Value) ہی کچھ نہیں رہتی۔ اگر اس قسم کی اتہام سازی اس کے خلاف ہو جائے تو اس بیچاری کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے کہ اپنی پاک دامنی کی شہادتیں بہم پہنچاتی پھرے۔ وہ تو بات نہیں کر سکتی' اندر ہی اندر مر جاتی ہے۔ یہ بڑا سنگین جرم ہے۔ جرمِ زنا کی سزا تو قرآن نے سو کوڑے بتائی تھی۔ یہ جو تہمت اور الزام لگانے کا جرم ہے' اس کے لیے بھی اسی (80) کوڑے کی سزا ہے۔ اگر اتہام لگائے جانے کا واقعہ ہے تو اسے کہا کہ اس کے لیے کم از کم چار گواہ پیش کرنے ہونگے۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اتہام غلط لگا ہے۔ تو عورتوں کی عصمت کی حفاظت کے لیے' ان کے مستقبل کی حفاظت کے لیے' نہایت ضروری تھا کہ اس قسم کے قوانین دیئے جاتے ورنہ یہ بات جو یونہی اس طرح معاشرے میں چل نکلے اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں تو قرآن کریم نے یہی بات کہی ہے کہ جو مجرم اس قسم کے جرم کا ارتکاب کرے یعنی شریف زادیوں کے خلاف تہمت سازی کرے' بہتان تراشی کرے تو اسے یہ سزا دی جائے۔ پہلی سزا تو یہ اسی (80) درے کی سزا ہے اور دوسری یہ ہے کہ اسے ساقط الاعتبار قرار دیا جائے یعنی اس کی کبھی شہادت قبول نہ کی جائے۔

عزیزانِ من! نظر آتا ہے کہ ایام جاہلیہ میں' جیسا کہ غلط معاشروں کے اندر عام طور پہ ہوتا ہے' اس اتہام سازی کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ عام طور پہ لوگ عورتوں کے خلاف تہمت تراشیاں بھی کرتے تھے۔ یہ جنہیں ہم شریف زادیاں کہتے ہیں' یہ باہر نکلنے والی ان شریف زادیوں کے ساتھ چھیڑ خانی بھی کرتے تھے۔ سورۃ احزاب میں آپ دیکھیے کہ شریف زادیوں کے خلاف چھیڑ خانی کرنے کو قرآن نے کتنا سنگین جرم قرار دیا ہے۔ تہمت تراشی کو یہاں اس آیت میں یعنی (24:4) میں جرم قرار دیا ہے۔ اس کی سنگین سزا اسی (80) کوڑے رکھی۔ یہ اس زمانے کی زندگی ابھی ایسی تھی کہ عورتوں کو باہر نکلنا ہوتا تھا۔ یہ سورۃ احزاب کی جو پہلی آیت ہے' وہاں سے پتہ چلتا ہے۔ یہ وہی آیت ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ یہ پردے کی آیت ہے۔ اس کا مقصد کیا تھا' قرآن نے خود بتایا ہے کہ **یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا** ❶ (33:59)۔ یہ مستورات یعنی عورتیں باہر نکلتی تھیں۔ اسے کم و بیش دیہاتی زندگی سمجھ لیجیے۔ ہمارے ہاں دیہات میں بھی عورتوں کو باہر جانا ہوتا ہے۔ تو ہر چند کہ یہ مدینے کی زندگی ہے اور ایک مملکت بھی قائم ہو چکی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تمدنی زندگی ابھی ایسی ہی تھی جیسے دیہات کی زندگی ہوتی ہے۔ عورتیں باہر جاتی تھیں۔ یہ خبیث لوگ عورتوں کو چھیڑتے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا تھا تو وہ یہ کہتے تھے کہ ہم انہیں پہچان نہیں سکتے۔

---

❶ اے نبی! تو اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے اور مومنوں کی عورتوں سے کہدے کہ وہ باہر نکلیں تو اپنے کپڑے کے اوپر ایسا کشادہ سا کپڑا پہن لیا کریں جس سے زینت نمایاں نہ ہو (24:21)۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ وہ پہچانی جا سکیں (کہ شریف بیبیاں جا رہی ہیں) اور کوئی بدقماش انہیں تنگ نہ کرے۔ یہ چیز ان کے لیے قانون خداوندی کی رو سے حفاظت اور تربیت کا موجب بن جائے گی۔ (پرویز: مفہوم القرآن' ص۔ 982 تا 983)

شریف زادیوں کے لیے جلباب کا حکم

عزیزان من! نظر آتا ہے ایام جاہلیہ کے اندر کچھ اس قسم کی فحاشیاں عام تھیں۔ وہاں یہ خبیث لوگ کہتے تھے کہ صاحب! ہم پہچان نہیں سکتے ہیں کہ یہ شریف زادیاں ہیں یا اس قماش کی عورتیں ہیں۔ خود نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اپنی ازواج کو' اپنی بیٹیوں کو' مومنین کی عورتوں کو' یہ کہو کہ وہ جو کپڑے پہنتی ہیں اس کے اوپر ایک Overall (بالا پوش لبادہ) سا پہن لیا کریں تا کہ اس بات کی شناخت ہو سکے کہ یہ شریف عورتیں ہیں اور اس لیے یہ لوگ جن کے دلوں میں خباثت بھری ہوئی ہے وہ انہیں تنگ نہ کریں تو گویا یہ پہلا حکم آیا ہے۔ یہ جلباب اس قسم کی چیز ہوتی ہے جسے یہ Overall (بالا پوش لبادہ) کہتے ہیں۔ جیسے لباس کے اوپر یہ ڈاکٹر پہنتے ہیں' نرسیں پہنچتی ہیں جس سے اندر کے کپڑے چھپ جاتے ہیں اور اگر وہ زینت والے کپڑے ہوں تو وہ اس سے چھپ جاتے ہیں۔ وہ جو جلباب ہوتا ہے وہ عام طور پہ سفید رنگ کا سادہ سا بالا پوش ہوتا ہے۔ یہ جلباب کی قسم کی ایک چیز تھی۔ انہیں کہا گیا کہ باہر نکلیں تو یہ پہن لیا کریں تا کہ یہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم پہچان نہیں سکے کہ یہ شریف عورتیں ہیں یا اس قماش کی عورتیں ہیں۔ متمیز ہونے کے لیے یہ ایک نشانی کے طور پہ ایک چیز کہی گئی تھی کہ ان سے کہو کہ یہ پہن کر باہر نکلیں تا کہ وہ خبیث لوگ اس آڑ میں انہیں تنگ نہ کریں کہ ہم پہچان نہیں سکے کہ یہ شریف زادیاں ہیں۔ اور اگلی آیت میں یہ ہے کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے۔ پہلے دیکھیے کہ شروع ہی میں' پہلی ہی آیت کے اندر' زنا کو جرم قرار دیا گیا۔ دوسری آیت کے اندر تہمت تراشی کو جرم قرار دیا گیا۔ یہاں شریف زادیوں کے ساتھ چھیڑ خانی کرنا' ان کو تنگ کرنا' فقرے چست کرنا آیا ہے۔ یہ اس چیز کے متعلق کہا ہے۔

بدقماش افراد کی سزا

عزیزان من! پھر احتیاط برتنے کے لیے کہا کہ **لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ** (33:60)۔ اس قسم کی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے باوجود اگر یہ منافق' یہ خبیث' یہ بدکردار لوگ کہ جن کے دلوں کے اندر مرض ہے' یہ شہر میں ایسی خبریں پھیلانے والے ہیں جن سے خواہ مخواہ اضطراب پیدا ہو جائے۔ [1] اس پہ بھی باز نہ آئیں' تو اپنی طرف سے تو اتنا ہی کیا جا سکتا تھا کہ وہ جوان کی ایک سپر تھی' ایک آڑ تھی کہ ہم پہچان نہیں سکتے کہ یہ شریف عورتیں ہیں' یا اس قماش کی عورتیں ہیں' اسے توڑنے کے لیے جلباب پہننے کی وہ تدبیر اختیار کر لی۔ کہا کہ اس کے باوجود اگر یہ اس سے باز نہ آئیں تو آپ دیکھیے مملکت کے متعلق

---

[1] الارجیف. فتنوں کو بیدار کرنے والی' بے حقیقت' اضطراب انگیز خبریں۔ اس سے فعل اَرْجَفَ آتا ہے۔ اَلْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ (30:60) شہر میں ایسی خبریں پھیلانے والے لوگ جن سے خواہ مخواہ اضطراب پیدا ہو جائے (تاج العروس اور محیط المحیط)۔ مزید تشریح کے لیے دیکھئے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1960' ص۔ 734۔

کہا گیا ہے کہ لَنُغۡرِيَنَّكَ بِهِمۡ (33:60) تو ان کے خلاف پھر قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ اسے جرم قرار دیا گیا۔ پھر کہا کہ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوۡنَكَ فِيۡهَاۤ اِلَّا قَلِيۡلًا (33:60) جرم کی سزا یہ ہے کہ ان کو شہر بدر کر دیا جائے' ان کو نکال باہر کیا جائے تا کہ یہ اس قسم کی مخلوط آبادی رہے ہی نہیں۔ مَّلۡعُوۡنِيۡنَ (33:61)۔ ہمارے ہاں تو معلون لعنت کے معنی ہوتا ہے کہ پھر ملعون ہو جائیں یہ لعنت برسائی جائے۔ قانونی اعتبار سے کہتے ہیں کہ جتنے بھی یہ شہریت کے حقوق ہوتے ہیں انہیں ان سے محروم کر دینا۔ یہ جسے حقوق شہریت کہا جاتا ہے' ان سے محروم کرنے کا نام لعنت ہے۔ ملعون اسے کہتے ہیں کہ جو اس قسم کی مراعات جو شہریت کی قانوناً ہیں ان سے محروم کر دیا جائے۔ وہ معلونین ہو گئے۔ اور کہا کہ اس کے باوجود یہ باز نہ آئیں تو اَيۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا اُخِذُوۡا (33:61) یہ وہ ہے جسے بلا ضمانت وارنٹ کہتے ہیں کہ جہاں بھی یہ پائے جائیں ان کو گرفتار کر لیا جائے اور اگر ان تدابیر کے باوجود یہ اس سے پھر بھی باز نہ آئیں وَ قُتِّلُوۡا تَقۡتِيۡلًا (33:61) اس جرم کی سزا قتل ہے' موت سزا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ معاشرے کو شریفانہ خطوط پر استوار کرنے کے لیے قرآن کریم کس قسم کے ضوابط مہیا کرتا ہے' اس مسئلے کی کتنی اہمیت ہے اور ہے ہی یہ معاشرے میں ایسا اہم مسئلہ۔ اگر عورت کا احترام باقی نہیں رہتا' تو یاد رکھیے! وہ معاشرہ کبھی پائندہ و زندہ نہیں رہ سکتا' عروج پہ نہیں جا سکتا۔ عورت کا احترام بڑی چیز ہے اور آپ شروع سے آخر تک دیکھیں گے کہ قرآن کریم اس احترام کو کن کن شکلوں کے اندر برقرار رکھتا ہے اور مستحکم کرتا چلا جاتا ہے۔ اس وقت میرے سامنے موضوع یہ نہیں کہ قرآن کی رو سے عورت کا مقام کیا ہے اور اس کے بعد آپ کے ہاں جسے مروجہ شریعت کہتے ہیں اس میں عورت کو کیا بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ جتنے بھی اسباب زوال امت آپ ڈھونڈتے پھرتے ہیں ان اسباب میں بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں پوری تاریخ کے اندر عورت کا احترام تو ایک طرف رہا' اُسے انسانیت کا مقام بھی نہیں دیا گیا۔ میری بہنیں اور بیٹیاں معارف رکھیں۔ ان کو ایک اور جنس تصور کر لیا گیا ہے: مرد کی خواہشات کی تسکین کا ایک ذریعہ اور یہ بیشتر تباہیاں جو اس قوم کے اوپر آئی ہیں وہ اس وجہ سے بھی آئی ہیں کہ انہوں نے اس احترام کو چھوڑ دیا۔ اب یہ دیکھیے کہ قرآن کریم کی تین چیزیں تو ابھی تک ہمارے سامنے آ گئیں: زنا کا جرم ہے' بہتان تراشی کا جرم ہے' اور شریف زادیوں کے ساتھ چھیڑ خانی کرنا بڑا جرم ہے۔ ان تمام اقدامات کے باوجود آپ دیکھیے کہ یہ جو شریف زادیوں کے ساتھ چھیڑ خانی کا جرم ہے اس کی کتنی سزائیں قرآن دے رہا ہے۔ حقوقِ شہریت سے محرومی' شہر بدر کر دینا' اس پہ بھی باز نہ آئیں تو ان کے بلا ضمانت وارنٹ گرفتاری Issue (جاری) کر دینا' جہاں پائیں' اَيۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا اُخِذُوۡا (33:61) جہاں کہیں وہ ملیں' گرفتار کر لینا اور اگر یہ جرم ثابت ہو جائے اور وہ بہ تکرار اس جرم کے مرتکب رہیں تو پھر وَ قُتِّلُوۡا تَقۡتِيۡلًا (33:61) اس کی سزا موت تجویز کی گئی ہے۔

یہ قوانین شروع سے سنت اللہ رہے ہیں

قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ کوئی نئے احکام نہیں ہیں جو ہم اسی زمانے میں دے رہے ہیں یہ تو سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ (33:62) خدا کی ایک غیر متبدل روش ہے' سنت اللہ ہے' جو آج نہیں' شروع سے چلی آ رہی ہے۔ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا (33:62) اور تو سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ تو گویا یہ احکام وضوابط وہ ہیں جو صرف عربی معاشرے میں ظہورِ قرآن کے بعد نہیں دیئے گئے۔ دین میں عورت کے مقام اور احترام کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ قرآن میں' خدا کہتا ہے کہ ہم شروع سے یہ ضوابط دیتے چلے آ رہے ہیں' ہر قوم میں ہم نے یہ ضوابط دیئے تھے اور یہ ان اقدار میں سے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ سنت اللہ اقدار خداوندی کو کہا جائے گا۔ یاد رکھیے! کلمت اللہ کے متعلق بھی تو یہی کہا ہے کہ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ[1]. (6:115)۔ اقدار خداوندی کو کلمات اللہ بھی کہا ہے اور سنت اللہ بھی۔

سنت اللہ اور "کلمت اللہ" میں سنت اور کلمہ کا مفہوم

سنت اللہ اور کلمات اللہ دو چیزیں ہیں۔ ضمناً عرض کر دوں کہ کلمہ in writing (تحریری) قانون ہوتا ہے۔ جب تک وہ قانون لکھا ہوا رہتا ہے اسے کلمہ کہا جاتا ہے۔ اور جب اس قانون کا اطلاق ہوتا ہے' یعنی وہ قانون کسی پر Apply (استعمال) ہوتا ہے تو وہ سنت کہلاتا ہے۔ یہ وہ قانون ہے جس کو ہم شروع سے Apply (استعمال) کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے لیے کہا ہے کہ تو اس میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ آپ غور فرما رہے ہیں کہ اس مسئلے کو قرآن کی رو سے کتنی اہمیت حاصل ہے مگر ہم نے اسے مذاق بنا رکھا ہے اور اس کی سزا بھی بھگت رہے ہیں۔

یہ سنت اللہ کوئی کم قدر (Value) نہیں ہے' یہ خدا کی غیر متبدل سنت ہے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ نہ پہلے اس نے تبدیلی کی ہے' نہ اب کرتا ہے' نہ اس کے بعد کرے گا۔ سوسائٹی میں یا معاشرے میں جو' اس جرم کی سزا ہے' وہ تو ایک طرف رہی' آگے چل کر وہ آتا ہے کہ یہ تو چونکہ اقدار خداوندی میں سے ایک چیز ہے' اس لیے اس کی خلاف ورزی معاشرے کا بھی جرم ہے' سوسائٹی میں بھی اس کی سزا ملے گی اور اس کے بعد انسانی ذات پر جو اس کا اثر مرتب ہوتا ہے' اس کی سزا جسے قرآن کریم میں اُخروی سزا کہا جاتا ہے وہ بھی اس کے ساتھ ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ اس مسئلے کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ اب ایک تو یہ سنت اللہ ہے اور ایک ہمارے معاشرے کے

---

[1] اس قرآن میں خدا کا ضابطہ قوانین' تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مکمل ہو چکا ہے۔ اب ان قوانینِ خداوندی میں کوئی تغیر و تبدل کرنے والا نہیں۔ یعنی یہ ایسا مکمل ہے کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں' اور محکم ایسا کہ اس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن' ص۔ 317,318)

اندر، ہماری ایک سنت آج کل جاری ہے، جس سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہو کیا رہا ہے اور پھر ہم رو رہے ہیں۔ ذہن کبھی اس طرف جاتا ہی نہیں ہے کہ ہماری تباہیوں، ہلاکتوں، زوال کے اسباب میں سے ایک سب سے بنیادی سبب یہ ہے، جسے قرآن نے جنسی اختلاط کہا ہے۔ آج دنیا کے محققین بھی اس نتیجے پہ پہنچ رہے ہیں کہ جنسی بے راہ روی کا اثر انسانوں کی دنیا کے زوال کا باعث بنتا ہے۔

ہماری تو ہزار برس سے یہی حالت ہے

عزیزان من! جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ وضاحت سے کہا تھا کہ انون ❶ (J.D.Unwin) کا کہنا یہ ہے کہ وہ قوم جس میں جنسی روابط پر پابندیاں عائد نہیں ہوتیں، وہ زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک کے لیے زندہ رہ سکتی ہے۔ اس نے اس کی مدتِ حیات کا ایک سو سال تک کا عرصہ گنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس قوم کے اندر جنسی روابط پر حدود و قیود متعین نہیں کی جاتیں، اس کو اس طرح کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے، وہ قوم تین نسل تک تو زندہ رہ سکتی ہے، اس کے بعد ختم ہو جاتی ہے، زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ ہم تو ہزار برس سے اسی طرح سے چلے آ رہے ہیں۔ عزیزان من! کسی چیز کا یہ نام رکھ لینا کہ صاحب! شریعت نے یہ اجازت دی ہے تو اس سے وہ حقیقت نہیں بدل سکتی۔ آج بھی یہ کہتے ہیں کہ قانون نے اپنے ہاں اجازت دی ہے۔ انہوں نے بھی اس قسم کے قوانین بنا رکھے ہیں۔ انتہائی چیز یہ ہے کہ اب جو زنا ہے وہ کوئی جرم ہی نہیں رہا، وہ قانوناً جائز ہو گیا ہوا ہے، مگر قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ کسی چیز کے متعلق یہ کہہ دینا کہ وہ قانوناً جائز ہو گئی ہے، یہ صحیح نہیں ہے حالانکہ اگر وہ مضر ہے تو وہ مضر ہی ہو گی، جو اس کا نقصان ہے وہ اس لیے نقصان نہیں ہے کہ سوسائٹی کی رو سے وہ ٹھیک ہے، جرم نہیں رہا۔ سنت اللہ کی رو سے تو وہ اسی قسم کا جرم ہے۔ وہ تو اپنے نتائج برآمد کر کے رہے گا اس لیے کہا کہ **لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا** (33:62) تو خدا کے قانون میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پائے گا۔ سنکھیا ہلاکت آفرین ہے۔ ٹھیک ہے۔ تھوڑا تھوڑا کھا کر اس کی عادت ڈال لیجیے کہ نہیں صاحب! کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس علم کے جاننے والے سے، طبیب سے، ڈاکٹر سے، پوچھیے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ ہم تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ رات اچھا بھلا سویا تھا، پتہ نہیں کیا ہو گیا، سوتے میں ہی مر گیا۔ یہ اس سنکھیے کا زہر تھا جو دھیرے دھیرے اسے متاثر کرتا رہا اور آخر وہ مر گیا۔ یاد رکھیے! وہ سنت اللہ تو کبھی نہیں بدلتی۔

یہاں بات آ رہی تھی کہ جو تہمت تراش ہیں، اگر ان میں سے **اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** ❷ (24:5) کوئی اپنے کیے پر نادم ہو کہ اس سے غلطی سے یا سہواً یہ لغزش ہو گئی، اس کے بعد اس کو ندامت ہو، اس کا

---

❶ J.D. Unwin کی اس کتاب کا حوالہ یہ ہے: Unwin, J.D. (1934) Sex and Culture London: Oxford University Press.

❷ ہاں اگر یہ لوگ اس کے بعد اپنی اس روش سے باز آ جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو پھر انہیں معاف کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ قانون خداوندی میں، توبہ و اصلاح کے بعد، عفو اور درگزر کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ (اس سے اتفاقی مجرم سزا سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے اور وہ سامان نشو و نما سے بھی محروم نہیں رہتا)۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 794 تا 795)

احساس ہو کہ غلطی ہوگئی اور اس کے بعد یہ ہے کہ واصلحو (24:5) اس کی اگلی زندگی کے اوپر نگاہ رکھو کہ وہ اپنی اصلاح کرتا ہے تو پھر اس جرم کی معافی ہوسکتی ہے لیکن قرآن کا اگلا ٹکڑا پھر اور آگے بڑھا۔ یہ تو تھا کہ غیر عورتوں کے خلاف کوئی بہتان تراشی کرے۔ اب اگر کوئی اپنی بیویوں کے خلاف تہمت لگائے تو پھر؟

غیر عورتوں کے بعد اپنی بیوی کے متعلق تہمت تراشی کے متعلق احکام

عزیزان من! اپنی بیوی کے متعلق تہمت تراشی کے متعلق بھی قرآن کہتا ہے کہ وَ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَھُمْ وَ لَمْ یَکُنْ لَّھُمْ شُھَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُھُمْ فَشَھَادَۃُ اَحَدِھِمْ اَرْبَعُ شَھٰدٰتٍ م بِاللّٰہِ لا اِنَّہٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ❶ (24:6)۔ ایسے ہی نہیں کہ جب جی چاہے اٹھے اور اس کے متعلق کچھ کہہ دیا۔ میزان خداوندی میں اس کی حرمت کا بھی تقاضا ہے۔ قرآن اس کو بھی محفوظ رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لیے بھی شہادت ہونی چاہیے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر شہادت نہیں ہے تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کے لیے کہا ہے کہ وہ چار گواہوں کی بجائے چار دفعہ قسم اٹھائے۔ وَ الْخَامِسَۃُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰہِ عَلَیْہِ اِنْ کَانَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ ❷ (24:7)۔ اور پانچویں دفعہ یہ کہے کہ اگر میں جھوٹ بولوں، ثابت ہو جائے کہ میں نے یہ جھوٹ کہا تھا تو پھر وہی لعنت اللہ ہو یعنی وہ تمام مراعات جو شہریت کی رو سے مملکت میں حاصل ہوتی ہیں، مجھے ان تمام سے محروم کر دیا جائے۔ یہ تو ہوا خاوند کے متعلق۔ اب اگر ایک خاوند چار دفعہ قرآن بھی اٹھالیتا ہے، قسم بھی کھالیتا ہے، یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ اگر جھوٹا ثابت ہو جائے تو یہ کچھ میرے ساتھ بھی ہو تو پھر وہ جو بیوی ہے وہ تو ماری گئی، اس سے وہ بیوی مجرم قرار پا گئی۔ اس پر قرآن کہتا ہے کہ پھر بیوی کو بھی صفائی کا موقعہ دیا جائے گا. وَ یَدْرَؤُا عَنْھَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْھَدَ اَرْبَعَ شَھٰدٰتٍ م بِاللّٰہِ لا اِنَّہٗ لَمِنَ الْکٰذِبِیْنَ o وَ الْخَامِسَۃَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰہِ عَلَیْھَآ اِنْ کَانَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ❸ (24:8-9)۔ آپ یہ دیکھیے کہ یہ مقدمہ ایسا ہے جس میں کوئی گواہی نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اسی طرح وہ عورت بھی چار دفعہ قسم اٹھائے۔ پانچویں مرتبہ وہ بھی وہاں وہی بات دہرائے کہ اگر وہ مرد سچا ہے تو مجھ پر بھی اللہ کا غضب ہو مجھے اس حلف دروغ گوئی کی سزا ملے۔ اگر وہ یہ کہے گی تو پھر اس کو مجرم نہیں قرار دیا جائے گا۔

---

❶ جو لوگ خود اپنی بیویوں کے خلاف تہمت لگائیں اور ان کے پاس سوائے اپنے آپ کے اور کوئی گواہ نہ ہو تو ایسے معاملے میں یوں فیصلہ کیا جائے کہ مرد چار بار اللہ کو حاضر و ناظر جان کر گواہی دے کہ وہ سچ کہتا ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔795)

❷ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر میں نے جھوٹ بولا ہو تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو (یعنی میں ان تمام حقوق و مفادات سے محروم کر دیا جاؤں جو مجھے مملکت خداوندی (اسلامی حکومت) کا شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں)۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔795)

❸ وہ عورت اسی طرح خدا کو حاضر و ناظر جان کر گواہی دے کہ وہ مرد جھوٹ بولتا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر وہ سچا ہے تو مجھ پر اللہ کا غضب ہو (یعنی مجھے اس حلف دروغ گوئی کی سزا ملے۔ تو اس سے وہ بری الذمہ ہو جائے گی)۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔795)

یہ جرم کی بات ہورہی ہے۔ظاہر ہے کہ اس کے بعد میاں بیوی کے وہ تعلقات تو رہ ہی نہیں سکتے' پھران کی Separation (علیحدگی) ہوجائے۔وہ چاہیں تو جسے کہتے ہیں کہ طلاق ہوجائے' نکاح کا عقد فسخ کردیا جائے۔جب طلاق کے قوانین آئیں گے تو میں عرض کرونگا کہ یہ بھی طلاق نہیں ہے کہ گھر بیٹھے ہوئے' نیلام کرنے کی بولی کی طرح ون ٹو تھری کہا' ایک دو تین کہا' اور وہ بیوی گھر چلی گئی یعنی اسے طلاق ہوگئی اور بیوی بچوں کو لے کر چلی گئی کیونکہ میاں صاحب کو غصہ آیا تھا اور اس نے یہ کچھ کہہ دیا تھا۔دوسرے دن جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو روتے پھرتے ہیں کہ یہ کیا ہوا۔وہ ایک اور الگ ہی بات ہے۔گھریلو زندگی پر قرآن کریم نے احکامات دیئے ہیں انہیں سامنے رکھنا ہوگا۔

گھریلو زندگی کے متعلق احکامات کی اہمیت

گھریلو زندگی کے معاملات کے متعلق قرآن نے جو احکام دیئے ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ مثلاً اگر احکام کی آیات سو ہیں تو ان میں پچھتر (75) آیات ایسی ہیں جو گھریلو زندگی کے متعلق ہیں۔قرآن نے انسان کی گھر کی زندگی کو اتنی اہمیت دی ہے۔جسے معاشرہ کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ جیسے میں نے کہا ہے کہ جب افراد رات کو گھر کے اندر آجاتے ہیں تو وہ گھریلو زندگی ہوتی ہے' صبح کو گھر سے باہر نکل جاتے ہیں تو وہ معاشرہ بن جاتا ہے۔معاشرہ کہیں باہر سے نہیں آتا۔یہ تو ہوتا ہی نہیں کہ ہم اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں اور باہر سے لوگ آکر شہر میں بسیں اور اس کو معاشرہ کہہ دیں۔وہ ہم ہی یہاں گھر میں الگ الگ ہوتے ہیں۔معاشرہ تو عشر سے ہے۔یعنی ایک کے ساتھ جو زیرو (Zero) لگتا ہے تو پھر وہ دس بن جاتے ہیں۔یہی عشر ہے۔اسی سے معاشرہ ہے۔اس طرح جب گھر سے باہر نکل کر ایک کے ساتھ دوسرا ملتا ہے تو یہ جو وہاں ملتے ہیں اس کے لیے سوشل سوسائٹی کے الفاظ آئے ہیں۔یہی عربی زبان کے یا قرآن کے لفظ عشر سے معاشرہ بن جاتا ہے۔

گھر کی زندگی اگر پرسکون ہے' جنت کی زندگی ہے' تو معاشرہ جنتی بن جاتا ہے' ورنہ گھروں کی زندگی جہنم کی زندگی ہے۔جو شخص گھر کی زندگی سے اس طرح جہنمی انداز سے نکلتا ہے' اسے باہر جا کر کہیں سکون میسر نہیں آسکتا ہے ''بجز اس کے کہ اگر سوٹے باز ہووے' تے نشہ ای کرن لگ پوے [1] ''۔وہ تو اپنے آپ کو دھوکا دینے والی بات ہے۔یہ فریب نفس ہے۔سکون تو اطمینانِ قلب کا نام ہے۔اس صورت میں گھر کی وہ زندگی تو نہیں مل سکتی۔قرآن نے کہا ہے کہ جس طریق سے ہم کہتے ہیں' ویسے رہو' خدا تمہیں جنت کی طرف بلاتا ہے۔گھر کی زندگی کے متعلق قرآن کے یہ الفاظ ہیں۔اس لیے یہ جو گھر کی زندگی ہے' قرآن کریم کے بکثرت احکام اسی کے متعلق ہیں کہ وہ زندگی اگر جنت کی زندگی بن جائے تو اس کے بعد تو معاشرہ خود جنتی بن جاتا ہے اسی لیے کہا کہ اے جماعت مومنین! **وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ**

---

[1] سوائے اس کے کہ اگر وہ کہیں نشہ کرنے والا ہے تو نشے میں مزید غرق رہنا شروع کردے گا۔

عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ (24:10) یہ جو اس قسم کی ہدایات دیں' ضوابط دیئے قوانین دیئے' یہ خدا کا فضل اور رحمت ہے کہ اس نے اپنے قوانین میں عفو و درگزر اور نرمی کی گنجائش رکھ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اپنی خطا اور لغزش کے احساس کے بعد اپنی غلط روش کو چھوڑ کر قانون خداوندی کی طرف رجوع کرتا ہے' تو وہ قانون اپنی تمام مراعات کو لیے اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اس کی طرح رخ کرتا ہے اور یہ چیز عین حکمت کے مطابق ہے۔ قانون سے مقصد فرد کی اصلاح اور معاشرہ کی سلامتی ہے۔ اگر یہ مقصد عفو اور درگزر سے حاصل ہو سکتا ہے تو سزا بالضرور دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

آپس میں نباہ نہ ہونے کی صورت میں علیحدگی کے احکام

عزیزان من! قانون خداوندی میں یہ گنجائش رکھی ہے کہ اگر ایسا امکان ہو کہ کوئی گواہ نہیں مل رہا اور صورت یہ ہے کہ گھر کی میاں بیوی کی زندگی اس قسم کی ہو چکی ہے کہ نباہ کی کوئی شکل نہیں ہے' تو اس میں Separation (علیحدگی) کے لیے بھی احکام دیئے گئے ہیں۔ اس کے لیے کہا کہ قانون کی زنجیریں ہم نے اتنی سخت نہیں بنائیں کہ جکڑ بندی ہو جائے اور تم آپس کے روابط میں سے نکل ہی نہ سکو۔ قرآن کریم نے اس قسم کی چیزیں رکھ دی ہیں۔ یہ اللہ کا خاص فضل ہے کہ تمہارے لیے قانون میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ تمہاری نشوونما رکنے نہ پائے' ورنہ جکڑ بندی کے اندر تو نشوونما رک جاتی ہے۔ اگر کسی بھی قسم کی ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں کہ جن میں انسان کی جائز آزادیاں سلب ہو جائیں تو اس کی ذات کی نشوونما' اس کی فکر کی نشوونما' اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما' رک جاتی ہے۔ قرآن کریم نے قوانین کے ساتھ اس قسم کی گنجائشیں رکھی ہیں کہ اگر اپنے جرم کا احساس ہو گیا ہے' اس کے اوپر ندامت ہے' اس کے بعد اصلاح کے لیے اس کا عزم ہے' اسے کہا گیا ہے کہ اس کو گنجائش کا موقعہ دے کر دیکھ لیجیے کہ آیا واقعی اپنی اصلاح کرتا ہے۔ ہمارا مقصد تو اصلاح ہے' نہ کہ انتقام لینا۔ قرآن دوسری جگہ کہتا ہے' اور عزیزان من! اس کے بعد چند آیات آتی ہیں۔ آپ ان آیات کو یوں پڑھ جایئے لیکن جب میں ان کی وہ تشریح کرونگا جو کتب احادیث کے اندر آئی ہیں تو جگر پھٹ جائے گا۔ قرآن نے بات تو صرف اتنی سی کہی ہے۔ پہلے تو سیدھی سیدھی آیات سامنے آتی ہیں کہ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ (24:11) تم میں بعض شریف زادیوں کے خلاف تہمت تراش لائے۔ تہمت تراشی جرم ہے۔

تہمت تراشی کے سلسلہ میں ایک واقعہ

اس سلسلہ میں ایک واقعہ ہوا ہے۔ افک کے معنی ہیں ''تہمت تراشی' افتراء' کذب' جھوٹ'' چنانچہ کہا کہ وہ تم میں سے ہی کچھ لوگ تھے جنہوں نے کسی عورت کے خلاف تہمت لگائی تھی۔ یہاں اسی ضمن میں یہ قصہ چلا آ رہا ہے اور قرآن نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ ابھی بات سامنے آتی ہے۔ اس واقعہ میں بھی بڑی اہم چیزیں اور بڑی اصولی ہدایات ہیں۔ قرآن واقعات ایسے ہی بیان نہیں کرتا' نہ ہی وہ

اقوامِ سابقہ کی داستانیں' یونہی داستانوں کی غرض سے' بیان کرتا ہے۔ وہ واقعات بیان کرے یا اقوام کی سرگزشتیں بیان کرے' ان میں ایک بنیادی اصول ہوتا ہے' ہدایت ہوتی ہے جس کے لیے وہ داستان یا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ اس کے اندر نہ تو اس عورت کا نام ہے جس کے خلاف وہ تہمت تراشی کی گئی' نہ ان مردوں کا نام ہے جنہوں نے اس تہمت تراشی میں حصہ لیا۔ قرآن کو اس سے واسطہ ہی نہیں تھا۔ اس نے تو ایک واقعہ' جو وہاں ہوا ہے' اس کو بیان کیا ہے۔ اس میں جو اصولی ہدایت ہے اس کی غرض سے یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت اتنی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس میں کوئی نام نہیں ہے۔ تم میں ایک واقعہ ہوا تھا اور تم نے دیکھا کہ کس طرح کچھ لوگوں نے ایک تہمت تراشی اور لے اڑے۔ ٹھیک ہے۔ واقعہ ہوا' اس میں بہت شر کے پہلو تھے لیکن ہم نے جو ہدایات تمہیں دی ہیں ان میں تم دیکھو گے کہ **لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ** (24:11) اس میں بھی تمہارے لیے ایک خیر کا پہلو نکل آیا ہے کہ ہم نے ایک واقعہ سامنے رکھ کر آپ کو کچھ ہدایات دیدیں جن سے معاشرے کی اصلاح کا پہلو نکل آئے اور ہر ایک کو معلوم ہو گیا کہ اس قسم کے واقعات میں افرادِ معاشرہ کو کیا کرنا چاہیے۔ **لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ** ❶ (24:11) جہاں تک اس جرم اور اس کی سزا کا تعلق ہے' وہ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے پہلے ہی بتا دی۔ **وَ الَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ** (24:11) اور جو اس جرم کا بانی مبانی ہے' اس کے لیے بڑی سزا ہو گی۔ وہ کیا ہے؟ تہمت تراشی کا یہ قانون تو پہلے دیدیا ہے۔ اگر یہ غلط ہو' افک ہو' افترا ہو' کذب ہو' جھوٹ ہو' تو اس کے لیے قرآن نے سزا تجویز کر دی ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ وہ بات جس کے لیے یہ کچھ دہرایا گیا ہے' وہ کیا ہے اور اس کی کتنی بڑی اہمیت ہے؟

بغیر کسی تحقیق کے بات کو پھیلاتے چلے جانا جرم ہے

عزیزانِ من! آج کل تو خاص طور پہ ہمارے ہاں اس کی اہمیت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ معاشرے میں ہو کیا رہا ہے؟ ''بھائی صاحب! کیا وہ سنا تم نے کچھ؟ ہمیں کوئی واسطہ تو ہے نہیں لیکن بہر حال ایک بات تھی تو میں نے پوچھ لیا کہ سنا آپ نے' فلاں کے متعلق وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا وہ ٹھیک ہے؟'' دفعہ کرو سانوں کی دوجیاں دے معاملے اچ۔ اسی کانوں دخل دیئیے؟ پر تو سنیانا بھئی! کچھ گلاں ہون ڈیاں ہے گیاں۔ دیکھو جی' کنی شریف زادی نظر اوندی سی پئی' تے وچوے دیکھوا ے کچھ نکلن ڈیا ہیگا۔ اے گل سی جہیڑی میں سنی' تے میں کیا' تسی کسے نال گل نئیں کرنی اگے۔ ❷ یہ ہمارے ہاں روز ہوتا ہے جس نے دس سنیں' بیس بنا کر دوسرے کو سنا دیں: ''سنا ہے تم نے بھئی!

---

❶ اب ان مجرمین میں سے ہر ایک کو اپنے کیے کی سزا ملے گی۔ (پرویز: مفہوم القرآن' ص۔796)

❷ جانے دو۔ ہمیں دوسروں کے معاملات سے کیا تعلق؟ لیکن کیا بھائی! آپ نے کچھ سنا کہ کیا کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ دیکھو جی' کتنی شریف زادی نظر آ رہی تھی در پردہ دیکھو تو کیا کچھ نکل رہا ہے۔ یہ تھی وہ بات جو میں نے سنی اور آپ کو سنا دی لیکن آپ اسے کسی سے نہ کہیے گا۔

پوچھو ہی نہیں، حد ہوگئی، بھئی کمال ہوگئی، بھئی! کتنے پاکباز نظر آتے تھے، دیکھیے ان کی صاحب اور کرتوتیں! حیرت ہے جو کسی نے کوئی تحقیق کی ہو، معلوم کیا ہو، تفتیش کی ہو۔ کچھ نہیں کیا۔ بات سنی، لے اڑے، اور اگر صبح سے کسی نے چار لفظوں کی ایک بات نکالی تو شام کو آپ دیکھیے کہ معاشرے میں، گلی گلی کوچے کوچے کس طرح پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں الزام اور جرم میں کچھ فرق نہیں کیا جاتا

عدالتوں کے قصے میں آگے بڑھیے۔ پہلے تو یہ کہ جو شخص بھی کسی گرفت میں آتا ہے تو اس کے خلاف مقدمہ درج ہوتا ہے۔ اس وقت وہ ملزم ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہی Accused (ملزم) ہیں، اس کے سر الزام ہوتا ہے ابھی جرم ثابت نہیں ہوا ہوتا۔ پھر عدالت میں تحقیق کرتے ہیں۔ اس کا پورا طریقہ یہ ہے کہ گواہ آتے ہیں، شہادتیں آتی ہیں، صفائی کا موقعہ ملتا ہے۔ اس کے بعد ہوسکتا ہے کہ پھر وہ مجرم ثابت ہو جائے۔ نوے فیصدی تو وہ ملزم بالکل بری ہو جاتے ہیں، ان کے خلاف جرم ثابت ہی نہیں ہوتا۔ ان میں سے صرف ۱۰ فیصد وہ ہوتے ہیں جن کے خلاف جرم ثابت ہوتا ہے تو پھر وہ مجرم ہوتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اس نے فلاں جرم کیا لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے؟ یہ جو وہاں ملزم ہے ابھی اس کی پہلی پیشی بھی نہیں ہوتی اور یہاں گھر گھر اس کو مجرم تصور کر لیا جاتا ہے یعنی سارے معاشرے میں شام تک اس کی اس قدر گھناؤنی پکچر پیش کر دی جاتی ہے کہ ہر شخص اسے مجرم سمجھنے لگ جاتا ہے۔

ہمارے ہاں الزام (Allegation) اور جرم (Crime) میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، ملزم (Accused) اور مجرم (Criminal) میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ جب وہ بات آخر عدالت میں پہنچتی ہے کہ اس پر کوئی الزام ثابت نہیں ہوا، اس سارے معاشرے کے اندر اس کا منہ کالا ہو چکا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عام روش یہ ہو چکی ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ ہے وہ اہمیت، جس کے لیے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ قرآن نے کہا کہ **لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا** (24:12)۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہارا آپس میں، دوسرے کے متعلق ظن، یعنی First Reaction (پہلا ردعمل)، نیک ہونا چاہیے۔ قرآن بڑی چیز کہہ گیا ہے۔ بات سنی تو کہا کہ نہیں میاں! تحقیق تو ہونے دیجیے، ہوسکتا ہے کہ یہ غلط ہی ہو اور بظاہر تو وہ ایسے نظر نہیں آتے، ہمیں تو شریف آدمی نظر آتے ہیں، ذرا پتہ تو چلے، تحقیق تو ہو جائے۔ یہ پہلا ردعمل (First Reaction) ہونا چاہیے۔

کسی کے متعلق پہلا تاثر نیک ہونا چاہیے

قرآن نے پہلا اصول یہ دیا ہے کہ جب بھی کسی کے متعلق، کسی کے خلاف، کوئی بات تمہارے کانوں میں پڑے تو تمہارا First Reaction (پہلا ردعمل) یہ ہونا چاہیے کہ جب تم نے اس بات کو سنا تھا تو تم نے **ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا**

(24:12) مومن مردوں اور مومن عورتوں کا سا طرز عمل کیوں نہ اختیار کیا اور اپنے لوگوں کے متعلق حسن ظن سے کام کیوں نہ لیا۔ یہ حسن ظن نیک ہونا چاہیے (24:12)۔ اسی وقت تم اس کو مجرم نہ تصور کر لو اور دس اپنی طرف سے لگا کر آگے نہ پیش کرو۔ وَ قَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (24:12) تمہیں کہنا یہ چاہیے تھا کہ یہ بات تو بڑی جھوٹی سی نظر آتی ہے' بنائی ہوئی نظر آتی ہے' افترا نظر آتا ہے۔ سوچیے اگر معاشرے کے اندر اتنی سی چیز ہو جائے تو معاشرہ کس قدر تباہیوں سے بچ جائے۔ وہ ملزم جو آخر میں ملزم ہی ثابت ہو' مجرم نہیں ثابت ہوا' اس کے بعد جب وہ پیچھے آئے گا تو جس جس نے اس کے خلاف کچھ اس قسم کی چیزیں اڑائی ہونگی آپ دیکھیے کہ پھر ان کے تعلقات کس قسم کے ہونگے۔ ایک فرد کے نہیں' پورے خاندانوں کے تعلقات میں کس قدر کشیدگی پیدا ہوگی۔ علاوہ بریں ایک بے گناہ ملزم کے متعلق اپنے دل میں ہی اس قسم کے خیالات انسان کی اپنی فطرت ہی کو کس قدر مسخ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے چھوٹ کے بھی آ جائے تو چونکہ یہ بات انہوں نے اس طرح بڑھا کے کہی ہوئی تھی تو اس کے بعد بھی وہ یہی کہے چلے جاتے ہیں کہ جی! کیا پتہ ہے رشوتاں چلدیاں نیں' فرمائشاں چلدیاں نیں' پتہ کی کچھ ہویا ہیگا۔ [1] یعنی وہ عدالت تو اس کو پھر بھی مجرم نہیں قرار دیتی' معاشرے کے یہ افراد بدستور اسے مجرم قرار دیئے چلے جا رہے ہیں' حالانکہ قرآن نے کہا تھا' مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہوتے ہیں۔

خاندانوں تک میں دشمنی

دوسروں کے متعلق بغیر تحقیق کیے کچھ کہہ دینے سے خاندانوں تک دشمنی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ پہلی چیز تو قرآن نے یہ کہی کہ تمہارے ہاں ایک واقعہ ہوا ہے بس اتنی سی بات ہے۔ ہم اس لیے اسے بیان کرتے ہیں کہ ہم نے اس ضمن میں کچھ اصول دینے ہیں اور پہلا اصول یہ ہے کہ جب بھی کسی کے متعلق کوئی بات آئے' تمہارا First Reaction (پہلا تاثر) جسے یہ ظن کہتے ہیں' یہ ہونا چاہیے کہ نہیں نہیں' اس کے متعلق پتہ نہیں' تحقیق ہونے دیجیے لیکن ہم تو سمجھتے ہیں کہ شریف آدمی ہے' شاید یہ جو کچھ کہا گیا ہے غلط ہو۔ اس طرح اس کے متعلق تمہارا پہلا تاثر (First Reaction) ہمیشہ نیک ہونا چاہیے۔ اب اگلی بات یہ ہے کہ لَوْ لَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ [2] (24:13)۔ کہنا یہ چاہیے کہ صاحب! ہم تو ایسا سمجھتے ہیں لیکن معاملہ عدالت میں گیا ہے۔ یہ جو ایسا کہنے والا ہے' اس سے کہا جائے گا کہ عدالت میں جاؤ۔ قانون کی رو سے تمہیں چار گواہ لانے پڑیں گے کیونکہ قانون میں لکھا ہوا ہے کہ کسی کے خلاف تہمت تراشنے والے کے لیے ضروری ہے کہ چار گواہ پیش کرے۔ تو اسے کہنا چاہیے کہ بھئی!

---

[1] کیا معلوم کہ کیا کچھ ہوا ہوگا کیونکہ رشوت چلتی ہے' سفارش کا راج ہے۔

[2] جن لوگوں نے یہ الزام لگایا تھا ان پر واجب تھا کہ وہ اس الزام کے ثبوت میں چار گواہ پیش کرتے (24:4)۔ سو جب یہ لوگ گواہ نہیں لا سکے تو عدالت خداوندی کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن' ص۔796)

تم مجھ سے بات نہ کرو عدالت میں جاؤ' چار گواہ لاؤ۔ اگر لے آؤ گے تو ٹھیک ہے' ملزم مجرم ثابت ہو گیا اور اگر نہ لاسکو گے تو عدالت تمہیں مجرم قرار دے گی اور سزا بھی دے گی اور تم عدالتِ خداوندی کے نزدیک جھوٹے ہو گے۔ اس لیے تمہارا پہلا Reaction (ردعمل) یہ ہونا چاہیے۔

اس قسم کی تشہیر کو روکنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے

عزیزان من! اس کے بعد قرآن نے کہا کہ **وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ** (24:14) اگر ہم اس معاملہ کی روک تھام کا انتظام نہ کرتے اور معاشرے میں اس قسم کی چیزیں عام ہونے دیتے تو تم پر تباہی آ جاتی۔ یہاں اس آیت میں لفظ **اَفَضْتُمْ** (24:14) آیا ہے یعنی یہ چیزیں معاشرے میں سیلاب کی طرح بہتی چلی جاتیں تو تم پہ تباہی آ جاتی' تمہارا معاشرہ تباہ ہو جاتا۔ اگر معاشرے میں افواہیں بلا کسی قسم کی تصدیق اور توثیق کے جرائم کی پوزیشن اختیار کر لیں تو عزیزان من! اس کے انجام و عواقب کے لیے اپنے معاشرے کی گزشتہ تیس (۳۰) سال [1] کی تاریخ پر غور کیجیے ہمارے ہاں کسی کو بلیک میل کرنے' کسی شخص کے خلاف کوئی چیز کرنے کی ایک ایسی مستقل تکنیک اختیار کر رکھی ہے کہ وہ کسی کی گرفت میں بھی نہ آئیں۔ اور عزت بھی کھو بیٹھیں' اخبار میں کچھ لکھ دیجیے تو وہ ازالہ کا دعویٰ کر دیتا ہے' کیونکہ اس کا ثبوت ہوتا ہے مگر اس تکنیک میں تو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ صبح اٹھے تو تکنیک یہ ہے' کہ نکل گئے' دس آدمی اُدھر ملے ایک ادھر ملا اور اس کے متعلق یہ بات کر دی: ''وہ دیکھا صاحب! وہ وہاں کتنا اس کے خلاف ہے''۔ اور پھر ادھر چلے گئے: ''صاحب! سنا آپ نے اس کے خلاف کتنا غبن نکلا''۔ سننے والا کبھی نہیں کہتا کہ کیا ''اس کا کوئی ثبوت بھی تمہارے پاس ہے''؟ کچھ نہیں۔ وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ اس نے آگے دس سے کہا۔ آگے شام تک اس چیز کی اتنی تشہیر ہو گئی کہ وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں۔ یہ اس دور میں پروپیگنڈے کی ایک بڑی اہم تکنیک ہو گئی ہے۔ قرآن نے اس سے روکا ہے کہ جب بھی کوئی شخص کسی کے خلاف کوئی بات تم سے آ کر کہے' اس سے کہو کہ بھئی! میں تو جب تک جرم ثابت نہ ہو' ماننے کو تیار نہیں' میں تو اس کو شریف آدمی سمجھونگا۔ تم یہ کہتے ہو تو عدالت پڑی ہوئی ہے' وہاں جاؤ' قاعدے کے مطابق وہاں Proceed کرو' وہاں گواہ پیش کرو' وہاں سے بات ثابت ہو جائے گی تو مجرم ثابت ہو جائے گا۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ خوامخواہ اس کی تشہیر کرتا پھروں۔ یہ ہے وہ چیز جس کے لیے قرآن نے اس واقعہ کا بیان کرنا ضروری سمجھا۔

---

[1] یاد رہے کہ یہ بات اکتوبر 1977ء کی 21 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

تحقیق کیے بغیر کسی بات کو آگے بڑھا دینا بہت بڑا جرم ہے

اس سلسے میں قرآنِ کریم نے کہا کہ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَ تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ❶ (24:15)۔ یہاں کہا کہ بات تم تک آئی۔ تمہیں اس کا کوئی علم نہیں، تم نے کوئی تحقیق نہیں کی، تم نے کوئی تفتیش نہیں کی، اور اسے لے اڑے۔ تم نے یہ بالکل معمولی بات سمجھی حالانکہ وَ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (24:15) قانون خداوندی کی رو سے یہ بات بڑی اہم تھی۔ بہت بڑا جرم ہے جسے معمولی بات سمجھ رہے ہو۔ آپ غور فرماتے جا رہے ہیں، عزیزان من! کہ قرآن نے بغیر نام لیے کسی کا یہ ایک واقعہ کیوں بیان کیا ہے۔ نام لینے کا سوال ہی نہیں تھا وَ لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا (24:16) جب یہ پہلی دفعہ تمہارے پاس اس بات کو لے کر آیا، تمہارے کان میں یہ آواز پڑی، تو تم نے کیوں نہ اس سے یہ کہہ دیا کہ نہیں صاحب! ہم تو کسی سے اس کا ذکر نہیں کریں گے، اس لیے کہ ہم نے تحقیق نہیں کی، ہمیں اس کا تو علم نہیں ہے اور جب تک تحقیق کے بعد یہ ثابت نہ ہو جائے ہم اس چیز کو پھیلانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تم نے کیوں نہ اس سے کہہ دیا کہ تم اس قسم کی بات نہ کرو، تم عدالت میں جاؤ اور ہم تو اس بات کو آگے نہیں بڑھائیں گے۔ مجھ سے تم نے کہہ دیا کسی اور سے نہ کہنا۔ اس کے لیے تمہارا ردعمل یہ ہونا چاہیے تھا۔

اس مسئلہ کو بار بار نہایت وضاحت و تکرار کے ساتھ بیان کرنے کا مقصد

عزیزان من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کس قسم کی ہدایات دیتا چلا جا رہا ہے۔ کہیں معمولی سا اس دور میں ایک واقعہ ہے اس کا ذکر کر کے یہ مستقل ہدایات دیتا چلا جا رہا ہے۔ کہا کہ تمہیں کہنا چاہیے تھا کہ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (24:16) نہیں، یہ تو بہت بہتان نظر آتا ہے بہرحال یہ واقعہ تو گزر گیا لیکن يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (24:17) خدا تمہیں اس کی بابت اس شدت سے نصیحتیں، ہدایتیں، فہمائشیں دیتا ہے کہ دوبارہ کبھی ایسا نہ کرنا۔ اب اس واقعہ سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ اسے کیوں بیان کیا ہے، کیوں یہ ہدایات دی ہیں۔ اس لیے دی ہیں کہ دوبارہ ایسا نہ کرنا۔ پہلے تم کہہ سکتے تھے کہ خدا کی طرف سے ہمیں اس قسم کی ہدایات نہیں ملی تھیں تو یہ ہدایات اب مل گئیں۔ اس کے بعد پھر کبھی ایسا نہ کرنا۔ کبھی ایسا نہ کہنا۔ وَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (24:18) بات ہم نے بالکل واضح طور پر کہہ دی ہے کہ یہ نہ ہو کہ کہو کہ صاحب! وضاحت نہیں کی گئی، بات سمجھ نہیں آئی، اسی لیے ہم نے بار بار یہ سب کچھ کہہ دیا ہے کہ تمہارے پاس کہنے کی اتنی سی گنجائش بھی نہ رہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ

---

❶ حقیقت یہ ہے کہ تم نے اس معاملے کی اہمیت کا احساس ہی نہیں کیا۔ اسے یونہی معمولی بات سمجھتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم نے اس بات کو سنتے ہی زبانوں پر چڑھا لیا، اور اسے بلا تحقیق و تفتیش (17:36) آگے دہراتے چلے گئے۔ تم نے اسے معمولی بات سمجھ لیا حالانکہ قانون خداوندی کی رو سے یہ بات بڑی اہم تھی۔

اَلْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ❶ (24:19) اس قسم کی تہمتیں لگانا' اس قسم کی بے حیائی کی باتیں معاشرے میں پھیلاتے چلے جانا' کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ایسا کرنا بڑا جرم ہے۔ ایسا کرنے والوں کو اس دنیا کے اندر بھی معاشرے کے قانون کی رو سے سزا ملے گی اور خدا کے ہاں سے بھی اس کی سزا ملے گی۔ **وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ** (24:19) تم تو اس کو بہت معمولی بات سمجھتے ہو' تمہیں پتہ نہیں کہ معاشرے میں اس کا انجام' اس کے عواقب' اس کے نتائج' کیا ہوتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں کس قدر تباہی کا موجب ہوتی ہیں۔ تم اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ اس لیے ہم یہ ساری تعلیم اور یہ سارے ضوابط تمہیں دے رہے ہیں۔ **وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ** (24:20) حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا کا فضل و رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتے تو تم اس وقت سخت خطرے میں پڑ چکے ہوتے۔ وہ ان معاملات کے متعلق صحیح راہنمائی اس لیے دیتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ انسان یونہی بے خبری اور لاعلمی سے تباہ ہو جائے۔ وہ انسانوں کی حفاظت چاہتا ہے' تباہی نہیں۔ اس لیے' ہدایات کی وجہ سے ان چیزوں کو روک دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم تباہ ہو گئے ہوتے۔

واقعہ افک کے سلسلہ میں قرآن نے اپنے ہاں کسی خاتون کا نام نہیں لیا

عزیزان من! بیسویں آیت تک ہم آ گئے۔ یہ آیات آپ کے سامنے ہیں۔ جس مقصد کے لیے یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس واقعہ میں نہ تو اس خاتون کا ذکر ہے ❷ جس کے خلاف یہ کچھ تہمت لگائی' نہ ان لوگوں کا نام لیا گیا ہے جنہوں نے یہ کچھ کیا' اس لیے کہ قرآن کا مقصد وقائع نگاری نہیں۔ اس کا مقصد تو یہ بتانا تھا کہ ایک واقعہ ہوا ہے جس میں اس قسم کا Reaction (ردعمل) معاشرے کی طرف سے ہوا تھا' جو غلط تھا۔ قرآن نے اس کی تردید کی' اس کی اصلاح کے لیے قوانین دیئے ضوابط دیئے' ہدایات دیں اور یہ کہا کہ یہ اس لیے ہم نے کیا ہے کہ آئندہ بھی اس قسم کی بات نہ کرنا۔ اب تمہارے سامنے واضح ہدایات آ گئی ہیں۔

اس قدر واضح تعلیم کے برعکس کتب روایات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق روایت

اب آیئے وہ بات دیکھیں جو میں نے کہا تھا کہ کتبِ روایات میں کیا لکھا ہے۔ انہی آیات کو ہم عام تاریخ کی کتابوں میں نہیں' بلکہ جنہیں کتب احادیث کہا جاتا ہے' دیکھیں کہ ان میں کیا لکھا ہے۔ ان کتبِ احادیث میں بھی بخاری اور مسلم جیسی کتب صحاح ستہ' جو چھ صحیح

---

❶ یاد رکھو! جو لوگ چاہتے ہیں کہ جماعت مومنین کے اندر اس قسم کی بے حیائی کی باتیں پھلائیں' انہیں اس زندگی میں بھی (از روئے قانون) سخت سزا ملے گی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 797)

❷ اس کا نام تک نہیں ہے۔

ترین حدیث کی کتابیں گنی جاتی ہیں' ان میں یہ دونوں سب سے سرفہرست ہیں۔ ان دونوں کو صحیحین کہتے ہیں۔ ان میں بھی اور دیگر کتابوں میں بھی تفصیل تو ہے مگر سب سے بڑی تفصیل خود صحیح بخاری کے اندر ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ کیا تفصیل ہے اور اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کیا کہا گیا ہے؟ افک اور عائشہؓ کے الفاظ شاید آپ نے سنے ہوں مگر کبھی قرآن نے کہیں یہ کچھ نہیں کہا جو اس واقعہ میں کہا جاتا ہے۔ دو اڑھائی سو سال کے بعد یہ روایتیں جمع ہوتی ہیں۔ چلیے! اگر اتنا ہی ہوتا کہ صاحب! ان کے متعلق بات ہوگئی ہے مگر یہ سب غلط بات تھی جو کسی نے کہہ دی تھی' تو کوئی اہم بات نہیں تھی۔ جی! ایسا نہیں ہوا۔ یہاں تو کتنے ہی صفحوں میں یہ داستان بیان ہوئی ہے اور ان میں خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی یہ بتانے کے لیے بیان ہوئی کہ یہ کس قدر قابل اعتماد ہے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ یہ اسٹوری' یہ داستان' یہ افسانہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبان سے بیان کیا گیا۔

میرا جی تو نہیں چاہتا کہ میں ان چیزوں کی' اس تفصیل' کو بیان کروں۔ ضرورت اس امر کا تقاضا کر رہی ہے کہ میں یہ کچھ آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ ہم لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ منکر حدیث ہیں' میں کم از کم اتنا تو بتا دوں کہ وہ کس قسم کی احادیث ہیں جن کے صحیح ہونے کا ہم انکار کرتے ہیں یا کم از کم یہی آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ جو ہمارے ہاں کی کتابیں ہیں جنہیں ہم ہزار برس سے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں' ان میں لکھا ہوا کیا ہے۔ یہ کچھ بخاری اور مسلم کی تفصیل میں ہے اور ان کے بعد قرآن کریم کی تفسیر کی کتابوں کے اندر وہ ساری کی ساری انہی کتابوں میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی زبان سے' وہ سارے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ان میں لکھا ہوا ہے میں نے عرض کیا ہے کہ میں تو اسے ایک واقعہ کہوں گا۔

اس خالص افسانہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسی جنگ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے' ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ رات کے وقت کسی جگہ پڑاؤ تھا۔ قافلہ وہاں رکا۔ جنگ سے واپسی پر مدینے کی طرف آتے ہوئے یہ پڑاؤ تھا۔ یہ قافلہ وہاں رکا اور میں قضائے حاجت کے لیے ذرا دور نکل گئی۔ میں وہاں سے واپس آ رہی تھی' ہوا یہ کہ میرا انگوٹھیوں کا ایک ہار وہیں ٹوٹ کر گر گیا۔ میں اسے تلاش کرنے لگ گئی۔ اس طرح مجھے واپسی میں کچھ دیر ہوگئی۔ اس دوران قافلے کے کوچ کا وقت آ گیا تو جو میرے اونٹ کا ساربان تھا اس نے یہ سمجھ لیا کہ میں یہیں اندر بیٹھی ہوئی ہوں' اس نے اونٹ کو اٹھا لیا اور قافلے کے ساتھ چل دیا۔ اب میں واپس آئی تو آ کر دیکھا کہ وہاں قافلہ نہیں تھا۔ رات کا وقت' بیابان جنگل اور وہاں کوئی بھی نہیں ہے' اب میں کروں کیا! لامحالہ ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ کہتی ہے کہ اتنے میں مجھے نیند بھی آ گئی۔ قافلوں میں یہ انداز ہوتا تھا کہ ایک شخص پیچھے رہ جاتا تھا کہ قافلہ چلا جائے تو گری پڑی چیزیں اِدھر اُدھر دیکھ کے سنبھال کے اٹھائے تو وہ بعد میں اس قافلے کے ساتھ مل جایا کرتا تھا اور یہ عام طور پر ہوتا ہے۔ اس زمانے میں قافلے کی یہ عام روش تھی۔ انہوںؓ نے کہا کہ اس کے بعد وہ شخص جو اس طرح سے بعد میں جانے والا ہوتا ہے وہ ادھر ادھر سے چیزوں کو ڈھونڈتا ہوا نکلا۔ ادھر جو آیا تو اس نے اندھیرے میں مجھے دیکھا کہ میں بیٹھی تھی۔ اس آدمی کو میں نے پہچان لیا کہ یہ وہی ہے جو اسی طرح ادھر ادھر کی

گری پڑی چیزوں کو چھپے چھپائے سنبھال کر اٹھاتا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا وہ قافلہ چلا گیا ہے؟ تو اس نے کہا کہ ہاں' مگر کوئی بات نہیں۔ اس نے مجھے اپنے اس اونٹ پہ سوار کرالیا اور لے کر چلا آیا۔ وہ ذرا تیزی سے چلا۔ فاصلہ کونسا اتنا زیادہ تھا' دن ہو گیا تھا' وہ قافلے کے ساتھ آ کر مل گیا اور وہاں آ کر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بتا دیا کہ ایسے ہوا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یوں آ گئیں۔ یہاں تک تو واقعہ میں کوئی چیز قابل اعتراض نظر نہیں آتی۔ مدینے میں واپس آ گئیں تو اس بات نے شہرت پکڑ لی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف تہمت لگی' اس مرد کے متعلق سارے مدینے میں شور مچ گیا لیکن اتفاق سے مجھے اس بات کا زیادہ علم نہیں ہوا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔

بین السطور چھپی ہوئی کہانی کا ایک نشتر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے برتاؤ میں بڑا فرق آ گیا ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ اس واقعہ کے بین السطور کیا کیا چیزیں چھپی ہوئی ہیں؟ کوئی خاوند اپنی بیوی کے متعلق باہر شور سنتا ہے اور بیوی کے ساتھ جو اس کا پہلا برتاؤ ہے' اس میں کمی آ جاتی ہے۔ یہ ہے پہلا نشتر جو افسانہ نویس نے اس کے اندر چھپا کر رکھ دیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سلوک

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں کہ نہ انہوں نے مجھ سے پوچھا' نہ بات کی' باہر سنتے رہے' مجھ سے آ کر پوچھا تک نہیں' نہ ہی تحقیق کی۔ اب بات یہ ہے کہ مدینے میں مملکت قائم ہو چکی ہے۔ یہ پانچ ہجری کا واقعہ کہا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ سربراہ مملکت ہیں' عدالتیں بھی قائم ہیں' ضوابط بھی تہمت تراشیوں کے متعلق موجود ہیں' ان کی اپنی بیوی کے متعلق یہ باتیں باہر عام ہو رہی ہیں۔ اس کی تحقیق کے لیے کوئی ایکشن نہیں لیتے حتیٰ کہ بیوی سے بھی آ کر نہیں پوچھتے کہ باہر یہ باتیں ہو رہی ہیں' تم کیا کہتی ہو؟ کشیدگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ خاموشی سے گھر میں آتے ہیں تو چپکے سے ایک طرف ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھے اس بات کا بڑا صدمہ ہوتا تھا' مجھے پتہ نہیں تھا کہ ہوا کیا ہے' بتاتے ہیں نہیں' پوچھتی ہوں تو کہتے ہیں: نہیں' کچھ نہیں۔ نبی کا کردار' عزیزان من! کیا رہا؟ کتنا ہی عرصہ اس میں گزر گیا۔ بخار سے مجھے آرام ہوا تو میں رات کو عورتوں کے ساتھ باہر گئی۔ وہاں جا کر مجھے انہوں نے بتایا کہ ارے بھولی! تمہیں پتہ بھی ہے کہ تمہارے متعلق تو سارے مدینے کے اندر کہرام مچا ہوا ہے۔ کیا تمہیں کچھ علم ہے؟ کہنے لگی: ''مجھے تو کچھ علم نہیں''۔ انہوں نے یہ سارا واقعہ سنایا۔ گھر آئی۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی روپ میں پایا۔ اب میں درمیان میں واقعہ ذرا گیپ دے کر کہتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا کہ اگر یہی صورت حال ہے تو پھر یہ بہتر ہے کہ میں اپنے میکے چلی جاؤں' ماں باپ کے گھر چلی جاؤں۔

حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ماں باپ کے گھر بھیج دیا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ ﷺ کی کیفیت یہ ہے کہ نہ تحقیق کرتے ہیں' نہ تفتیش کرتے ہیں' نہ مجھ سے پوچھتے ہیں اور اس طرح سے کھچاؤ اتنا بڑھتا چلا جا رہا ہے تو پھر ٹھیک ہے' یہاں رہنے کی بجائے میں اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤں۔ آپ ﷺ نے کہا کہ ٹھیک ہے' چلی جاؤ۔ میکے بھیج دیا۔ محسوس کرتے رہیے' عزیزان من! کیا ہو رہا ہے۔ یہ ماں باپ کے گھر آئی تو اس قدر بخار آیا اور اس قدر حالت بڑھ گئی۔ ادھر ماں نے سنا' باپ نے سنا' ان کی حالت بڑی غیر ہوئی۔ اس پہ غور کرتے چلے جایئے کہ ادھر انہوں نے اس کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ کیوں آ رہی ہیں۔ باپ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (573-634AD) تھے۔ انہوں نے بھی یہ کچھ نہیں کیا کہ بیٹی کے خلاف یہ کچھ ہو رہا ہے' عدالتیں موجود ہیں' طریقے موجود ہیں' یہ ساری چیزیں اور ضوابط موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ بھی نہ ہوا۔ بہرحال پرانے زمانہ کی پنچائتیں ہی ہوتی تھیں۔ ان کی طرف بھی رجوع نہ کیا گیا۔ اس قسم کے واقعہ کے متعلق تو Common Sense (عقل عامہ) یہ کہتی ہے کہ تحقیق تو کرالی جائے' کوئی شہادت بہم پہنچائی جائے' کچھ تو بات آگے چلے۔ مگر وہاں تو صورت حالت یہ ہے کہ نہ وہاں ماں باپ کے ہاں یہ کچھ ہوا' نہ یہاں ادھر رسول اکرم ﷺ کے ہاں یہ کچھ ہوا۔

رسول خدا ﷺ کو اپنی بیوی کی بات پر یقین نہ تھا (معاذ اللہ)

عزیزان من! یہاں افسانے والا ایک ٹکڑا رکھ گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ باہر تحقیق کی' نہ گھر میں پوچھا۔ آپ کے متبنیٰ بیٹے حضرت زید گھر میں موجود تھے۔ ان کے لیے قرآن نے (33:37) میں کہا تھا یہ آپ ﷺ کا منہ بولا بیٹا تھا' ان کا ایک بیٹا اسامہ رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ گھر کے آدمی کی طرح یا بیٹوں کی طرح رہتے تھے۔ اس افسانے میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ کا عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کیا خیال ہے؟ خاوند کو اپنی بیوی کے متعلق یقین نہیں ہے نہ وہ تحقیق کا طریقہ عدالت اختیار کیا۔ حضور ﷺ گھر کے ان افراد سے پوچھتے ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ لکھا ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے تو صاف کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم آپ ﷺ کے اہل میں کوئی برائی نہیں جانتے' ہمارے دل میں ان کی محبت' عزت اور شرافت ہے' ہم گواہی دینے کے لیے حاضر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ! خدا کی طرف سے آپ ﷺ پر کوئی تنگی نہیں' ان کے سوا اور عورتیں بھی بہت ہیں۔ اس بات پر بھی مہینہ گزر گیا۔ آپؓ میکے میں بیٹھی ہوئی ہیں' کوئی تحقیق نہیں ہو رہی' کوئی تفتیش نہیں ہو رہی' خاوند ادھر بیٹھا ہے' یہ ادھر بیٹھی ہیں' رو رہی ہیں' مرنے کے قریب ہو گئیں' نہ باپ کچھ کرتا ہے' نہ خاوند کچھ آگے بات کرتے ہیں کہ تحقیق تو کی جائے کہ یہ ہوا کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ مہینے بھر کے بعد ایک دن رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور اس وقت جبکہ میرے ساتھ ہی ایک اور عورت

بھی بیٹھی ہوئی تھی اس کی موجودگی میں یہ بات پوچھی۔ حضرت عائشہ ؓ کہہ رہی ہیں کہ آپ کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ ایک اور عورت کی موجودگی میں مجھ سے ایک ایسے نازک مسئلے پہ بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا تو میری سمجھ میں بات نہ آئے کہ میں اس کا کیا جواب دوں۔ واقعی بات ایسی تھی۔ کیا جواب دوں؟ رسول اللہ ﷺ یا اس خاوند کو اپنے متعلق کیا جواب دوں۔ میں مرتے مرتے اتنا ہی کہہ سکی کہ میں آپ کو کیا کہوں۔ اگر میں تنہا یہ کہتی رہوں کہ میں بڑی پاک دامن ہوں تو آپ نے تو پہلے ہی اپنے دل میں کچھ خیال کر رکھا ہے' آپ کیا مانیں گے' اور اگر غلط بیانی سے میں یہ کہہ دوں کہ ہاں صاحب! وہ تہمت ٹھیک ہے' پھر تو آپ کے گھر جانے کے قابل رہتی نہیں ہوں۔ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں' میں آپ کو کیا جواب دوں' کیا آپ کو پتہ نہیں ہے؟

واقعہ افک کے سلسلہ میں ایک فخریہ بیان!!

اب آگے یہ سنیے اور یہ ہے سارا قصہ جس کے لیے یہ فخر سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ ایسی بات ہے تو پھر میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہت بڑا گواہ' اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ تمہاری اس صداقت کی گواہی دے گا۔ میری سمجھ میں بات نہ آئی کہ میرے لیے اللہ تعالیٰ کیا صداقت کی گواہی دے گا۔ پھر رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہونی شروع ہوئی اور خدا نے یہ بات بتائی کہ نہیں' عائشہ ؓ تو بڑی پاک دامن ہے۔ آپ کو معلوم ہے حضرت عائشہ ؓ کے ساتھ صدیقہ کا لفظ ضرور بولا جاتا ہے۔ وہ اسی لیے ہے کہ ان کی صداقت کی گواہی خود خدا نے دی تھی۔ یہ وحی آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ! مبارک ہو' خدا نے تمہاری پاک دامنی کی شہادت دے دی ہے۔ حضرت عائشہ ؓ کہتی ہیں کہ میری ماں نے یہ کہا کہ تم اٹھو' رسول اللہ ﷺ کا شکریہ ادا کرو۔ اس پر حضرت عائشہ ؓ نے کہا کہ ان کا شکریہ ادا کروں؟ انہوں نے تو انتہا کر دی' میں ان کا شکریہ نہیں ادا کرونگی!! ماں باپ سے کہا کہ نہ میں تمہارا شکریہ ادا کرونگی۔ تم نے کیا کیا ہے؟ تم نے بھی تو کوئی تحقیق کے لیے قدم نہیں اٹھایا' میں تو اس سارے غم کو اکیلی سہار رہی تھی تو اگر شکریہ ہے تو خدا کا شکریہ ہے کہ جس نے میرے لیے یہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد پھر یہ بات ہوئی کہ صاحب! حضرت عائشہ ؓ کی پاک دامنی کی شہادت خود خدا نے دے دی۔

عزیزان من! میں نے یہ بات مختصراً بتائی ہے ورنہ بڑی لمبی چوڑی تفصیل کے ساتھ یہ سارا قصہ آپ کے ہاں کی حدیثوں کی معتبر ترین کتابوں میں' جن میں بخاری سرفہرست ہے' درج ہے۔ ہمارے لیے خدا نے خود کہا ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے' حضور ﷺ کی زندگی اسوہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر خدانکردہ ہمارے ساتھ یہاں اسی طرح کا کوئی واقعہ گزرے' ہم میں سے کسی کی بیوی کے متعلق اس قسم کی بات ہو' تو اب اسوہ یہ ہوگا کہ اس کے لیے کوئی تحقیق نہ کی جائے' اس کو گھر میں مرنے کے لیے پڑی رہنے دیا جائے' کشیدگی اختیار کر لیجیے' روٹھے ہوئے رہیے' برتاؤ میں کمی کرتے جایئے' دل کے اندر یہ بات رکھیے' اس سے بھی نہ پوچھیے۔ اس کے اندر رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا یہ اسوہ بتایا گیا ہے۔ یہ کیجیے۔ وہ کہے: میں میکے چلی جاؤں؟ کہا کہ ہاں' چلی جاؤ۔

پھر اس بیوی کو میکے بھیج دیجیے۔ مہینہ تک اس کی خبر بھی نہ لو‘ وہاں جاؤ تو جس موڈ میں تم ہو‘ اس میں جا کر تم اس سے پوچھو کہ کیا کہتی ہو تم اپنے متعلق؟ اور پھر اس کے بعد خود کوئی تحقیق نہ کراؤ۔ قرآن کریم اتنی ہدایات اتنے قوانین دیتا ہے کہ اگر کسی کے خلاف تہمت لگے تو یہ کرو‘ یہ کرو‘ یہ کرو‘ گواہ بلاؤ‘ اس پر الزام عائد کرو‘ جرم عائد نہ کرو‘ غلط بیانی کرنے والے کے خلاف یوں سزا دو۔ یہ ساری چیزیں قرآن میں موجود ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی ذات سربراہ مملکت ہیں اور روایات میں یہ کچھ ہے۔ اس واقعہ کے اندر رسول اللہ ﷺ کا یہ طرز عمل ہمارے سامنے آتا ہے۔ میرے آپ کے لیے یہ اسوہ بنتا ہے کہ یہ کچھ کرو۔

واقعہ افک کے بارے میں ایک اہم مگر بڑا ہی نازک سوال اٹھتا ہے

آخر میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیوی کی صداقت کی شہادت تو خدا نے دیدی‘ ہماری اور آپ کی بیوی کی شہادت اللہ میاں کہاں دے گا؟ پھر آخر میں جا کر کیا بنے گا؟ عزیزان من! سوچیے کہ یہ ہیں ہمارے ہاں کی احادیث۔ نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات‘ ایمان کی رو سے‘ ہماری آپ کی مائیں ہیں۔ قرآن کریم میں ان ازواج کے متعلق اتنی عمدہ باتیں کہی ہیں کہ تمہیں خدا نے پاکیزہ کر دیا ہے حضور ﷺ نے یہ کہا ہوا ہے کہ تمہارا طرز عمل باقی عورتوں کے لیے ایک نمونہ‘ ایک قندیلِ ہدایت ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا گھرانہ تو بننا ہی نمونہ چاہیے تھا۔ اس گھرانے کے اندر جو یہ چیزیں آپ کے ہاں کی ہیں مجھے معاف رکھیے تو پھر ان سے تو کوئی سوال ہی نہیں۔ شیعہ حضرات کے ہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اچھے خیالات نہیں ہیں۔ ان کی کتابوں کے اندر یہ بات کہیں ہوتی تو وہ کہہ دیا جا سکتا تھا کہ صاحب! ان کو چونکہ ان کے خلاف بغض ہے اس لیے اس قسم کی یہ باتیں ہوتی ہیں۔ آپ کے ہاں سنیوں کی یہ بخاری میں سب کچھ ہے‘ مسلم میں ہے‘ اور ان کی بنا پر‘ وہ اگر ان کے خلاف کوئی چیز کہہ دیں اس پہ تو آپ انہیں چھرا مار دیں گے‘ اور صرف انہی کو نہیں‘ آپ سوچیے کہ یہ جتنے غیر مسلم مصنفین محققین ہیں وہ ان تحریروں میں سے اس قسم کے واقعات لکھ کر پھر کیا نتائج نکالیں گے۔ اگر ادھر یہی چیز وہ کہیں تو ان کتابوں کو Ban (ممنوع) کر دو۔ انہیں تو Ban کر دو اور اپنے ہاں ان کے ''ختم'' کیا کرو۔

احادیث کی ان کتابوں کے [1] سلسلہ میں بخاری کے متعلق اہلحدیث حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار‘ انسان کو اسلام کے دائرے سے نکال دیتا ہے۔ بخاری کی کسی ایک حدیث کا منکر مسلمان نہیں رہتا۔ یہ ایک حدیث جو میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی۔ کہیے کہ یہ غلط ہے‘ تو اپنے آپ کو دائرہ اسلام سے خارج مانیے‘ اور اگر کہیے کہ صحیح ہے تو دائرہ انسانیت سے خارج

---

[1] ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج‘ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ‘ لاہور‘ 2005‘ ص ص۔ 218-197‘ نیز انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

کر دیجیے۔ عزیزان من! یہ تمام پتھر کھاتے اتنی زندگی گزر گئی ہے۔ ہر قسم کے نشتروں کو برداشت کر رہا ہوں لیکن میں ناموس رسالت ﷺ کے خلاف یہ بات برداشت نہیں کر سکتا۔

ان روایات کے بارے میں مولانا علامہ اسلم جیراجپوری رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان

استاد مکرم مولانا اسلم جیراجپوری رحمۃ اللہ علیہ (1879-1955AD) کے سامنے اس قسم کی حدیثوں کے متعلق وہ (اہل روایات) آئے' آپ پہلے خود بھی اہلحدیث ہوتے تھے تو انہوں نے کہا کہ مولانا! آپ دیکھیے اس حدیث کے راویوں میں کتنے بڑے معتبر ہیں۔ بات ناموس رسالت ﷺ کی ہی ہو رہی تھی۔ آپ نے کہا کہ آپ ان انسان راویوں کا کہتے ہیں' اس قسم کی حدیث کے راوی اگر آپ جبریل کو بھی پیش کر دیں تو میں اسے بھی صحیح نہیں مانوں گا کیونکہ اس سے میرے رسول ﷺ پہ حرف آ رہا ہے۔ رسول کے گھرانے کو ایسا مانیے اور پھر عفت و عصمت و شرافت کو دنیا میں جا کے کہیں ڈھونڈیئے کہیں نہیں ملے گی اور پھر یہ جو نشتر حضرت علی کرم اللہ وجہہ رضی اللہ عنہ (601-661DA) کے متعلق اس افسانہ نویس نے اس کے اندر رکھ دیا ہے اس کا کیا کریں گے؟ ان کا احترام بھی ہمارے نزدیک اتنا ہی ہے جتنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (573-634) اور عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45AD) کا ہے۔ ہمارے نزدیک وہ بھی واجب الاحترام ہیں۔ وہ خلافت راشدہ میں سے ہیں جبکہ یہاں ایک نشتر رکھ دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہہ دیا کہ آپ ﷺ کے لیے عورتوں کی کوئی کمی نہیں ہے (معاذ اللہ)۔ چل بھئی! دیکھا' کتنا نشتر رکھ دیا کہ کبھی بھی شیعہ اور سنی کے درمیان دلی محبت پیدا ہی نہ ہو سکے۔ بس اتنی سی چیز ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ تو شیعوں کا کہنا ہے اور شیعہ حضرات ان سے یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہم تو کچھ نہیں کہہ رہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو آپ خلفائے راشدین میں سے مان رہے ہیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے گھر کے آدمی ہیں۔ ان کی یہ شہادت بخاری میں موجود ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ (601-661AD) جیسی معتبر ترین شہادت تو کوئی اور ہو نہیں سکتی۔ اس واقعہ میں جو کہ گھر کے اندر کا واقعہ ہے' سنیوں کی بخاری کے اندر' یہ موجود ہے۔ وہ اگر ان سے یہ کہیں کہ صاحب! ہم تو کچھ نہیں کہتے۔ آپ یہ فرمایئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا کہیں گے آپ! کیا انہوں نے ان کے متعلق یہ سب کچھ کہا تھا؟

عزیزان من! یہ سب اپنے اپنے مقام پہ اہم ہیں لیکن اگر کوئی میرے جیسا یہ کہہ دے کہ ناموس رسالت کے تصور کے پیش نظر مجھے یہ افسانہ لگتا ہے' میں اس قسم کی گستاخی کی اجازت نہیں دیتا' یہ سب جھوٹ ہے' افسانہ ہے' جو دو اڑھائی سو سال کے بعد گھڑا گیا ہے اور اس قسم کے افسانوں کے گھڑنے کا خاص مقصد تھا اور اس کے بعد سازش کا کمال یہ ہے کہ یہ جو سنیوں کی معتبر ترین کتابیں ہیں یہ ان کے اندر داخل ہے تو اس افسانہ تراش کے متعلق نہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں' نہ اس سازش کرنے والوں کے متعلق آپ کیونکہ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ تِلْکَ

اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ❶ (2:134,141) وہ اسلاف چلے گئے' ان کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔

قرآن فہمی کے متعلق ہمارے دارالعلوموں کی حالتِ زار اور تعلیماتِ قرآن

میں آج یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ جو ان کتابوں کے اندر ہے وہ یہیں تک نہیں ہے کہ یہ اسے سینے سے لگائے ہوئے ہیں بلکہ یہ جتنے بھی دارالعلوم ہیں' ان سب کے اندر ان چیزوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہاں ان دارالعلوموں میں قرآن شریف کی صرف سورۃ بقرۃ تک کی ایک تفسیر پڑھائی جاتی ہے۔ یہ سات سال کا کورس ہے۔ اس میں صرف سورۃ بقرۃ کی تفسیر ہے لیکن ختم بخاری شریف پہ ہی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی ایک حدیث کے 'انکار' سے وہ کہتے ہیں' کہ مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ان کتابوں کو یہ مقام دیا ہوا ہے اور یہ کچھ ان کتابوں کے اندر موجود ہے۔ انہی پر مبنی آپ کی تمام تفاسیر قرآن ہیں۔ میں نے اس کے اندر یہ جو پوری کہانی آپ کے سامنے پیش کی ہے' یہ تفسیر ابن کثیر کی ہے۔ بخاری شریف میرے پاس موجود ہے۔ اس کے اندر بھی یہی کچھ ہے۔ یہ میں نے اس لیے ساتھ رکھی تھی کہ یہ تفاسیر والے صرف ایک بخاری کی حدیث ہی نہیں لیتے بلکہ جو باقی کتب ہیں ان کے جو ٹکڑے ہیں وہ بھی ساتھ دیدیتے ہیں اور بڑھا دیتے ہیں زیب داستاں کے لیے' ورنہ بخاری اور مسلم کے اندر یہ اس قسم کی ساری حدیثیں موجود ہیں۔

یہ ہے' عزیزان من! قرآن کریم کی آیات جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں۔ ان میں کوئی نام نہیں' کسی کا کوئی ذکر نہیں' اشارۃ کنایتاً تک نہیں ہے' رسول اللہ ﷺ کا کوئی ذکر نہیں ہے' ایک واقعہ ہوا ہے اور اس زمانے میں اس قسم کے واقعات کا تو منافقین کا دور تھا۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ یہودی مدینے میں بیٹھے ہوئے تھے' وہ شریف زادیوں کے ساتھ چھیڑ خانیاں کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر ہے۔ اس میں درج ہے کہ یہ ایک واقعہ ہوا ہے اور قرآن نے اس لیے بیان کیا ہے کہ اس قسم کی بات پھر دوبارہ تمہارے ہاں معاشرے میں نہ ہو۔ یہ بیان کیجیے' کہیے کہ ایک واقعہ ہوا تھا۔ قرآن نے اس کے لیے ہمیں ہدایات دی ہیں' ہمارا اس واقعہ سے بس اتنا ہی تعلق ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کا واقعہ ہمارے ہاں نہ ہو' اگر ہو تو ہم یہ کچھ نہ کریں۔ بات ختم ہو گئی۔ اب پوری تفصیل کے ساتھ

---

❶ تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (2:134,141) وہ اسلاف جیسے بھی تھے' ان کے اعمال ان کے لیے تھے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے اسلاف کس روش پر چلتے تھے اور کیسے کام کرتے تھے۔ تم سے تو یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کس قسم کے کام کیے تھے۔ (اعمال کے نتائج اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ اس میں وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو کچھ انہوں نے کیا' اس کے ثمرات و برکات ان کے حصے میں آئے۔ جو تم کرو گے اس کا پھل تمہیں ملے گا۔ تم سے تمہارے اعمال کی بابت پوچھا جائے گا۔ یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے اسلاف کے اعمال کس قسم کے تھے۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 48، 50)

ان کتابوں کے ہی اندر یہ کچھ لکھا ہوا ہے اور جب دوسری طرف سے' وہ انہی سنیوں کے ہاں' انہی کی کتابوں کے اندر سے' حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کی عظمت یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ Guilty Conscious (مجرمانہ شعور کی مالکہ) ہیں کہ پہلے یہ کچھ کرلیا پھر کہا کہ جی وحی نازل ہوا کرتی تھی' حضرت عائشہ ؓ کے زمانے میں حضور ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے۔ عزیزان من! اپنی طرف سے یہ ان کی عظمت بیان کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ان کے متعلق یہ کچھ اپنی کتابوں کے اندر بھی لکھتے ہیں کہ یہ Guilty Conscious (مجرمانہ شعور کی مالکہ) ہیں۔

جس بات کا تمہیں ذاتی علم نہ ہو' اس کے پیچھے نہ لگو

عزیزان من! یہ ہیں وہ چیزیں جن کے متعلق میں کہتا ہوں کہ ہمارے پاس تو کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم ان واقعات کی صداقت کا تعین کرسکیں۔ یہ دو ڈھائی سو سال کے بعد امام بخاری ؒ نے اسے اپنے ہاں لکھ دیا۔ ان کے پاس ان کی پرکھ کا کیا ذریعہ تھا؟ قرآن تو ہمیں آج بھی یہ کہتا ہے کہ جس بات کا تمہیں ذاتی علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگو' پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنے کانوں سے سنا' اپنی آنکھوں سے دیکھا' پھر اس کے بعد تمہارے دل نے اس کو پرکھ کے' دیکھ کے' ٹھوک بجا کے' یہ شہادت دی کہ یہ صحیح بھی ہوسکتا ہے؟ پھر ایک دوسری بات ہے کہ یہاں دو ڈھائی سو سال کے بعد بیٹھ کے ایک شخص لکھتا ہے اور اس واقعہ کی تفاصیل یوں لکھی ہوئی ملتی ہیں جیسے وہ حضرت عائشہ ؓ کے پاس بیٹھے ہوئے لکھ رہا ہو۔ اور یہ ہیں صحاح ستہ' یہ ہیں آپ کے ہاں کی کتب احادیث۔

عزیزان من! آج ہم سورۃ النور کی آیت 20 تک آ گئے اور اس میں یہ تھی وہ اہم چیز' جو میں نے کہی۔ اس کے بارے میں کتنی ہی مرتبہ سوچا کہ اس واقعہ کو بیان کروں یا نہ کروں۔ جی نہیں چاہتا' تھا مگر دل پہ پتھر رکھ کر اسے بیان کرنا پڑا تا کہ آپ احباب کو معلوم ہو جائے کہ ہماری ان کتابوں کے اندر ہے کیا؟ قرآن اس سے بری ہے' رسول اللہ ﷺ اس سے بری ہیں' ازواج مطہرات' ہماری مائیں ہیں' ان کا کردار بہت اونچا ہے' رسول اللہ ﷺ کا یہ طرزِ عمل ہو نہیں سکتا جو اس کے اندر ہے مگر یہ ہیں کہ کہے جا رہے ہیں۔ بہرحال سورۃ النور کی آیت 20 تک ہم آ گئے۔ آئندہ درس میں ہم آیت 21 سے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀ ..... ❀❀❀ ..... ❀❀

پانچواں باب: سورۃ النور (آیات 21 تا 31)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢١﴾ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۠ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾ يَوْمَىِٕذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿٢٥﴾ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰۗىِٕكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٦﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٧﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿٢٨﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿٢٩﴾ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿٣٠﴾ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَاۗىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰي عَوْرٰتِ النِّسَاۗءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٣١﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1977ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النور کی آیت 21 سے ہو رہا ہے: (24:21)۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس سورۃ کی ابتدا ہی سے عائلی زندگی، تمدنی زندگی، اور جنسی تعلقات کے امور کے متعلق ہدایات دی جا رہی

ہیں۔ قرآن کریم نے بڑے بڑے اہم مسائل کے متعلق اصول دیئے ہیں' ان کی جزئیات خود متعین کر کے نہیں دیں لیکن یہ مسائل ایسے ہیں کہ ان کی جزئیات تک قرآن خود ہی متعین کر کے دیئے جا رہا ہے اور ان چیزوں کا بڑا تفصیلی تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس سے نظر آیا کہ انسانی زندگی میں بنیادی معاملات وہی ہیں جن کا تعلق انسان کی تمدنی زندگی' عائلی زندگی' اور معاشی زندگی سے ہے۔ جتنے امور مابعد الطبیعاتی (Metaphysical) ہیں' وہ دراصل اس قسم کے اصول ہیں جن کی بنیادوں پر یہ تمدنی' معاشی' جنسی تعلقات کی دنیا استوار ہوتی ہے۔ وہ جو اقبالؒ (1877-1938) نے ایک مصرع میں بات کہہ دی ہے وہ بڑی ہی جامع ہے۔ وہ بات بتاتی ہے کہ اسلام کا' دین کا مقصد کیا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ اسلام میں.....

از کلیدِ دیں در دنیا کشاد

اس دین کی چابی نے دنیا کے ہر دروازے کا تالا کھول دیا۔

دنیا کے دروازے دین کی چابی سے کھولیے

عزیزان من! مقصد تو دنیاوی امور کے تالوں کا کھولنا تھا۔ اب بجائے اس کے کہ وہ یونہی چوروں کی طرح انہیں کھولتا یا ہتھوڑوں سے انہیں توڑتا' اس نے انہیں چابی سے کھولا ہے اور وہ چابی ہے دین کی۔ دین کا مقصد ہے دنیاوی امور کے تالوں کا کھولنا۔ چابی مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ یہ ایک مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اور یہ بڑی اہم بات ہے جو قرآن کریم میں آ کر واضح ہوتی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہدایات خداوندی دی گئی ہیں' یہ ضوابط' یہ اصول' یہ اقدار' یہ آسمانی رہنمائی' یہ سارے انسانی معاملات کے حل کرنے کے ذرائع ہیں مگر ہمارے ہاں یہ مقصود بالذات ہو کر رہ جاتے ہیں اور آخر کار ان کا تعلق انسانی دنیا سے رہتا ہی نہیں۔ وہ بتدریج انسانی دنیا سے الگ ہو جاتے ہیں' پھر نماز مسجد کی چار دیواری کے اندر کی ایک چیز ہو جاتی ہے' اس چار دیواری کے باہر کی جو دنیا ہے وہ دنیاوی امور سمجھے جاتے ہیں اور ان کا حل بھی دنیاوی امور کی طرح ہی کیا جاتا ہے چنانچہ نتیجہ یہ ہے کہ اس کا احاطہ الگ ہو جاتا ہے۔ یہ جو Dualism یا ثنویت ہے' یہ ہے مذہب کی یا دنیاوی امور کی نشانی ہے۔ جو دین ہے وہ انسانوں کے دنیاوی امور کو نہایت عمدہ طریق سے حل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

ہدایاتِ سماوی [1] دنیاوی امور کو حل کرنے کے لیے دی گئی ہیں

آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم میں جتنے امورِ دنیا کا ذکر آئے گا انہیں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے' ان سے متعلق تمام جزئیات تک کی تفصیل دی گئی ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ صلوٰۃ' جسے ہم نماز کہتے ہیں' کا حکم تو متعدد بار قرآن میں آیا ہے' مگر اس کی

---

[1] Cosmic Guidance

تفصیلات قرآن میں نہیں ہیں۔ زکوٰۃ کے متعلق اتنا کچھ کہا گیا ہے لیکن اس کی کوئی تفصیل قرآن میں نہیں ہے۔ یہ جو تفصیلات ہیں وہ اس نے اسلامی مملکت پر' اسلامی معاشرے پر' چھوڑ دی ہیں لیکن جنہیں ہم دنیاوی امور کہتے ہیں' جنہیں مذہب کی دنیا میں اہمیت حاصل نہیں ہے' ان کے متعلق آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن نے بڑی Detail سے' بڑی تفصیل سے' باتیں کی ہیں۔ خود مجھے بھی حیرت ہوئی جب پہلی دفعہ میں نے دیکھا کہ قرآن کریم کی سورۃ بقرۃ کی سب سے زیادہ لمبی آیت 282 میں بھی یہ ہے کہ جب تم لین دین کا معاملہ کرو' تو اسے لکھ لیا کرو اور ''اس لکھ لیا کرو'' کی اس نے جزئیات خود دی ہیں: فلاں لکھائے' فلاں لکھے' اس طرح کاتب آئیں' اس طرح گواہ ہوں' یہ اس کی تفاصیل ہوں' بعد میں اس میں کچھ جھگڑا پڑے تو اس کو یوں نمٹایا جائے' سفر میں ہوں تو کیسے کیا جائے' شہر میں ہوں تو کیا کیا جائے۔ یہ ساری تفاصیل لین دین کے معاملے کے متعلق ہیں۔ یہ بنیادی نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ آسمانی ہدایت ہمارے دنیاوی امور کو نہایت احسن طریق سے حل کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ دنیاوی امور سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں ہے کہ یہ اتنا حصہ تو ہم نے اپنے ثواب کی خاطر' اپنی نجات کی خاطر' کر لیا اور باقی دنیا کے معاملے دنیاداروں کی طرح کیے۔ جب بھی' یہ آپ کے ہاں' جنہیں آپ مذہبی امور کہتے ہیں' دنیاوی معاملات سے ہٹ جائیں اور ان کا اس سے کوئی تعلق نہ رہے تو وہ مذہب بن جاتا ہے' دین نہیں رہتا۔ الدین کا ہر اصول' ہر ہدایت' ہر ضابطہ' ہر قانون' جو کچھ عملاً بھی اس کے بعد کیا جائے گا' وہ آپ کے دنیاوی امور میں سے کسی نہ کسی کے حل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ

اس تمہید کے بعد آپ یہ دیکھیں گے کہ سورۃ النور میں شروع سے ہی ان امور کے متعلق ذکر آ رہا ہے اور آپ دیکھیں گے کہ آتا چلا جا رہا ہے' تفصیل کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں' چنانچہ پچھلے درس میں جو آیات زیر نظر آئیں ان میں بتایا گیا تھا کہ وہاں ایک واقعہ ہوا تھا۔ اصول یہ دیا تھا کہ کسی کے خلاف خواہ مخواہ تہمت نہ لگایا کرو' بہتان تراشی مت کیا کرو' اگر کوئی اس قسم کی افواہ لے اڑے تو معاشرے میں اسے پھیلایا نہ کرو' جو تحقیق کرنے والے ہیں ان کی طرف رجوع کیا کرو' اور خاموش رہا کرو بلکہ تمہارا پہلا Impression (تاثر) ظن خیر ہونا چاہیے کہ نہیں' بات غلط ہی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی اس کی تشہیر نہ کرو' ملزم اور مجرم میں فرق کرو۔ ملزم وہ ہے جس کے خلاف الزام عائد کیا جاتا ہے۔ وہ مجرم نہیں ہوتا۔ الزام ثابت ہو جانے کے بعد اسے مجرم کہو۔ قرآن کریم یہ ہدایات دیتا چلا آ رہا تھا اور کہا تھا کہ جنہوں نے اس قسم کی یہ حرکت کی: پہلے تو بہتان تراشی کی' اور جب معاشرے کے اندر بات کی تو معاشرے کے افراد نے اس کو پھیلا دیا۔ قرآن نے اتنی سختی سے اس چیز کو روکا ہے کہ یہ چیز جس معاشرے میں عام ہو جاتی ہے' الزامات بہتان تراشی پہ مبنی ہوتے ہیں' پھر ان کی تشہیر ایسے کی جاتی ہے' معلوم ایسا ہوتا ہے سارا معاشرہ ہی گویا مجرموں سے بھرا پڑا ہے اور جب تحقیق کی جاتی ہے تو ان الزامات میں سے اکثریت ان الزامات کی ہوتی ہے جو غلط ہوتے ہیں' تراشیدہ ہوتے ہیں' اور پھر اس سے ان افراد کو بھی نقصان پہنچتا ہے جن کے خلاف یہ

بہتان تراشی ہوتی ہے۔ معاشرے کو بڑا نقصان پہنچتا ہے' باہمی تعلقات کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ قرآن نے ان چیزوں سے روکا۔

شیطانی عمل کی حقیقت اور نتیجہ

اس واقعہ کی ہدایات دینے کے بعد یہ کہا کہ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ وَ مَنْ یَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ فَاِنَّهٗ یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّ لٰكِنَّ اللّٰهَ یُزَكِّیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ** ❶ (24:21). اس قسم کی حرکات جو معاشرے میں ہوتی ہیں' انہیں قرآن شیطانی عمل کہہ کر پکارتا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ جب انسانی جذبات خدا کی راہنمائی کی حدود کے اندر نہ رہیں' بیباک ہو جائیں' تو انہیں شیطان کہا جاتا ہے: بھڑک اٹھنے والے' شعلہ بن جانے والے' بیباک ہو جانے والے' دریا کے اس پانی کی طرح جو سیلاب بن کر بے باک ہو جاتا ہے۔ انسانی جذبات مذموم نہیں ہیں' نہ ہی قابل نفرت ہیں۔ جذبات ہی تو انسان کے عمل کا محرک جذبہ بنتے ہیں۔ یہ صرف ان کا استعمال ہے جس پر انہیں Regulate (منظّم) کیا جاتا ہے' یعنی حدود کے اندر رکھا جاتا ہے' ضابطے اور قاعدے کے مطابق ان سے کام لیا جاتا ہے' پھر تو وہ نفع بخش ہی نفع بخش ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ پانی دریا کے اندر ہوتا ہے تو ہر قسم کی زندگیاں بخشتا ہے' جونہی وہ ساحلوں کو توڑ دیتا ہے' وہ سیلاب بن جاتا ہے' اور تباہی پھیلاتا ہے۔ پانی تو وہی ہوتا ہے۔ تباہیوں سے بچنے کے لیے اس پانی کو پھر سے ساحلوں کے اندر محدود کر دیتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ انسانی جذبات کو اقدار کے ساحلوں کے اندر رکھو۔ جب یہ ان ساحلوں کو توڑتے ہیں تو قرآن اسے شیطان کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ انسان کے اپنے ہی جذبات ہوتے ہیں جو بیباک ہو کر' حدود فراموش ہو جاتے ہیں' ساحلوں کو توڑ دیتے ہیں۔

شیطان یک لخت غلبہ نہیں پاتا

واقعہ افک یعنی تہمت تراشی کے واقعہ کے بعد کہا کہ یاد رکھو! شیطان کے قدموں کے ساتھ نہ چلو' شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ بات تو بڑی آسان سی ہے لیکن میں نے کہا ہوا ہے کہ قرآن کا تو ایک ایک لفظ غور طلب ہوتا ہے۔ یہاں **خطوت** کہا ہے: ''قدم بقدم چلنے کی بات کی''۔ شیطان یک لخت غلبہ نہیں پاتا' یہ جذبات بتدریج' آہستہ آہستہ' قدم بقدم' انسان پر غالب آتے ہیں۔ اس لیے

---

❶ اے جماعت مومنین! تم اس قسم کے فتنہ پردازوں کی شیطنت کے پیچھے مت چلو۔ جو کوئی ان کے پیچھے چلتا ہے یہ اسے برائیوں کا سبق پڑھاتے ہیں اور بے حیائیوں کے لیے اکساتے رہتے ہیں۔ (اس سے نہ صرف معاشرے میں فساد پھیلتا ہے بلکہ افراد کی صلاحیتوں کی نشوونما بھی رک جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ) اگر تم پر خدا کا فضل اور رحمت نہ ہوتی (اور وہ تمہیں قرآن جیسا ضابطہ حیات نہ دیدیتا تو) تم میں سے کسی کی انسانی صلاحیتوں کی بھی نشوونما نہ ہو سکتی۔ اس لیے کہ انسانی نشوونما خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہی ہو سکتی ہے' اس خدا کے قانون کے مطابق جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے' (اور جب تمہیں اس کا علم ہی نہیں ہوتا کہ اس باب میں خدا کا قانون کیا ہے تو تمہاری نشوونما کس طرح ہو سکتی؟) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔798)

یہاں لفظ خطوٰت کہا ہے: قدم بقدم چلتا ہے اور قد بقدم تم اس کے پیچھے چلتے ہو۔ کہا کہ پہلے ہی قدم کے اوپر رک جاؤ۔ انسان جتنی بھی حدود فراموشیاں کرتا ہے' یہ تو کبھی ہی ایسا ہوتا ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ دنیا پاگل ہو جاتی ہے ورنہ انسان آہستہ آہستہ' بتدریج' ان غلط عادات کو اختیار کرتا ہے۔ ایسا بتدریج شروع میں تو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ میں کوئی غلط بات کر رہا ہوں لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ یاد رکھو! یہ شیطان تمہیں قدم بقدم غلط راستوں کے اوپر لے جائے گا۔ تم پہلے ہی قدم کے اوپر دیکھ لو کہ یہ غلط راستے کی طرف جا رہا ہے' وہیں رک جاؤ۔ اسی لیے یہاں خطوٰت کا لفظ آیا ہے۔ جو بھی اس کے نقش قدم پر چلے گا' یاد رکھو! وہ بے حیائی کی باتوں کی طرف لے جائے گا' ان امور کی طرف لے جائے گا جو قابل نفرت ہیں' مذموم ہیں' معیوب ہیں۔ ان سے بچو۔

اللہ کے فضل یا رحمت کا مفہوم

اس سے بچنے کے لیے اسی آیت میں اللہ کا فضل یا رحمت کے الفاظ آتے ہیں۔ اللہ کا یہ فضل اور رحمت وہ ہے جو قرآن کریم نے ہدایات دیدی ہیں۔ ان چیزوں سے' صرف خدا کی دی ہوئی اقدار یا ہدایات کی رو سے' ہی بچا جا سکتا ہے۔ انسان کی عقل فسوں کار تو تدبیریں سجھاتی ہے' جذبات کو ابھارتی ہے' مثلاً جس بات کو پورا کرنے کے لیے چوری کرنے کو جی چاہتا ہے تو اس کے بعد وہ سمجھاتی ہے کہ چوری کیسے کی جائے کہ پکڑا نہ جائے۔ یہ انسان کو اس قسم کے Justificatory Reason (وجہ جواز) بہم پہنچاتی ہے' اس قسم کی تدبیریں بہم پہنچاتی ہے' لیکن اگر اسی عقل سے خدا کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کام لیا جائے تو وہ جذبات کو صحیح راستے کے اوپر لے جاتی ہے۔ اسے خدا کا فضل اور رحمت کہا گیا ہے۔

''فضل'' تو اس لیے ہے کہ یہ بلا مزد و معاوضہ ہمیں ملا ہے' خدا کی طرف سے وحی بغیر مزد و معاوضہ ملتی ہے۔ اس میں تو وحی دینے والا جو رسول ہوتا ہے اس کی اپنی محنت' اس کی کاوش' اور فکر تک کا بھی دخل نہیں ہوتا۔ اسے بھی وہبی طور پہ خدا کی طرف سے Objectively (خارجی طور پر) ایک چیز ملتی ہے اور اسی طرح سے وہ دوسروں تک پہنچا دیتا ہے تو اتنی بڑی Guidance (راہنمائی)' اتنی بڑی ہدایت بلا مزد و معاوضہ' بلا محنت و کاوش و فکر' خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ اسے فضل کہا گیا ہے اور رحمت اس لیے کہا گیا ہے کہ اس سے انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما ہوتی ہے۔ رحمت کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہا کہ یہ تو خدا کی طرف سے ملی ہوئی ہدایت ہے جس کی رو سے بلا مزد و معاوضہ ہدایت ملی اور اس سے تمہاری انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما ہو سکتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا (24:21) تمہاری انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کبھی ہو ہی نہ سکتی۔ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ (24:21) لیکن انسانی نشو و نما خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہی ہو سکتی ہے۔

ہمارے ہاں کے غلط ترجمے

اب یہاں اس آیت (24:21) میں پھر وہی یشـــآء کا لفظ آیا ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ اس قسم کی آیات کے پہلے تو غلط ترجمہ ہو جاتے ہیں۔ پھر مطلب و معانی سمجھ میں نہیں آتے۔ اس آیت میں یہ کہا کہ ہم نے یہ قرآن دیا' ہدایات دیں' راہنمائی دی۔ یہ ہمارا فضل تھا' رحمت تھی۔ اس کی رو سے تم ان چیزوں سے بچ سکتے ہو۔ اب دشواری یہ ہے کہ اگلا ترجمہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ تم خود نہیں بچ سکتے' اللہ جسے چاہتا ہے بچاتا ہے۔ اب اگر یہ بچنا ہو تو وہ اللہ پہ ہی موقوف ہو گیا کہ جسے وہ بچاتا ہے وہی بچ سکتا ہے۔ انسان تو اس میں بے بس ہو گیا۔ ایک اور چیز بھی متعدد بار سامنے آ چکی ہے اور وہ ہے جسے عام طور پہ تقدیر یا مشیت کا مسئلہ بھی کہا کرتے ہیں۔ ان مقامات میں ''من یشآء'' کے یہ معنی نہیں ہوتے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم نے جو یہ وحی' یہ اقدار' یہ ہدایت' یہ ضابطے' دیدیئے ہیں' اب تم میں سے جو بھی بچنا چاہتا ہے وہ اِن کی رو سے بچ جائے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ تمہیں ہاتھ پکڑ کے ہم بچائیں۔ خدا تو ایک طرف رہا' خدا نے تو اپنے رسول سے بھی یہ کہدیا کہ تیرا کام اس ہدایت کو پہنچا دینا ہے' تیرا کام ان لوگوں کو راستے چلا دینا نہیں ہے۔ 'تو چوراہے پہ کھڑا ہو کر یہ بتاتا چلا جا کہ یہ راستہ اس طرف جائے گا اور یہ راستہ اُس طرف جائے گا۔ اب یہ ان کا اپنا کام ہے کہ کون کس راستے پہ چلنا چاہتا ہے۔ تیرا فریضہ یہ نہیں ہے کہ تو ان کو ہاتھ سے پکڑ کر اس راستے پہ بھی چلائے۔ یہ ذمہ داری انسان پر ڈالی گئی ہے۔ یہاں اس کی طرف سے صحیح راستے کی طرف Direction (ہدایت) ملتی ہے' راہنمائی ملتی ہے۔ اس کی طرف کوئی چلنا ہی نہ چاہے' کھڑا رہے' غلط راستہ اختیار کر لے' از خود نتیجہ اخذ کرے تو اس کی ذمہ داری تجھ پہ عائد نہیں ہوتی۔ یاد رکھیے! قرآن کریم کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار خود ہے۔ اسے صرف Directions (ہدایات) ملتی ہیں' ان کے مطابق چلنا یا ان کی خلاف ورزی کرنا' اس کے اپنے اختیار کی بات ہے اور یہیں سے تو یہ اپنے عمل کا ذمہ دار (Responsible) [1] ٹھہرتا ہے۔

اس سے پیشتر بیان کردہ تہمت تراشی کے واقعہ کی یاددہانی

اس سے اگلی آیت میں ایک بڑی عجیب چیز کہی ہے لیکن اسے سامنے لانے سے پہلے آپ اس واقعے کی طرف پھر آ جایئے جس کا ذکر پچھلے درس میں ہوا تھا کہ کسی پاک دامن عورت کے خلاف تہمت تراشی کی گئی اور معاشرے کے اندر لوگ اسے لے اڑے' اس کی بڑی تشہیر کی گئی۔ اس کے متعلق قرآن نے ہدایات دیں۔ یہ بتایا کہ ایسے مواقع پہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ جو کچھ ہوا ہے' یہ بالکل غلط ہوا ہے اور اس کے بعد یہ کہا کہ اب یہ معاملہ طے ہو گیا' فیصل ہو گیا ہے' یہ قصہ ختم ہو گیا۔ اب ظاہر ہے کہ وہ کسی عفیفہ' کسی پاک دامن خاتون کے

---

[1] Responsible کے لیے دیکھئے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ الفرقان' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' چھٹا باب' آخری فٹ نوٹ۔

خلاف تہمت تراشی ہوئی تھی۔ اس کے رشتہ دار ہونگے۔ کسی کی وہ بیٹی ہوگی' کسی کی بہن ہوگی' کسی کی شاید بیوی ہوگی' کسی کی ماں یعنی والدہ ہوگی' اس کے سارے رشتہ دار ہونگے۔ اب ذرا اس چیز کو ذہن میں رکھیے کہ ہم میں سے ہی' اگر ہماری ہی کسی عزیزہ کے خلاف' اس قسم کی یوں تہمت تراشی ہو' تشہیر بھی کی جائے' تو اس سے کس قدر عزت نفس کو نقصان پہنچتا ہے۔ اگر معاشرے میں وہ لوگ بھی موجود ہوں تو ان کے خلاف انسان کے دل میں انتقام اور نفرت کے جذبات تو بھرے ہوئے ہوتے ہیں' انتقام تو یقیناً ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں' عزیزان من! قرآن کی تعلیم ابھر کر سامنے آتی ہے۔ قرآن کریم اس کیفیت کو بدل دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **وَ لَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَ الْمَسٰکِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ** [1] (24:22)۔ یہ واقعہ ہوگیا' جو اس کا مجرم تھا' وہ شرمسار ہوا قانون خداوندی نے اسے معاف کر دیا' غبار چھٹ گیا' تمہارے دلوں میں بھی اس کے خلاف ایک غبار تھا' وہ جو اس خاتون کے عزیز تھے' رشتہ دار تھے' کہا کہ تم میں اس گروہ کے کچھ لوگ تھے جن کی وہ مدد کیا کرتے تھے' وہ ان کی مدد کے محتاج تھے اور یہ ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ جنہوں نے یہ کچھ ان کے خلاف کیا تو ان کے ساتھ وہ پہلے سے تعلقات تو نہیں رہ سکتے۔

قلب ونظر کو کشادہ رکھنے کی ترغیب

اب اس مقام پر قرآن آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب قانون خداوندی نے ان کو معاف کر دیا تو تم بھی اپنے دل میں ان کے خلاف کوئی کدورت نہ رکھو' تم بھی ان کو معاف کر دو۔ اب یہ جو تم نے کہا ہے کہ اب ہم ان کی کبھی مدد نہیں کریں گے' یہ غلط بات ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے جو قرآن کہتا ہے۔ عزیزان من! آپ دیکھیے کہ دل کی کتنی بڑی کشاد ہے جو وہ پیدا کرتا ہے۔ اس نے انتہائی شدید' جذباتی مثال دی ہے۔ کسی کی بیٹی' کسی کی بہن کے خلاف اگر اس قسم کی تہمت تراشی ہو تشہیر ہو اور ملزم بھی موجود ہوں' فرض کرو اس سے پیشتر ان کے تعلقات اچھے ہیں' ان کی امداد کرتے ہیں' وہ محتاج ہیں' قانون کی رو سے ہماری امداد کے مستحق ہیں جب قانون خداوندی نے ان کو معاف کر دیا' معاملہ ختم کر دیا' اب ادھر یہ کہا جاتا ہے کہ تم بھی اپنے دل میں ان کے خلاف کدورت نہ رکھو۔ وہی کشاد کے تعلقات جو پہلے تھے قائم کرو۔ یہ ایک جرم کا بادل تھا جو اس چاند کے سامنے آیا تھا اور بکھر گیا۔ قرآن کی رو سے یہاں سے ایک عظیم بنیادی حقیقت سامنے آتی ہے: قرآن جرم میں اور مجرم میں فرق کرتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ انسان سے اگر جرم ہوتا ہے' اس سے ایک لغزش ہو جاتی ہے' اس لغزش کی پاداش میں جو کچھ بھی ہے جب وہ ہو جاتا ہے تو اس کے بعد یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ کچھ اور بن جاتا ہے' وہ پہلے جیسا ہی انسان رہتا ہے اور انسان تو واجب التکریم ہوتا ہے۔ وہ کہتا

---

[1] تم میں سے جو صاحب وسعت واستطاعت' اپنے اقربا اور مساکین اور مہاجرین کی امداد کرتے تھے اور ان میں سے کوئی بدقسمتی سے اس واقعہ میں شامل تھا تو وہ اس کی مدد کرنے سے ہاتھ روک لیں اور قسمیں کھالیں (کہ ہم اس سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ ایسا بالکل نہیں کرنا چاہیے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔798)

ہے کہ جرم کے خلاف تو نفرت کرو‘ اس انسان کے خلاف نفرت نہ کرو جس پر سے جرم کا یہ بادل گزر گیا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر پہلے جیسا ہی انسان ہو گیا ہے۔ واقعی اس سے ایک بڑی تغیر نفس کی ضرورت پڑی ہے اور قرآن کہتا ہے کہ معاشرے میں تبدیلی نہیں آسکتی تاوقتیکہ تمہارے اپنے اندر تغیر نفس نہ ہو‘ تمہاری ذات کے اندر تبدیلی نہ آئے‘ اندرونی تبدیلی نہ ہو‘ جب تک تمہاری ذہنیت نہ بدلے اور وہ اس حد تک تغیر نفس چاہتا ہے کہ عام حالات میں بھی یہ کوئی معیوب نہیں سمجھے جاتے۔ انہوں نے ہمارے خلاف یہ کچھ کیا‘ چلیے ہم ان کے خلاف یہ نہیں کرتے کہ جا کر انہیں جان سے مار دیں‘ پستول چلا دیں لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم ان کے ساتھ پھر وہی تعلقات قائم کریں۔ قرآن کہتا ہے کہ جب خدا کے قانون نے ان کو قابلِ معافی سمجھ لیا تو تم بھی ان کو قابلِ معافی سمجھو۔ اب وہ وہی پہلے سا انسان ہو گیا‘ جرم کا بادل چھٹ گیا لہٰذا تم میں سے جو لوگ ان کی مدد کیا کرتے تھے‘ وہ یوں قسمیں نہ کھالیں کہ نہیں صاحب! انہوں نے ہمارے خلاف یہ کچھ کیا‘ اب ہم ان کی مدد نہیں کرتے‘ وہ ہمدردی کے بدستور مستحق ہیں۔ وہ بدستور وہی انسان ہیں جو پہلے تھے‘ لہٰذا ان کے ساتھ تعلقات میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے۔ تو آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم انسانی لغزشوں کی کتنی رعایت بھی رکھتا ہے‘ جرم کی سزا دیتا ہے اور اس سلسلہ میں اس نے کہا تھا کہ سزا دینے کے معاملے میں تمہارے دل میں نرمی نہیں آنی چاہیے لیکن جو تکریم انسانیت ہے‘ انسان ہونے کی جہت سے مجرم بھی واجب التکریم رہتا ہے‘ جرم کی سزا دی تو اس نے کہا کہ اس کے بعد وہ قصہ ختم ہوا۔ اب اگر وہ نادم ہے‘ اپنی اصلاح کر رہا ہے تو یہ پہلے جیسا انسان ہو گیا‘ تمہارے تعلقات بھی اب اس کے ساتھ وہی ہونے چاہئیں جو پہلے تھے اور اسی سے اصلاح ہو سکتی ہے۔

مجرم کے ساتھ نفرت سے معاشرے کی اصلاح نہیں ہو سکتی

انسان کی حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک دفعہ کسی سے سہو اور لغزش ہو جائے‘ معاشرے میں اس کی سزا بھی کیوں نہ مل جائے یہ قابل نفرت قرار پاتا ہے تو کبھی بھی اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ وہ تو اور زیادہ پکا ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہی تو چیز تھی جس سے میں بچنا چاہتا تھا کہ معاشرہ مجھ سے نفرت نہ کرے اور وہ بدستور نفرت ہی کرتا ہے تو پھر ٹھیک ہے: جھتے ستیاناس او تھے سواستیاناس اس لیے وہ جرم میں اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ مجرم کے ساتھ نفرت نہ کی جائے۔ اگر نفرت کرو گے تو وہ کہہ دے گا کہ اس کے بعد آپ میرے ساتھ کیا کر لیں گے‘ ایک جرم اور سہی‘ نفرت ہی ہے تو قابل نفرت تو ہو ہی گیا ہوں‘ ایک اور جرم سہی۔ لیکن اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ تکریم انسانیت کے جذبات تمہارے دل میں آئیں۔

اس سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ

یہاں قرآن کہتا ہے کہ اس کے خلاف نفرت نہیں بلکہ تکریم کے جذبات تمہارے دل میں آنے چاہئیں پھر وہ کھنچ کر تمہاری طرف آجائے گا‘ اسے گلے سے لگا لو۔ یہ بڑی چیز ہے۔ اسی ضمن میں میرے سامنے نبی اکرم ﷺ کی بعض احادیث آتی ہیں جو چمکتے ہوئے

ہیرے کی طرح ہوتی ہیں۔ کسی کے خلاف کوئی جرم تھا اسے اس کی سزا ملی۔ معاشرے میں کسی نے بات کی اور اس کے متعلق کہا کہ وہ بڑا ہی ملعون تھا۔ آپ نے فرمایا کہ قطعاً زبان پہ یہ بات نہ لاؤ' وہ ایک لغزش تھی' سہو تھی' وہ ہوگئی' اس کی پاداش بھی اس سے ہوئی ہے' سزا بھی مل گئی' فیصلہ بھی ہوگیا' ندامت بھی ہوگئی' اس کے بعد یہ جو تم اس کے متعلق کہہ رہے ہو' یہ جذبات کا اظہار کر رہے ہو' یہ تمہارے خلاف جرم ہے۔ تم نے اس کی تکریم انسانیت کے خلاف لب کشائی کی ہے' قطعاً ایسا نہ کرنا۔

فتح مکہ پر دشمنوں سے نبی اکرم ﷺ کا سلوک

یہی چیز اجتماعی حیثیت سے نبی اکرم ﷺ کے سامنے آئی۔ تیرہ سال تک یہی مکے والے تھے جنہوں نے کس قدر حضور ﷺ کے ساتھ' حضور ﷺ کے اہل وعیال کے ساتھ' صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ' پوری جماعت کے ساتھ' نبی اکرم ﷺ کی ذات کے خلاف' دشمنی کی۔ انہیں وطن تک چھوڑنا پڑا۔ انہوں نے چھ سات برس تعاقب تک کیا۔ کم از کم بڑی بڑی لڑائیاں اور چھوٹے چھوٹے جھٹکے اسی بیاسی کے قریب بنتے ہیں جو ان سے ہوئے۔ حضور ﷺ کی باقی ساری عمر ہی ان لوگوں کے خلاف ان لڑائیوں میں گزر گئی۔ انہوں نے اس عداوت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ بالآخر ان لوگوں کو فتح مکہ کے بعد خود Surrender کرنا پڑا' آپ یہ سوچیے کہ یہ ساری بائیس سال عمر کے دشمن پابجولاں حضور ﷺ کے سامنے کھڑے تھے۔ حضور ﷺ کے سینے پہ ان کی طرف سے بڑے بڑے گہرے زخم بھی لگے ہوئے تھے' ذاتی طور پہ بھی گہرے زخم تھے۔ عزیز بیٹی بھی تھی حضرت زینت رضی اللہ عنہا' وہ بھی ان کے ہاتھوں سے شہید ہوئی تھیں' عزیز چچا' حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے' جو شہید ہوئے تھے اور بھی سارے عزیز رشتہ دار تھے' ان کو اذیتیں پہنچی تھیں اور بعض تو شہید ہوئے تھے۔ اب وہ لوگ سامنے پابجولاں کھڑے تھے۔ اس سے زیادہ انتقام لینے کا مناسب موقع اور کونسا ہوسکتا تھا اور انتقام ہی نہیں' میں سمجھتا ہوں کہ اس میں اگر وہ پاداش بھی ہوتی' سزا بھی دی جاتی' تو دنیا کا کوئی قانون اس کو نامناسب نہ خیال کرتا۔ جو جرائم ان سے سرزد ہوئے تھے قانونی طور پر بھی اگر ان کی سزا دی جاتی تو وہ اس کے مستحق تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ آج تمہاری یہ حالت ہے' اور پچھلی ساری زندگی تمہارے سامنے ہے' میں اسے نہیں دہرانا چاہتا' میں دیکھ رہا ہوں' اور تمہاری پیشانیاں خود بھی بتا رہی ہیں کہ کس طرح ایک ایک چیز تمہارے سامنے آ رہی ہے اور آج تم اس حیثیت سے کھڑے ہو۔ آپ ﷺ نے کہا کہ کہو' کیا کیفیت ہے؟ جب انہوں نے کہا کہ ہم نے اب اپنے سامنے صداقت کو دیکھ لیا ہے تو یہ اعتراف وہ تھا جس سے یہ بات سامنے آ گئی کہ پہلے جو کچھ ہوا تھا وہ اس جہالت کی بنا پہ تھا۔ ہم نے وہ سب کچھ کیا۔ اب صداقت ہمارے سامنے آ گئی تو آپ ﷺ نے کہا کہ جب یہ حقیقت ہے تو پھر پچھلی ساری باتیں بھول گئی ہیں اور اب نئے سرے سے تعلقات شروع کرتے ہیں۔ کسی ایک سے بھی کوئی شکایت نہیں۔ یہ ہے وہ عمل جو کشاد پیدا کرتا ہے۔ قرآن اسی لیے اس میں ''عفو'' کا لفظ لایا ہے۔ نیکی کا لفظ تو خیر ہے ہی فارسی زبان کا' یہاں ''عفو'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی ہی کشادِ قلب ہوتا ہے' یعنی دل کی کشاد۔

تنگ نظری اور تنگ دلی کمینہ پن ہوتا ہے

عزیزان من! دل کی کشادانسانیت کا بہت بڑا جوہر ہے۔تنگ نظری اور تنگ دلی کمینہ پن ہوتا ہے۔وہ انسانی سطح پہ آتا ہی نہیں ہے۔جس میں تنگ نظری اور تنگ دلی ہو'اس میں کم ظرفی اور کمینگی ہوتی ہے۔حقیقت میں قلب کی کشادہے کہ جب بھی کسی کی پیشانی پہ ندامت کے قطرات'عرق انفعال [1] دیکھو'بے ساختہ کہہ دو کہ **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92)۔تو یہ سزا تو تم نے اپنے اوپر خود وارد کرلی ہے'اب اس سے بڑی سزا کی ضرورت نہیں ہے' آؤ!اب میرے گلے مل جاؤ۔قرآن نے یہاں (24:22) میں یہ کہا ہے کہ جو لوگ اس سے پیشتر ان کی مدد کیا کرتے تھے'ہمیں پتہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے ان کی طرف سے انہیں بڑی اذیتِ قلبی پہنچی ہے لیکن جو بھی کیا ہے قانون کی رو سے معاملہ صاف ہوگیا'ادھر خدا کے ہاں سے ان لوگوں کو اس کا بدلہ مل گیا'درگزر ہوگیا۔

درگزر کے معنی کسی سے آگے بڑھ جانا ہے

''درگزر'' کے معنی ہیں ''کسی سے آگے بڑھ جانا'' تو تم بھی اس کے ساتھ چل کر آگے بڑھ جاؤ'بڑھ جاؤ'آگے چلو:**وَ لْيَعْفُوْا وَ لْيَصْفَحُوْا** (24:22) آگے بڑھ جاؤ'اس غبار کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھ جاؤ۔صفح کے معنی ہوتا ہے Clean Slate (لوحِ صاف) اب اسے لے کر آگے چلو۔یہ بڑی چیز ہے'عزیزان من! یہ ہے کشادقلب جو قرآن پیدا کرتا ہے۔یہ محض سزائیں اور تعزیرات کی بات نہیں ہے جس سے یہ نظام قائم ہوتا ہے۔یہ نظام تو اس قسم کی کشادہ نگہی سے پیدا ہوتا ہے'یہ تو دل کی کیفیتیں بدل دینے سے پیدا ہوتا ہے۔آپ ﷺ نے کسی ایک سے بھی بدلہ نہیں لیا۔میں نے یہ کہا کہ وہ تو خیر شان نبوت ﷺ ہے۔کہہ دیں گے کہ حضور ﷺ جیسی وسعتِ قلب کس کو ہے۔یہ معاملہ تو آپ دیکھیے'بڑا مشکل معاملہ ہے۔اس قسم کا جرم سرزد ہو'اس قسم کی ان کے ہاتھوں سے اذیت پہنچی ہو اور اس کے بعد جب کہا جائے کہ نہیں'تم اس کو معاف کردو بلکہ کہا گیا کہ Clean Slate (لوح صاف) لے کر اب آگے چلو'اس کے بعد ہے کہ **اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ** (24:22) یعنی قرآن جہاں بھی کوئی ایک ہدایت دیتا ہے'اس کے ساتھ اس کی حکمت بھی بتاتا ہے۔کہا کہ ذرا سوچو تو سہی'لغزش تو ہر انسان سے ہوسکتی ہے'اس کا امکان تم سے بھی ہے۔سوچو کہ اگر تم سے کبھی اس قسم کی لغزش ہوجائے اور اس کے بعد معاملہ رفع دفع بھی ہوجائے'اس کے بعد تم کیا چاہو گے کہ تمہارے ساتھ بدستور یہ نفرت کی جائے یا وہ بات ختم کردی جائے؟تم ایمان سے بتاؤ کہ کیا چاہو گے؟ یہ ہے حکمت'یہ ہے دلیل جو دی جارہی ہے کہ تم ہی بتاؤ کہ ایسے واقعے پہ تم کیا چاہو گے کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔جو تم چاہو گے تمہارے ساتھ کیا جائے وہ ان کے ساتھ کرو اور اسی لیے کہا کہ

---

[1] موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (24:22) خدا نے اپنے قانون کے اندر حفاظت کے یہ سامان رکھے ہوئے ہیں، ورنہ لغزشیں تو ہوتی ہیں۔ ایک بار کی لغزش سے اگر کوئی ابدی طور پہ راندۂ درگاہ ہو جائے تو دنیا میں کوئی انسان واجب التکریم رہے ہی نہیں۔ لغزش کہیں نہ کہیں تو کسی نہ کسی سے ہو ہی جاتی ہے۔ پھر اسی بات کو دہرایا کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡغٰفِلٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ لُعِنُوۡا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۪ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ❶ (24:23) جو لوگ پاک دامن خواتین کے خلاف تہمت تراشی کرتے ہیں، وہ بیچاری ایسی معصوم ہوتی ہیں کہ ان کے وہم و خیال میں بھی کبھی ایسی بات نہیں گزرتی۔ ان کے خلاف اس قسم کی تہمت تراشی بہت بڑا جرم ہے۔ اب یہاں ہمارے ہاں تو یہی کہا جاتا ہے کہ ان پہ دنیا میں لعنت ہوتی ہے جبکہ قانون کی رو سے حقوق شہریت سے محروم کرنے کا نام لعنت ہے۔ لعنت کے معنی ہی ''کسی کو کسی رعایت سے محروم کر دینا ہے''۔ سوسائٹی کی طرف سے دنیا میں تو یہ کچھ ہو گیا یعنی اگر ان کی یہ لغزش یا یہ جو کچھ جرم ہے، ان سے سرزد ہوا۔ اس کے بعد یہ ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے لیکن اگر وہ اصلاح کی طرف نہیں آتے تو ان کو ان مراعات سے محروم کر دیا جائے گا جو انہیں شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ یہ تمدنی دنیا میں، سوسائٹی کی دنیا میں ان کی سزا ہے لیکن اس کے بعد جو ان کی اگلی زندگی ہے تو وہاں اس کے ساتھ ہی اس لغزش کے آثار اور اثرات جائیں گے چنانچہ اس کے ساتھ کہا کہ یہاں ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی تہمت تراشی کریں، تحقیق و تفتیش کے بعد ملزم پکڑا نہ جائے، جرم ثابت نہ ہو تو یہاں وہ بچ گیا۔

بدعملیوں کا اخروی زندگی پر اثر

اب یہ فرق قرآن کے مکافات عمل کے قانون میں اور سوسائٹی کے قانون میں آتا ہے۔ ہماری سوسائٹی کے قانون میں جو شخص بھی اس طرح بچ جائے اس کے خلاف پھر کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جرائم عام ہی اسی لیے ہو رہے ہیں کہ کوئی شخص یونہی سہواً کوئی جرم کرتا ہے تو وہ پکڑا جاتا ہے، سزا بھی پاتا ہے، ورنہ عادی مجرم تو پہلے سے اس قسم کی تدابیر اختیار کر لیتے ہیں کہ الزام ہو، تو جرم ثابت نہ ہو، جرم ثابت بھی ہو جائے، تو سزا ہی نہ ملنے پائے، سزا بھی ہو تو اس کے بعد پھر رعایت ہی رعایت ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ جیل کے اندر ایسی سہولت اور آرام کی زندگی ملتی ہے کہ باہر بھی اس جیسی نہیں ملتی۔ ہمارے ایک دوست سنایا کرتے تھے کہ فلاں شخص آ کر منتیں کرتا ہے، رشوت دیتا ہے کہ خدا کے لیے مجھے جیل میں بھیج دو۔ اس دنیا میں، اس سوسائٹی کے نظام میں، اس سوسائٹی کے قوانین کی رو سے، تو مجرم یہ کچھ کر سکتا ہے۔ اس کے خلاف گواہ نہیں مل سکتے، شہادتیں نہیں مل سکتیں لیکن وہ جو اس جرم کا انسان کی اپنی ذات پہ اثر ہوتا ہے جسے وہ آخرت کی زندگی کہتا ہے وہ اس پر رہتا

---

❶ جو لوگ ایسی پاک دامن عورتوں کے خلاف، جو بدکاری کے نام تک سے ناآشنا ہوں، تہمت تراشیں، انہیں (اس سزا کے علاوہ جس کا ذکر پہلے (24:4) میں کیا جا چکا ہے) حقوق شہریت سے محروم کر دینا چاہیے اور آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے۔ (لیکن بایں ہمہ ان سے جو سلوک، ان کے انسان ہونے کی رو سے کیا جاتا تھا، یہ اس سے محروم نہ کیے جائیں۔ مجرم بہرحال انسان تو رہتا ہے۔ اسے انسانی سلوک سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔799)

ہے۔ دنیا میں عمل کے تقاضے کی تو یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ مثلاً اگر کوئی ملزم حقیقت کو چھپا کر دنیاوی عدالت سے بری بھی قرار پائے تو آخرت میں وہ اپنے جرم کی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ اس لیے کہا کہ **یَوۡمَ تَشۡهَدُ عَلَيۡهِمۡ اَلۡسِنَتُهُمۡ وَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ** (24:24) اس دن تو خارج سے کسی گواہ اور شاہد کے لانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مجرم کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھیں خود اس کے خلاف گواہی دیں گے اور صاف صاف بتا دیں گی کہ اس نے کیا کیا تھا۔

اعمال نامہ انسان کی گردن میں پڑا ہوتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم کے سمجھانے کا یہ عجیب انداز ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ اعمال نامے کے متعلق تمہارے ذہنوں میں ہے کہ کوئی بیٹھا ہوا لکھ رہا ہے' کہیں وہ رکھا ہوا ہے' پھر وہ سامنے لایا جائے گا۔ اس نے یہ کہا ہے کہ وہ تو ہر وقت تمہاری گردن میں پڑا ہوا ہوتا ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ اب یہ لپٹا ہوا ہے' اس وقت کھول دیا جائے گا اور پھر تم سے کہا جائیگا کہ **اقرآء** (17:14) یہ اپنا اعمالنامہ' جو فرد جرم تمہارے خلاف لگی ہے' تم خود ہی اس کو پڑھو اور اس کے بعد یہ ہے کہ پھر اپنے اعمال کا حساب بھی آپ ہی کرو اور خود ہی بتاؤ کہ تمہیں کیا سزا ملنی چاہیے۔ وہ جو قانونِ مکافات (Raw of Respite) ہے' اس کی یہ کیفیت ہے۔ وہ انسان کی اپنے اندر کی بات کے اوپر سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ **نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ o الَّتِىۡ تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـِٕدَةِ** [1] (104:6-7) یہ جہنم کی آگ کے متعلق کہتا ہے کہ اس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں۔ یہ تو وہ سزا ہے' جس کے شعلے دلوں کو لپیٹتے ہیں کہ اس کے لیے تو باہر سے کہیں شاہد اور گواہ اور یہ کچھ لانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اس لیے **يَوۡمَئِذٍ يُّوَفِّيۡهِمُ اللّٰهُ دِيۡنَهُمُ الۡحَقَّ وَ يَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَـقُّ الۡمُبِيۡنُ** (24:25) اس دن ہر شخص کے ہر عمل کا پورا پورا نتیجہ مل کر رہے گا اور وہاں یہ حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آ جائے گی کہ واقعی یہ قانون مکافات (Law of Respite) ایک حقیقت ثابتہ (Established Fact) ہے۔

قرآن میں خبیث اور شریف انسانوں کی پہچان کا ذکر

عزیزان من! اب قرآن آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ غلط معاشرے کے اندر سب سے بڑی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ اس میں شریف اور خبیث انسانوں کی ہی شکل میں سامنے آتے ہیں اور پہچانے نہیں جاتے۔ یہ خبیث وہی لوگ ہیں جنہیں ہم آج کی زبان میں بدمعاش کہتے ہیں۔ قرآن میں خبیث اور شریف کے الفاظ آئے ہیں۔ معاشرے کے اندر یہ سارے ہی انسانوں کی شکل میں ہوتے ہیں' پہچانے نہیں جاتے اور ہم یہیں سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ آپ ذرا غور کیجیے' جنگل میں شیر بھی پھرتے ہیں' چیتے بھی پھرتے ہیں' بھیڑیئے

---

[1] یہ خدا کے قانون مکافات کی بھڑکائی ہوئی وہ آگ ہے' جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1482-1483)

بھی ہوتے ہیں' ہرن بھی ہوتے ہیں' ہرن اور بکری کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ شیر ہے' وہ انہیں کھا جائے گا۔ وہ دور سے ان کی آہٹ سنتے ہیں' دھاڑ سنتے ہیں' سونگھ لیتے ہیں' فوراً اپنی اپنی حفاظت کا سامان کر لیتے ہیں۔ وہ تو کبھی ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنا سامانِ حفاظت نہ کر سکیں تو کہیں پکڑے جائیں لیکن عزیزان من! اگر یہ شیر' شیر کی شکل میں نہ ہو' ہرنوں کی شکل میں ہو' تو پھر تو کوئی بھی ہرن نہ بچ سکے۔ وہاں پھر یہ بھی ہے کہ شیر اپنی ہیئت بدلنے پہ قادر نہیں ہوتا' وہ کھلے بندوں شیر کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ یہ مصیبت تو ان انسانوں کے جنگل کے اندر ہے کہ یہ کم بخت خونخوار بھیڑیا ہرن کی شکل میں آتا ہے' بکری کی شکل میں آتا ہے' انسانوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان میں سے کون بھیڑیا ہے' کون بکری ہے۔ کتنے بھیڑیئے' کتنے خونخوار شیر ہیں جنہیں دنیا میں ہم لوگ خود ہرنوں اور بکریوں کی طرح دودھ پلا پلا کر پالتے ہیں اور اس کے برسوں بعد جا کر پتہ چلتا ہے کہ ارے! یہ تو بڑا خونخوار شیر تھا۔ یہ ہر انسان جو انسانوں کی شکل میں رہتا ہے' یہ انسانوں کا بڑا دھوکا ہے۔ یہیں سے تو انسان مار کھاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ باطل معاشرے میں یہ ہوتا ہے۔ صحیح معاشرے کے متعلق اس نے ایک جگہ کہا ہے کہ وہاں مجرموں کو' جرائم کی نیت رکھنے والوں کو' یہ پہلی آواز ہوگی کہ شریف انسانوں سے الگ ہو جاؤ تا کہ یہ تم سے دھوکا نہ کھا جائیں۔ وہاں' **وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ** ❶ (36:59) کہا ہے۔ خونخوار بھیڑیئے ان ہرنوں اور بکریوں کے گلے (ریوڑ) سے الگ ہو گئے۔ معاشرے میں یہ بڑی چیز ہے کہ اگر شریف انسانوں کو محتاط کر دیا جائے کہ ان لوگوں سے بچنا' تو اس سے بڑی حفاظت ہو جاتی ہے۔

معاشرے میں شریف انسانوں کے تحفظ کے لیے قرآن کا پہلا اعلان

قرآن کا یہ بڑا عمدہ انداز ہے کہ اس کے اندر یہ پہلا اعلان ہوتا ہے کہ کوئی بھیڑیا بکری کی شکل کے اندر یہاں نہ رہے' اس جنگل میں بھیڑیا بھیڑیا بن کر نظر آئے اور الگ ہو جائے۔ دوسری جگہ ہے کہ **يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ** (55:41) مجرموں کی پیشانی پہ لکھا ہوا ہوگا کہ یہ مجرم ہیں' پہچان لو۔ مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانا جائے۔ آج ہر جگہ دھوکا ہی دھوکا ہے۔ یہ اسی وجہ سے ہے کہ معاشرے میں یہ انتظام نہیں ہے۔ جب معاشرے میں یہ زیادہ سے زیادہ ہو جاتا ہے تو یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد کہیں ان کی تحقیق و تفتیش کے لیے آوازیں اٹھتی ہیں۔ اگر شروع میں یہ کہیں تحقیق ہو جائے کہ یہ شیر ہے' یہ بکری ہے' یہ بھیڑیا ہے' تو بکریاں اور ہرن اپنی حفاظت کا سامان پہلے ہی کر لیں' ان سے پھر نہیں مار کھا سکتے۔

قرآن نے کہا کہ یہ کچھ صحیح معاشرے کے اندر ہوتا ہے۔ شریف خبیث سے الگ نظر آتا ہے۔ اس کے لیے صحیح نظام عدل کی ضرورت ہے۔ جب وہ صحیح نظام عدل قائم ہو جائے تو اس میں ایسے مواقعات شاذ و نادر ہی ہو سکیں گے اور آخروی زندگی میں تو اس کا

---

❶ اس زندگی میں معاشرہ مخلوط نہیں رہے گا۔ مجرم اور شریف الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔ کوئی مجرم شریف بن کر دوسروں کو دھوکا نہیں دے سکے گا۔ نہ ہم اہل جہنم جنت کی آسائشوں میں شریک ہو سکیں گے۔ (پرویز: مفہوم القرآن' ص۔1028)

امکان ہی نہیں ہوگا۔اسی وقت اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَ الْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ ۚ وَ الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَ الطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ (24:26) یہ خباثت آلود باتیں خبیثوں کے شایان شان ہوتی ہیں اور وہ انہی کے لیے ہوتی ہیں' خوشگوار باتیں' خوشگوار لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔طیب چیزیں طیبات کے لیے ہوتی ہیں' وہ انہی کے لیے شایان شان ہوتی ہے۔انہیں مخلوط نہیں کیا جانا چاہیے۔کسی طیب زندگی گزارنے والے کے یہ شایان شان ہی نہیں ہے کہ اس سے کسی قسم کی مذموم حرکت سرزد ہو۔دوسری طرف اس کے یہ عام معنی بھی لیے جاتے ہیں کہ شادی کے وقت جہاں تم بہت سی چیزیں دیکھتے ہو' یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کسی خبیث مرد کی شادی کسی طیب عورت سے نہ کر دی جائے۔یہ بھی ساتھ دیکھو' بلکہ بنیادی طور پہ یہ دیکھو۔یہ بہت ان جوڑ میل ہوتا ہے۔ معاشرے کے اندر اس کی بھی تحقیق کرو۔یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب معاشرہ ابھی باطل معاشرے کے اندر مخلوط ہو۔جب صحیح معاشرہ قائم ہو جاتا ہے تو اس میں تو یہ لوگ چھٹ کے الگ ہو جاتے ہیں یا ان لوگوں کو تو الگ کر دیا جاتا ہے۔نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے ہی جو آخری دن تھے' جن میں یہ معاشرہ قائم ہو گیا تھا' تو اس میں جنہیں منافقین کہا جاتا ہے' بالکل الگ کر دیا گیا تھا۔اس سے پہلے معاشرے کے اندر یہ رہے' بڑی سازشیں کرتے رہے' پھیلاتے رہے' پھر یہ جو باقی معاشرہ تھا' جسے مومنین کا معاشرہ کہتے ہیں' طیبات پر مبنی تھا۔اس میں یہ لوگ نہیں رہے' الگ کر دیئے گئے۔قرآن نے کہا کہ یہ ہے وہ طریقہ جس میں لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ (24:26) ان کے لیے سامانِ حفاظت بھی ہے اور عزت کی روٹی بھی ہے۔صحیح معاشرے میں جہاں قرآن نے رزق کا' روٹی کا' ذکر کیا ہے ہمیشہ اسے رزقِ کریم کہہ کر پکارا ہے کیونکہ روٹی تو ہر ذی حیات کو ملتی ہے لیکن جو عزت کی روٹی ہے یہ شرف انسانیت کا باعث ہے۔کہا کہ یہ سامان ہم اس معاشرے میں کرتے ہیں جہاں طیب لوگ بستے ہیں اور وہ جو طیبات کی چیزیں ہیں' وہی ان کے شایان شان ہوتی ہیں۔یہ عجیب خوشگوار معاشرہ بن جاتا ہے۔

عزیزان من! یہ جو اس قسم کی تمدنی' عائلی' جنسی' زندگی تھی ان کے متعلق ہدایات دینے کے بعد اب آپ آگے بڑھیے۔بظاہر نظر آئے گا کہ یہ تو بڑی پیش پا افتادہ سی باتیں ہیں۔جن کے متعلق ہدایات دی ہیں۔جیسا میں نے کہا ہے کہ ان کے متعلق بڑی تفصیل سے ہدایات دی ہیں اس کے برعکس جنہیں ہم اپنی دانست میں بڑے بڑے اہم مسائل کہتے ہیں' ان کے متعلق تفصیل نہیں دی۔

سوسائٹی کے متعلق قرآنی آداب

عزیزان من! یہاں کا معاشرہ جس قدر اُخروی معیارِ عدل کے مطابق ہوتا جائے گا' اسی قدر اس میں زندگی' جنتی زندگی کے مماثل ہوتی جائے گی۔اس لیے کہا کہ اب اگلا حکم سنو! یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا (24:27) اے جماعت مومنین! جب بھی کسی دوسرے کے' غیر کے' گھر میں آؤ تو جب تک اجازت نہ ملے اندر نہ جاؤ۔نظر بظاہر ذہن

میں یہ آئے گا کہ یہ تو سوسائٹی کی عام پیش پا افتادہ باتیں ہیں۔ اس میں ایک تو یہ نظر آتا ہے کہ جس زمانے میں ظہور اسلام ہوا' نبی اکرم ﷺ کا ظہور ہوا' اس وقت عام سوسائٹی کی حالت کیا تھی۔ وہ تو آگے چل کر اور تفصیل سے آتا ہے کہ انہیں جب نبی رسول ﷺ کھانے پر بلاتے ہیں تو یہ ایسے وقت آ بیٹھتے ہیں جب ہنڈیا ابھی چولہے پہ دھری ہوئی ہوتی ہے۔ کہا کہ تم سوچتے نہیں ہو کہ بلانے والے بیچارے کو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ ارے! وہ کھانا تیار ہونے کے وقت سے پہلے ہی جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ نبی کچھ نہیں کہتا ہے لیکن سوچو کہ اس سے ان کو کتنی تکلیف ہوتی ہے اور پھر کھانے کے بعد باتیں کرنے بیٹھ جاتے ہو یعنی یہ آپ ﷺ کو کوئی اور کام ہی نہیں کرنے دیتے۔ یہ کچھ بھی قرآن میں کہا گیا ہے۔ بات تو یوں نظر آتی ہے کہ یہ اس زمانے کے دورِ جاہلیت ہی کے متعلق ہے لیکن یہ جہالت صرف اس دور تک ہی محدود نہیں ہے' یہ ہر دور میں رہتی ہے۔ آج ہمارے ہاں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔

پہلی بات یہ کہی ہے کہ اگر کسی کے گھر جانا ہو تو پہلے اجازت لو۔ آپ دیکھیے کہ دوسرے کی Privacy (تخلیے) کا' دوسرے کی مصروفیت کا کتنا خیال رکھا گیا ہے۔ آگے دیکھیے قرآن کہتا ہے کہ اگر اجازت ملے تو وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَهْلِهَا ❶ (24:27)۔ سب سے پہلی چیز ان کو یہ کہو کہ ''سلامتی ہو تمہاری طرف' میں تمہارے لیے سلامتی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ ڈرو نہیں' کوئی دشمنی کی بات کرنے کے لیے نہیں آیا' میرا آنا تمہارے لیے سلامتی کی نوید ہے'' پھر یہ کہا کہ بات تو یہ بڑی چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ❷ (24:27) اگر تم اس کے پابند ہو جاؤ گے تو تم دیکھو گے کہ یہ بہت بڑی اچھی بات ہے۔ اس سے آگے چل کر بہت اچھی اچھی باتیں آئیں گی ان کے نتائج بہت اچھے نکلیں گے۔ کہا کہ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ❸ (24:28) اگر وہاں کوئی اندر نہ ہو' تو پھر تو اندر جانے کا سوال ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی اندر ہے تو اس صورت میں بھی جب تک اجازت نہیں ملتی' اندر نہ جاؤ۔ اور اگلی بات ہے' جہاں روز ہمارے ہاں تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وَ اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا (24:28) اگر وہ یہ کہے کہ صاحب! اس وقت معاف کیجیے گا' ہم مصروف ہیں تو دل میں اس کے متعلق کوئی کشیدگی نہ پیدا کرو' سلام علیکم کہہ کر واپس آ جاؤ۔ آپ یہ کر کے دیکھیے پھر دیکھیے کہ اس کے کتنے خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

میں ذاتی باتوں کو کبھی درمیان میں نہیں لایا کرتا' بعض اوقات وہ یونہی چھلک کر باہر آ جاتی ہیں۔ بہرحال' آپ اتنا عرض سنیں کہ میرا صبح کا جو وقت ہوتا ہے' وہ قرآن کریم کے متعلق مختص ہوتا ہے۔ ساری عمر میں نے یہی لکھا ہے۔ وہ وقت اسی طرح قرآن کے لیے مختص ہوتا

---

❶ اور تمام اہل خانہ کو سلامتی کی دعائیں دو' اور ان کے لیے نیک آرزوئیں لے کر جاؤ۔

❷ ان آداب معاشرت کی نگہداشت تمہارے لیے بہتر ہے تاکہ تمہارا معاشرہ انسانی روابط کے عمدہ ترین اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔

❸ اگر تم دیکھو کہ اس گھر میں کوئی نہیں' تب بھی اس کے اندر نہ جاؤ۔ کوئی شکل بھی ہو' دوسروں کے گھروں میں صرف اس صورت میں داخل ہو جب تمہیں اس کی اجازت مل جائے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1۔2۔3(800))

ہے۔ عام طور پہ میرے گھر کے بچوں کو بھی یہ پتہ ہوتا ہے' انہیں بھی کچھ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے' وہ اتنا سا بچہ ذرا سا دروازہ کھول کر جھانک لیتا ہے اور اندر جا کر کہا کرتا ہے کہ ''بابا تو مصروف ہیں'' لیکن صاحب! باہر والوں کی صورت یہ ہے کہ چوہدری صاحب! چلے آ رہے ہیں اور وہ اندر کمرے تک جا کر کہتے ہیں: پرویز صاحب! اور پرویز صاحب پتہ نہیں کہاں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیا چیز سامنے ہوتی ہے؟ قلم ہاتھ میں' قرآن سامنے ہے۔ ''جی صاحب! تشریف لائیے''۔ وہ صاحب کہتے ہیں کہ ''میں یہاں سے گزر رہا تھا اور کتنے ہی دن ملے ہوئے ہو گئے' میں نے کہا بھئی! کوئی سلام ہی کرتا جاؤں''۔ ''شکریہ جی' آپ کا' جناب بیٹھیے''۔ اب وہ اس کے بعد خود ہی تشریف رکھتے ہیں۔ ''ارشاد''؟ نہیں' بات تو کوئی نہیں' وہ ایسے ہی میں نے کہا طبیعت کا پوچھ لوں۔ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے بیٹھے ہوئے اگر قلم اٹھا کر ادھر کر لیا جائے تو وہ گیا: ''کل ابھی دفتر میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے' بڑے آدمی ہو گئے' اب ان کی کیفیت یہ ہے' ان کا دماغ ہی عرش پہ چڑھ گیا ہے۔'' یہ چوہدری صاحب کو اندر بٹھانے کے بعد کا حال ہے۔ اور اگر کہیں یہ کہہ دیا جائے' اور میں تو اس کی جرأت ہی نہیں کیا کرتا' کہ صاحب! ذرا معاف رکھیے گا اس وقت تو میرے کام کا وقت ہے' آپ تو..... کسی سے یہ کہہ کے دیکھیے اور پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

ملاقات کے لیے وقت مقرر کر لینے کی اہمیت

دراصل کوئی وقت مقرر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔ جسے By Appointment (تعین وقت برائے ملاقات) کہا گیا ہے' اس کے لیے دوسرے سے پوچھو کہ بھئی! تمہارے پاس ملنے کے لیے کوئی فارغ وقت ہے' ہاں البتہ اگر ایسی اشد ضرورت آ پڑے مثلاً حادثہ ہی ہو جائے تو وہ الگ بات ہے۔ معمول تو یہ ہونا چاہیے کہ ملاقات کے لیے پہلے سے وقت کا تعین کر لیا جائے۔ یہ چیزیں ہم روز کہتے ہیں کہ صاحب! مغرب کے معاشرے والے بہت کام کر لیتے ہیں۔ وہ اس لیے کر لیتے ہیں کہ چوہدری صاحب کہلوانے والے ہر پانچ منٹ کے بعد ان کے پاس نہیں آ پہنچتے۔ ان کے ہاں By Appointment (تعینِ وقت برائے ملاقات) کی صورت ہوتی ہے اور اس کا کوئی برا نہیں مناتا۔ یہاں آپ کے ہاں حکماً قرآن کریم میں یہ چیزیں دی ہوئی ہیں اور کتنی اہم چیزیں ہیں۔ یہ کہا کہ **هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ** [1]۔ (24:28) انسانی صلاحیتوں کی نشوونما چاہتے ہو تو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی ضروری ہیں۔ By Appointment (تعین وقت برائے ملاقات) کے سلسلے میں یہ جو ہر پانچ منٹ کے بعد Interruption (مداخلت) ہوتی ہے' اس کا تو پوچھو ہی نہیں۔ یہ بات یہاں تک ہی نہیں ہے۔ یہ جو ٹیلیفون ہے ہمیں تو آج تک سمجھ میں بات نہیں آئی کہ آیا یہ کوئی مفید چیز ہے یا نقصان دہ۔ ٹیلیفون کرنے والا اپنی Convenience (سہولت) کے تحت ڈائل گھماتا ہے' دیکھتا ہی نہیں کہ جو

---

[1] ان امور کی نگہداشت' سے تمہارے حالات سنورے رہیں گے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔800)

اگلا ہے وہ کس حالت میں بیٹھا ہے۔ توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ ہر وقت ٹیلیفون کے سر پہ بیٹھا ہو۔ دو چار دفعہ یہ گھماتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ اویارا کتھے گیا ہیگا اے توں؟ ٹیلیفون چکدا ای نئیں پیا ❶ یعنی میں اسی کام کے لیے بیٹھا ہوا ہوں کہ آپ نے یہ کیا: ''حاضر ہوں جناب سرکار' کیا حکم ہے''۔ آپ کا ٹیلیفون ہو رہا ہے' سارا گھر بھاگا دوڑا ہوا آ رہا ہے: ''ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے''۔ یہ ایک اور عجیب چیز ہے۔ دوسرے کا جو وقت ہے' اس کے متعلق خیال ہی نہیں ہوتا۔ وہ صرف اپنی Convenience (سہولت) کے تحت ٹیلیفون کرتا ہے۔ ''بھئی! اس کو ذرا ٹیلیفون دینا''۔ ''او کیندے آ' ذرا پانچ دس منٹ کے بعد کرنا' ابھی میں کچھ کام کر رہا ہوں۔ ❷ اچھا' تو دس منٹ کے بعد کروں' کیا وہ کوئی ضروری کام کر رہے ہیں؟ یعنی وہ جسے ٹیلیفون کیا جا رہا ہے اس کے متعلق کچھ خیال ہی نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ باتیں بڑی چھوٹی چھوٹی سی ہیں لیکن آپ دیکھیے کہ یہ معاشرے کے اندر کتنی ضروری ہیں۔ قرآن ان کے متعلق ہدایات دیتا ہے کہ **لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ** ❸ (24:29)۔ یہاں جزئیات کی کیفیت دیکھیے۔ کہا کہ' ایسے مقام مثلاً کمرے' گودام' وغیرہ' جہاں تمہارا کچھ سامان رکھا ہوا ہے' جہاں کوئی بستا بھی نہیں ہے' وہاں جا کر ضرورت نہیں ہے کہ تم دروازہ کھٹکھٹاؤ اور کہو کہ جی' حاضر ہو جاؤں' کیونکہ یہاں تو کوئی اندر ہے ہی نہیں۔ لیکن اگر وہ مقام مثلاً کمرے' گودام وغیرہ مشترکہ ہے اور تم اس میں اکیلے داخل ہو رہے ہو تو تمہارے دل میں کسی قسم کی بدیانتی کا خیال نہیں آنا چاہیے۔

اس کے بعد ایک بڑی عجیب بات کہی ہے کہ **وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَ) كْتُمُوْنَ** ❹ (24:29)۔ اگر ایسا گودام بھی ہے جہاں مشترکہ مال رکھا ہے' تمہارا بھی ہے' اور کسی اور کا بھی ہے' تو وہاں یہ ٹھیک ہے کہ تم اجازت نہیں لے رہے لیکن خدا تمہارے دل کو جانتا ہے کہ تم کس نیت سے اندر جا رہے ہو۔ وہاں کوئی ہے نہیں' مشترکہ مال رکھا ہے' ہر وقت یہ بات بھی نہیں ہے کہ تم اسے جو تمہارا دوسرا ساتھی ہے جو تمہارا Partner (حصے دار) ہے اس کو ساتھ لے کر آؤ' تم دونوں کے پاس چابیاں ہونگی۔ اب صورت یہ ہے کہ نہ اندر سے کوئی آواز دینے والا ہے' نہ کوئی دوسرا تمہارے ساتھ ہے اور اندر مال مشترکہ ہے تو اس صورت میں کیا ہوگا؟ اس آیت (24:29) میں کہا ہے کہ اب یہاں یہی صورت ہوگی کہ یہ سوچ اپناؤ کہ ایک دیکھنے والا بھی ہے جس کا قانونِ مکافات (Law of Requital) اچھی طرح جانتا ہے کہ تم ظاہر کیا کرتے ہو اور دل میں کیا چھپاتے ہو۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کہاں تک جاتا ہے! کہا کہ وہاں یہ خیال رکھو۔

---

❶ ارے دوست! تم کہاں چلے گئے ہو؟ ٹیلیفون ہی نہیں اٹھاتے ہو۔

❷ وہ کہتے ہیں کہ ذرا پانچ دس منٹ کے بعد ٹیلیفون کرنا' میں ابھی کام کر رہا ہوں۔

❸ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم ایسے مکانات میں بلا اجازت داخل ہو جاؤ جن میں کوئی بستا نہیں' اور ان میں تمہارا سامان رکھا ہے۔

❹ یاد رکھو! خدا کا قانون مکافات اچھی طرح جانتا ہے کہ تم کیا ظاہر کرتے ہو اور دل میں کیا چھپاتے ہو۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔2،3(800))

بے حیائی کا پہلا دروازہ انسانی آنکھ ہے

یہ جزئیات دینے کے بعد' قرآن پھر معاشرے کی طرف آتا ہے۔ جیسا کہ میں نے اس سورت کے پہلے ہی درس میں کہا تھا کہ یہ جو حفاظت عصمت ہے' یہ بڑا بنیادی مسئلہ ہے۔ قرآن اس پہ بڑا ہی زور دیتا ہے اور میں نے اس دن آپ کو مغربی محققین کی تحقیقات کی رو سے بتایا تھا کہ اس کا تعلق صرف افراد سے ہی نہیں' قوموں کے عروج و زوال سے بھی اس کا بنیادی تعلق ہے۔ اس لیے قرآن کریم میں آپ دیکھیں گے کہ اس کے متعلق بڑی تفصیل سے کہا گیا ہے۔ بے حیائی کی باتیں تو آگے جا کر رہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسے دروازے ہیں' جہاں سے یہ چور اندر گھستا ہے؟ پہلا ہی کھلا ہوا دروازہ تو آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ تو اسے بڑا دِ فتنہ کہتا ہے:

ہے چشم نیم باز اگر خواب ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے

یہ تو در فتنہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ **قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ** (24:30) اے رسول! جماعت مومنین سے کہہ دو کہ اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دو' اس سے تم اپنی عصمت کی حفاظت کر سکو گے۔ کیا بات ہے! ان دونوں کے اندر گہرا تعلق بتا دیا۔ قرآن کریم جرم سرزد ہونے کے بعد کی سزاؤں پر ہی نہیں آتا' وہ تو کبھی ہی ہوتا ہے۔ وہ پہلے حفاظتی تدابیر بیان کرتا ہے تا کہ یہ کچھ ہونے ہی نہ پائے۔ یہاں کہا ہے کہ **يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ** [1] (24:30)۔ کتنا گہرا تعلق ہے! ہم زور دے رہے ہیں کہ حفاظت عصمت و عفت نہایت ضروری چیز ہے۔ اس کے لیے ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ چور اس راستے سے آتا ہے' اس لیے نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دو کیونکہ **ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ** (24:30) انسانی ذات کی نشو و نما' قلب و نگاہ کی پاکیزگی سے ہوتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے آپ تزکیہ کہتے ہیں یعنی اس سے انسانی صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہیں۔ اس میں پہلی چیز یہ ہے کہ نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دو۔

نگاہوں کو بیباک نہ ہونے کا حکم پہلے مرد کو ہے اور بعد میں عورت کو

عزیزان من! یہ دیکھیے کہ پہلے مردوں سے کہا ہے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں' انہیں بیباک نہ ہونے دیں۔ یہ وہ کھڑکیاں ہیں جن سے انسان کے دل میں چور داخل ہوتے ہیں اور معاشرے میں بے حیائی کے راستے کھلتے ہیں۔ اور آگے کہا ہے کہ **وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ** [2] (24:31)۔ یہ بعد میں عورتوں سے کہا ہے۔ بنیاد تو مرد ہوتا ہے مگر ہم

---

[1] مومن مرد اپنی گاہوں کو آوارہ اور بیباک نہ ہونے دیں۔ اور (اس بات کا خیال رکھیں کہ) ان کی عفت داغدار نہ ہونے پائے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔801)

[2] اسی طرح مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہوں کو آوارہ اور بیباک نہ ہونے دیں اور اپنی عفت کی پوری پوری حفاظت کریں۔ (مفہوم القرآن' ص۔801)

سارے الزام عورت پہ دھرتے ہیں۔ مرد پاک دامن رہنا چاہے تو عورت کیا کرلے گی۔ ابتدا تو مرد کرتا ہے۔ لہٰذا اے رسول ﷺ! ان سے کہو کہ اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں۔ لفظ ''بصر'' کے معنی تو ہمارے ہاں یہ کیے جاتے ہیں کہ نگاہیں نیچی رکھے اور اس کے بعد پھر مسائل چلتے ہیں کہ صاحب! نیچی نگاہ رکھ کر وہ صحرا میں کیسے چلے' جنگل میں تو شاید چل بھی جائے پھر یہ سڑکیں ہیں' ہماری چار چار آنکھیں بھی کھلی ہوئی ہوں تب بھی Accident (حادثے) ہوتے ہیں تو یہ یوں نگاہ کرنے کی بات نہیں ہے۔

آنکھیں نیچی رکھنے سے مراد کیا ہے؟

یہ جو میں نے کہا ہے کہ آنکھیں نیچی رکھو تو بات اصل میں یہ نہیں ہے' نہ ہی یہ وہ بات ہے جو خواتین سے' عورتوں سے' کہا ہے کہ نگاہیں یوں نیچی رکھیں۔ اس کے بعد تو ہمارے ہاں وہ نقاب آ گیا جو بندھا ہوا ہوتا ہے' اس کے اندر چار آنکھیں بھی کھول لیں تب بھی کچھ نہیں پتہ چلتا۔ اب یہ جو بات ہے کہ نگاہیں یوں رکھ لینا تو سنیے' عزیزان من! قرآن کیا عجیب چیز کہتا ہے' غور کیجیے۔ کہا کہ یہ جو ہم نے کہا ہے کیا تم نے یہ سنا؟ یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ احتیاط برتو' تاکہ اس سے تمہارے دلوں کے اندر حفاظتِ عصمت قائم ہو' حفاظتِ عصمت وعفت کا تصور قائم ہو اور تمہاری نگاہیں اس خیال سے بیباک نہ ہوں کیونکہ **اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ** (24:30) خدا کا قانون مکافات اس سے خوب واقف ہے کہ کس عمل کو محض مشینی طور پر اختیار کیا جاتا ہے اور کونسا عمل دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے' اس لیے پتہ ہے کہ کیا کرو گے۔ اگر خدا پہ ہمارا ایمان نہ ہوتا کہ وہ خبیر وعلیم ہے تو ہم کہتے کہ پتہ نہیں اونوں۔ اُتے عرش تے بیٹھا ہیگا اے۔ ایتھے آ کے اوکی دیکھے گا![1] میری بیٹیاں' میری بہنیں' معاف رکھیں۔ برقعے وہ ایجاد ہو گئے کہ برقعے سے تو کچھ نظر نہیں آتا مگر برقعے کے اندر سے زیادہ کچھ دیکھا جاتا ہے۔ یوں چلنے والے' جن کی نگاہیں یوں ہیں' وہ کن اکھیوں سے کیا کچھ کر جائیں گے جو آنکھیں پھاڑ کر نہیں کر سکتے اس لیے کہا کہ **اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ** (24:30)۔ عزیزان من! میں تو تشریح نہیں کر سکتا کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ اصل شے تو دل کی پاکیزگی کی ہے ورنہ جو باقی چیزیں ہیں وہ تو یصنعون ہیں۔ یہیں سے لفظ مصنوعی نکلا ہوا ہے۔ یصنعون کیا لفظ ہے!

ہم جانتے ہیں کہ اگر دل میں یہ بات نہ ہو تو پھر تو پوچھو نہیں کہ صنعت گری کے کیا کیا طریقے ہوتے ہیں۔ معاف رکھیے' ہے تو یہ غزل کا شعر لیکن بات کچھ یونہی یاد آ گئی:

کس قدر حسن بھی مجبور کشاکش ہے کہ آہ
سر جھکائے نہ بنے آنکھ اٹھائے نہ بنے

''سر جھکائے نہ بنے' آنکھ اٹھائے نہ بنے''۔ دیکھتے ہیں یہ کیفیت! یہ یصنعون کی کیفیت ہے۔ اس نے تو اس کے لیے بہرحال کہنے کا وہ

---

[1] اسے کچھ معلوم نہیں ہے۔ وہ تو عرش پہ براجمان ہے۔ یہاں آ کر وہ کیا دیکھے گا!

انداز رکھا تھا: کس قدر حسن بھی مجبور کشاکش ہے' سر جھکائے نہ بنے آنکھ اٹھائے نہ بنے: اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ ❶ (24:30)۔ یہ ہے کیفیت۔

اب کچھ زینت و آرائش و زیبائش کے متعلق

مردوں سے ایک قدم آگے بڑھ کر قرآن کریم نے کہا کہ اب ان خواتین سے کہو کہ وَ قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنٰتِ یَغۡضُضۡنَ مِنۡ اَبۡصَارِہِنَّ وَ یَحۡفَظۡنَ فُرُوۡجَہُنَّ (24:31) یہ بھی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں اور اپنی عفت کی پوری پوری حفاظت کریں۔ اس کے ساتھ ہی آگے ان کے متعلق کہا کہ وَ لَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَہُنَّ اِلَّا مَا ظَہَرَ مِنۡہَا ❷ (24:31)۔ یہاں نگاہوں تک کی بات نہیں' کچھ آرائش و زیبائش اور زینت کی چیزیں بھی عورتوں میں ہوتی ہیں۔ عزیزان من! میں نے کہا ہے کہ جب عربی زبان اور قرآن کے انتخاب الفاظ پہ آئیں تو غور کی بات ہوتی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وَ لَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَہُنَّ اِلَّا مَا ظَہَرَ مِنۡہَا (24:31)۔ یبدین کے معنی ہیں: ارادتاً کسی چیز کی نمود کرنا' نمائش کرنا۔ ظہر کے معنی ہیں: جو یونہی کوئی چیز خود بخود کھل جائے۔ کہا کہ یہ الگ بات ہے کہ وہ چلتے ہوئے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں' ذرا آستیں چڑھ گئیں' پلو ادھر ہٹ گیا' سر سے کپڑا یوں سرک گیا۔ وہ ''ما ظہر'' والی بات ہے لیکن اصل چیز ہے کہ لَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَہُنَّ (24:31) بالارادہ نمود و نمائش نہ کرے۔ اس میں یہ اتنی ہی چیز نہیں' عزیزان من! کہ اس سے روکا گیا ہے۔ یہ بھی جو چیز ہے' یہ بہرحال دوسروں کی نگاہوں کو تمہاری طرف متوجہ کرے گی' دلکشی پیدا کرے گی' جاذبیت پیدا کرے گی۔ یہ اتنی سی بات نہیں ہے' اس میں بڑی گہری بات ہے۔ یہاں لفظ ''یبدین'' آیا ہے۔ ایک دوسرے مقام پہ یہ کہا گیا ہے کہ وَ قَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ وَ لَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاہِلِیَّۃِ الۡاُوۡلٰی ❸ (33:33)۔ یہاں لفظ ''تبرج'' آیا ہے۔ یہ بھی بڑی گہری بات ہے۔ ان سے کہو کہ ''تبرج'' نہ کریں۔ میں زیادہ وضاحت میں نہیں جا سکتا' نہ جاؤنگا۔ یہ جو تبرج ہے' اس کا مادہ ''ب رج'' ہے۔ اس سے یہ لفظ برج ہے' اس کا ترجمہ اُبھار کیا جاتا ہے۔ یہ نمائش و نمود کا جذبہ ہے جس میں یہ چیز اُبھار کر سامنے لائی جائے۔ یہ ایک ذہنیت (Mentality) ہے۔ زینت اور آرائش کو قرآن نے حرام نہیں قرار دیا بلکہ اس نے تو بڑے زور سے کہا ہے کہ اے رسول! ان سے پوچھو کہ کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے جو ہم نے بنائی ہیں۔ انہیں کون حرام قرار دے سکتا ہے' یوں کہا گیا ہے۔

---

❶ (انہیں یہ بھی سمجھا دو کہ وہ ان آداب کی پابندی محض میکانکی طور پہ نہ کریں۔ انہیں اس طرح اختیار کریں کہ یہ ان کی سیرت کے مظاہر بن جائیں۔ اس لیے کہ) خدا کا قانون مکافات اس سے خوب واقف ہے کہ کس عمل کو محض مشینی طور پر اختیار کیا جاتا ہے (اور کونسا عمل دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے)۔

❷ اپنی زینت و آرائش کی چیزوں کو نمایاں نہ کریں۔ جس قدر وہ چلتے پھرتے از خود ظاہر ہو جائیں' انہیں اتنا ہی ظاہر ہونے دیں۔ انہیں خود نمایاں نہ کریں۔

❸ اور تم نہایت سنجیدگی اور وقار سے اپنے گھروں میں رہو۔ تم سے کوئی چھچھورے پن کی بات سرزد نہ ہو اور جب تم باہر جاؤ تو اپنی زینت کی نمود و نمائش نہ کرو جیسا کہ قرآن سے پہلے عہد جاہلیت میں عورتیں کیا کرتی تھیں۔ اور کوئی حرکت ایسی نہ کرو جو مردوں کے جذبات میں اضطراب و تلاطم پیدا کرنے کا موجب بنے (24:31-60)۔

نمودِ حسن کا جذبہ نہیں ہونا چاہیے

زینت کی چیزیں حرام نہیں ہیں' ان کے اندر سے جو نمودِ حسن کا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ ہے' جس کی قرآن اصلاح چاہتا ہے۔ نمودِ حسن کا یہ جذبہ نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ اس میں ایک بڑی گہری حقیقت ہے۔ قرآن عورت اور مرد کی زندگی کو دو Companions (رفیقوں) کی زندگی بتاتا ہے۔ زندگی کی گاڑی ان دونوں سے چلتی ہے' ہم دوش چلتے ہیں' ان دونوں کے ہاتھوں سے ایک مشترکہ پروگرام سرانجام پاتا ہے' وہ ان کا تعلق ہی باہمی رفاقت رکھتا ہے۔ لفظ رفیقہ حیات ہمارے ہاں بھی رہ گیا ہے اس رفیقہ حیات کو بیوی نہ کہا' رفیقہ حیات کہہ لیا مگر وہ کبھی اپنے خاوند کو رفیقِ حیات نہیں کہتی جبکہ ان کا تعلق رفاقت کا ہے۔ آہستہ آہستہ مرد نے اپنا ہاتھ غالب کرنے کے لیے عورت کے اندر اس قدر احساس کمتری (Inferiority Complex) پیدا کیا کہ اب وہ اپنے لیے مقصد ہی یہ سمجھتی ہے کہ میں مرد کی نگاہ میں Attractive (پرکشش) بنوں یعنی جاذب نگاہ بنوں۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کے پاس کوئی اور خوبی نہیں' اس کے پاس وہ صلاحیتیں نہیں ہیں جن کی بنا پر' رفاقت کے اندر' کچھ فرائض سرانجام دیتے ہیں' جن کی وجہ سے اس کی حیثیت برابری کی ہو۔ یہ صلاحیتیں ہوں تو وہ کچھ کرے۔ یہ تو اور بات ہوتی ہے۔

میاں بیوی کی رفاقت میں بُعد کا نتیجہ

زندگی کے دو رفیق ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی صلاحیتوں کی بنا پہ رفیق ہوتے ہیں۔ اسے یہ کہا گیا کہ تم میں رفاقت کی تو بات نہیں ہے تم تو ہو ہی ناقص العقل' تم تو دنیاوی کام کر ہی نہیں سکتیں' یہ تو سارا ہمارا ہی کام ہے اور آہستہ آہستہ اس کے دل میں جب یہ بات ڈالی تو رفاقت کی کیفیت اس کے دل سے نکل گئی کہ میں رفیقہ ہوں' میں اس کی برابر کی Companion (ہم دوش) ہوں' ہم دوش سفر حیات میں چلنے والی ہوں تو پھر اس کے دل میں وہ بات رہ گئی جس سے Inferiority Complex (احساس کمتری) پیدا ہوا۔ اب اس نے یہ سمجھا کہ میں کسی نہ کسی طرح مرد کی نگاہوں میں جاذب بن کے رہوں۔ اب میری بیٹیاں' بہنیں معاف رکھیں' یہ مردوں کے لیے کھلونا بن کے رہ گئیں۔ قرآن عورت کو یہ پوزیشن نہیں دینا چاہتا۔ وہ دونوں کو انسان کہتا ہے' دونوں کو واجب التکریم کہتا ہے' وہ دونوں کو ایک پروگرام تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک دوسرے کے رفیق کہتا ہے' دونوں کو یکساں صلاحیتوں کا مالک بتاتا ہے' وہ ان میں سے جنس کے اعتبار سے کسی کو غالب اور کسی کو پست نہیں بتاتا۔ قرآن کریم متعدد آیات میں جو صلاحیتیں مردوں کی ہیں' وہی صلاحیتیں عورتوں کی بتاتا جاتا ہے مثلاً اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ..... (33:35)۔ اس سے قرآن عورت کے دل میں احساس کمتری پیدا نہیں ہونے دینا چاہتا اور جب وہ سمجھے گی کہ میں فرائضِ حیات کی ادائیگی میں مرد کے ساتھ ساتھ چل رہی ہوں تو یہ جذبہ ہی پیدا نہیں ہوگا کہ میں ہر وقت اس کی نگاہوں میں Attractive (پرکشش) بنتی رہوں۔ اس رفاقت کے نہ ہونے سے وہ

Attractive (جاذب نگاہ) بنتی ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ ان سے کہو کہ اپنے اندر نمود حسن کا جذبہ نہ پیدا کریں۔ اس سے یہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو کمتر درجے کی سمجھنے لگ جائے گی۔ یہ برابر کی حیثیت سے چلیں۔ ان کے ہاں زینت ٹھیک ہے مگر یہ کہا ہے کہ **وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا** (24:31) وہ بالارادہ اس زینت کی نمود نہ کریں جو یوں ہی از خود ظاہر ہوتا ہے وہ تو انہیں اتنا ہی ظاہر ہونے دیں' اسے خود نمایاں نہ کریں۔

عزیزانِ من! دیکھا اس طرح ظاہر ہونے میں زینت وہ چیز نہیں رہتی کیونکہ وہ از خود ظاہر ہوئی ہے۔ ارادۃً ایسا نہیں کیا گیا۔ آگے کہا کہ **وَ لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ** ❶ (24:31)۔ اس آیت میں لفظ ''خمر'' آیا ہے۔ خمر ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کو ڈھانپ لے۔ جیوب' جیب سے ہے۔ یہ کہتے ہیں ''گریبان کو جو کھلا ہے'' آپ نے دیکھا کہ لفظ کیا تراشا منتخب کیا ہے! یہ گریبان کھلا ہوا ہوتا ہے۔ کہا کہ اس کے اوپر ایک کپڑا ڈال لیا کرو۔ یہ ہے **جُيُوْبِهِنَّ** (24:31)۔ اب رہا یہ کہ باہر نکلنے کی بات ہوئی ہے۔ گھر کے اندر تو وہ چلتی پھرتی ہیں' سارا کام کاج کرتی ہیں۔ جب گھر سے باہر نکلیں تو اس وقت کیا صورت ہو؟ کہا کہ **لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ** ❷ (24:31)۔ یہاں کہا کہ ان کی' زینت و آرائش کی چیزوں کی نمود نہ ہو۔ اس میں دیکھیے کہ جتنے ایسے رشتے ہیں جن کے ساتھ نکاح نہیں ہوسکتا' کہا کہ ان کے اندر تم چلتی پھرتی ہو' تو وہاں تمہارے دل میں نمودِ حسن کا یہ خیال نہیں پیدا ہوگا اس کے لیے کہا کہ چلو پھرو۔ ان رشتوں میں مثلاً باپ ہے' بیٹا ہے' بھائی ہے' یہ ہیں جن میں تم گریباں بغیر ڈھانپے چلو پھرو۔ دل میں آوارہ خیال بیدار نہیں ہوتے۔ انسانی ذہنیت بھی عجیب چیز ہے۔

گھریلو زندگی میں باہمی تصورات

عزیزان من! معاف رکھیے گا' بدمعاش سے بدمعاش نوجوان لڑکا بھی جو باہر کسی کو بھی نہ چھوڑے وہ اپنے گھر کے کسی بھی کمرے میں جہاں اس کی جوان ہمشیرہ سو رہی ہو' سوئے تو اس کے حیطہ تصور میں بھی یہ بات کبھی نہیں آئے گی حالانکہ وہ اس کی جوان بہن بھی ویسی ہی لڑکی ہے جیسی باہر کی لڑکیاں تھیں جن کے لیے اس کی کیفیت یہ تھی مگر وہ اسے یوں کبھی نہیں دیکھ پاتا حالانکہ وہ کہتا ہے کہ ''اسی تاں قد تون پہچان جاندے آں' پئی کون جاندی اے۔ ❸ آپ نے دیکھا کہ قرآن انسان کی ذہنیت پہ کتنا کنٹرول رکھتا ہے اس کے لیے قرآن کریم احتیاطی تدبیریں کرتا ہے۔ یہ انسان کی Pure (خالص) ماہیت قلب ہوتی ہے جس سے وہ لڑکی' لڑکی نہیں رہتی' وہ عورت عورت نہیں رہتی جسے آپ ایک بہن کہتے ہیں' وہ مرد ہی نہیں رہتا جسے وہ بھائی کہتی ہے۔ اس لیے آگے قرآن کریم نے کہا کہ ان میں محارم شامل

---

❶ اپنے اوڑھنے کی چادریں اپنے گریبانوں (سینوں) پر ڈال لیا کریں۔

❷ اپنی زینت و آرائش کی چیزوں کو بالارادہ نمایاں نہ کریں۔

❸ ہم تو قد و قامت سے پہچان لیتے ہیں کہ کون جا رہی ہے۔

نہیں ہیں یعنی وہ جن سے نکاح نہیں ہوسکتا۔ وہ محارم یہ ہیں: اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوَاتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ [1] (24:31)۔ یہ سارے وہ رشتے ہیں جن کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ قرآن نے کہا کہ گھر کے اندر تم نے ان میں چلنا پھرنا ہے بھئی! ٹھیک ہے ان میں چلو پھرو۔ اب ہر وقت یہی چیز تم ذہن کے اندر سمائے ہوئے نہ رہو کہ میری کہیں انگلی نہ نظر آ جائے، ماتھا نہ نظر آ جائے۔ یہاں ان رشتوں میں یہ بات نہیں ہے۔ ذہن کے اندر ان رشتوں میں وہ بات پیدا ہی نہیں ہوسکتی اَوْ نِسَآئِهِنَّ (24:31) یا گھر میں وہ عورتیں ہیں جو کام کاج کرنے والی عورتیں ہیں کہ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ [2] (24:31)۔ اس آیت میں کہا ہے کہ یا وہ بوڑھے گھر کے اندر، وہ جو پرانے خادم بھی ہو جائیں، جن کے ہاتھوں میں تم پلی پوسی ہو، ان کو بھی "بابا جی" کہتی ہو یا یہ چھوٹے چھوٹے بچے جن کو ابھی معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ عورت اور مرد کے تعلقات کیا ہوتے ہیں۔ وہ افراد ہیں جن کے متعلق وہ بات نہیں جو ہم نے پہلے کہی ہے۔

اچھے وقتوں کی ایک یاد

عزیزانِ من! میں نے اوپر بھائی کا لفظ کہا ہے۔ اب ان کے متعلق کہتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ میں یہ کہوں یا نہ کہوں۔ یہ بات اچھے وقتوں کی ہے۔ اب تو ان کو اچھے وقت کہا ہی نہیں جاتا۔ ہمارے ہاں، ہماری پنجابی زبان میں کہا جاتا ہے کہ دیکھ باہر کون ہے؟ تو آ کے ماں نوکینڈی: ماں! کوئی بھائی ہے، باہر کھلوتا ہویا اے۔ [3] ہماری زبان میں غیر مرد کے لیے لفظ "بھائی" آ گیا ہوا تھا۔ عزیزانِ من! یہ ہمارا معاشرہ تھا جو اس زبان کو جانتے ہیں، وہ میرے لیے اس بات کی شہادت دیں گے کہ ہمارے ہاں مرد کے لیے لفظ ہی مرد نہیں تھا۔ کبھی لڑکی اندر جا کے یہ نہیں کہتی تھی کہ باہر ایک مرد کھڑا ہے، وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ کوئی بھائی ہیگا۔ کِنّے ای بھائی او تھے سن [4]۔ مرد کا لفظ ہماری زبان میں نہیں تھا۔ ہمارے ہاں غیر مرد کے لیے لفظ ہی بھائی تھا۔ یہ بتاتا ہے کہ ہمارے ہاں ذہنیتیں (Mentalities) کیا تھیں اور یہ واقعی اس

---

1. اپنے خاوندوں کے علاوہ باپ، سسر (خاوند کا باپ)، ان کے بیٹے یا خاوند کے بیٹے (یعنی ان کے حقیقی بیٹے یا سوتیلے بیٹے)، بھائی، بھتیجے، بھانجے، یا (اپنے ہاں کی جانی پہچانی) عورتیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔802)
2. یا وہ غلام اور لونڈیاں (جو اس زمانے میں عربوں کے ہاں کام کاج کیا کرتے تھے، قرآن نے انہیں رفتہ رفتہ آزاد معاشرے کا جزو بنا دیا اور آئندہ کے لیے غلامی کا دروازہ بند کر دیا) یا دیگر خدمتگاروں میں سے ایسے بوڑھے جو جنسی خواہش سے آگے گزر چکے ہوں یا ایسے بچے جو عورتوں کے پردے کی باتوں (جنسیت) سے ہنوز ناآشنا ہوں۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔802)
3. باہر جا کر دیکھو کہ کون آیا ہے؟ وہ آ کر ماں سے کہتی ہے کہ امی! کوئی "بھائی" آ کر باہر کھڑا ہے۔
4. کوئی "بھائی" ہے۔ وہاں کتنے ہی "بھائی" تھے۔

زمانے کی بات ہے' جہاں اپنے ''مرد'' ❶ کے سوا دنیا کا ہر مرد ''بھائی'' کہلاتا تھا اور بھائی سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ جو رشتے ہیں ان میں کوئی بات نہیں کہ تم ان سے خواہ مخواہ اپنی زینت کی چیزیں چھپاتی پھرو۔ اور آگے چل کر کہا ہے کہ یہ اس وقت ہے جب تم گھر کے اندر چل پھر رہی ہو۔ باہر تو کچھ اور غیر لوگ بھی ہیں' تم اندر ہو تو وہ تمہیں دیکھ نہیں سکتے۔

نہ تنہا عشق از گفتار خیزد
پسِ ایں آتش از رفتار خیزد

عشق کی آگ صرف باتوں سے نہیں بھڑکتی' یہ چال ڈھال سے بھی بھڑک اٹھا کرتی ہے۔

تصورات کی پاکیزگی کے لیے آخری حدود

تصورات کی پاکیزگی کے لیے قرآن کہتا ہے کہ وَ لَا یَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِهِنَّ لِیُعۡلَمَ مَا یُخۡفِیۡنَ مِنۡ زِیۡنَتِهِنَّ ❷ (24:31)۔ اگر گھر کے اندر چلو' اور پاؤں میں ایسا زیور پہنا ہوا ہے جس سے جھنکار کی آواز آتی ہے تو پاؤں اس زور سے نہ مارو کہ اس کی آواز باہر غیر مردوں کے کان میں جا کر پڑ جائے۔ چلنے میں تو وہ جھنکار ہے ہی' اس کی ممانعت نہیں ہے مگر لَا یَضۡرِبۡنَ (24:31) ارداتاً زور سے پاؤں نہ مارو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کہاں تک جاتا ہے۔ آگے قرآن نے کہا کہ وَ تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰهِ جَمِیۡعًا اَیُّهَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ❸ (24:31)۔ یہاں کہا ہے کہ اے جماعت مومنین! ہم تم سب کے لیے یہ احکام دے رہے ہیں۔ ایام جاہلیہ کے اندر تم سب کچھ کرتے تھے۔ اب اس راستے کو چھوڑ دو اور اس راستے کی طرف آؤ۔ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (24:31) تاکہ ان چیزوں کی وجہ سے تم کامیابیوں کی انتہا پہ پہنچ جاؤ۔

عزیزان من! سورۃ النور کی آیت 31 تک ہم آ گئے 32 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّاۤ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

---

❶ اس سے یہاں ''خاوند'' مراد ہے۔

❷ اور چلتے وقت اپنے پاؤں اس زور سے زمین پر نہ ماریں کہ چھپے ہوئے زیورات کی جھنکار سے معلوم ہو جائے کہ انہوں نے کیا پہن رکھا ہے۔

❸ یہ ہیں معاشرے کے متعلق' اس سلسلہ میں' عام احکام' جن کی طرف سے تم سب مومنین (مردوں اور عورتوں) کو لوٹنا چاہیے تاکہ تمہیں زندگی کی کامرانیاں نصیب ہوں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' ص۔802)

چھٹا باب: سورۃ النور (آیات 32 تا 35)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳۵﴾

عزیزان من! آج نومبر 1977ء کی 4 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورۃ النور کی آیت 32 سے ہو رہا ہے: (24:32)۔

معاشرتی طور پر نکاح کی اہمیت

آپ کو یاد ہوگا کہ اس سورۃ میں شروع سے ہی جنسی معاملات' ازدواجی زندگی' عائلی زندگی' کے متعلق احکام اور ہدایات آ رہی ہیں۔ ابھی دو ایک اور آیات میں بھی وہی سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ چیز ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے عصمت کی حفاظت بڑی بنیادی اقدار میں سے ہے۔ یہ محض ایک طبعی یا Physical Action (طبعی فعل) نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق افراد سے آگے بڑھ کر اقوام کی زندگی اور موت سے بھی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے اور یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے اس پر اتنا زور دیا ہے۔ اب

اسی سلسلے میں جنسی اختلاط کے لیے' یہی ایک شکل ہے جسے ہم نکاح کہتے ہیں' جو قرآن کریم نے جائز رکھی ہے اور اس میں بھی جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وحدت زوج (Monogamy) قرآن کا اصول ہے۔ اب اس نکاح کے سلسلے میں وہ یہ کہتا ہے کہ یہ افراد کا اپنا ذاتی معاملہ ہی نہیں ہے' معاشرے کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اس باب میں افراد کی مدد کرے' مدد ہی نہیں بلکہ اس نے تو حکم کے طریقے پہ کہا ہے کہ **وَ اَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ** (24:32)۔ **الایامی** میں وہ مرد اور عورتیں آتی ہیں' جو خواہ شروع سے غیر شادی شدہ ہوں یا بیوہ عورتیں ہوں یا رنڈوے مرد ہوں' کسی شکل میں بھی جو غیر شادی شدہ ہے' اس کے لیے یہ لفظ آئے گا۔ [1] اس آیت میں معاشرے کو حکم دیا ہے کہ تم **الایامی** کے نکاح کا انتظام کیا کرو۔ اندازہ لگائیے کہ اس ایک حکم سے قرآن معاشرے کی کتنی مشکلات کو حل کر دیتا ہے۔ آج کے دور میں اس مشکل کے متعلق اس سے پوچھو جس کے گھر میں جوان بیٹیاں ہیں' اور آج کل ہونے والے شوہروں کی طرف سے جو تقاضے ہو رہے ہیں' اس سے معاشرے میں جتنی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں' ان کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس معاشرے میں ہم سب یتیم ہیں' جیسے قرآن نے کہا ہے کہ اس معاشرے کی بھری محفل میں ہم سب تنہا ہیں' کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ معاشرہ باطل کے نظام کا معاشرہ ہے جس میں **یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** (90:15) ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ہر شخص اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ ہماری یہ تنہائی یعنی یہ یتیمی' قرآن کے الفاظ میں' ان گنت گوشوں کے لحاظ سے بڑی روح فرسا ہوتی ہے

نکاح کے معاملے میں مختلف مطالبے اور حق مہر کی حقیقت

یہ جان لیوا' روح فرسا تنہائی والدین کی تنہا مصیبت ہوتی ہے۔ اگر کوئی دوسرے دلچسپی رکھتے بھی ہیں تو وہ صرف Exploit (ناجائز فائدہ حاصل) کرنے کے لیے رکھتے ہیں۔ پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ بیٹی دو گے تو ساتھ کیا دو گے حالانکہ قرآن نے یہ کہا تھا کہ اگر کسی سے نکاح کرنا ہے تو تم بتاؤ تم اس کے ساتھ کونسی چیز رکھو گے کہ وزن برابر ہوں۔ ورنہ عورت کا' بیوی ہونے والی لڑکی کا' پلڑا جھکے گا۔ تمہیں اپنے ساتھ کچھ اور تحفہ دینا ہوگا۔ یہ وہ تحفہ ہے جسے قرآن کریم کے الفاظ میں مہر کہا جاتا ہے۔ یہاں قصہ ہی الٹا ہے اور پھر یہ والدین کی تنہا مصیبت ہے۔ صاحب! بڑی بات یہ ہے کہ وہ ایک شخص پریشان پھر رہا ہے حالانکہ قرآن معاشرے کو حکم دیتا ہے کہ **وَ اَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ** [2] (24:32) تم معاشرے میں ان **الایامی** کے نکاح کا انتظام کرو۔ یہ تو ہو گئے عام افرادِ معاشرہ۔

---

[1] حوالہ: ابن فارس (المتوفی 395ھ) کی اہم کتاب ''مقاییس اللغۃ''۔

[2] تمہارے معاشرے کا یہ بھی فریضہ ہے کہ جن لوگوں' مردوں یا عورتوں' کی شادی نہ ہوئی ہو' (خواہ وہ کنوارے ہوں یا رنڈے مرد اور بیوہ عورتیں) ان کے نکاح کا مناسب انتظام کرے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔802)

نزولِ قرآن کے وقت غلام اور لونڈیوں کا مسئلہ

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ قرآن نے بتایا ہے کہ اس زمانے کے عرب معاشرے میں غلام اور لونڈیاں ❶ پہلے سے موجود تھیں، بہت زیادہ تعداد میں تھیں، اور معاشرے کا جزو بن چکی تھیں۔ یاد رہے کہ قرآن کریم نے جہاں جہاں بھی ان کا ذکر کیا ہے، ان کے لیے "**ماملکت ایمانکم**" کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ ان سے مراد وہ غلام اور لونڈیاں ہیں جو نزولِ قرآن سے پہلے عربوں کے ہاں آ چکی تھیں۔ اس کے بعد قرآن نے اس کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کی کوئی گنجائش، کوئی شکل باقی نہیں رکھی اور جو معاشرے کے اندر آ چکی تھیں انہیں آزاد کرنے کے لیے شروع سے آخر تک احکام دیئے کہ غلام اور لونڈیوں کو آزاد کرو، ورنہ اس زمانے میں غلام کا آزادی حاصل کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ عزیزان من! یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ آپ تو غلام کہتے ہیں، وہاں صورت حال یہ تھی کہ غلام کی اولاد بھی غلام ہوتی تھی، پیدائشی غلام ہوتی تھی، ہمیشہ غلام رہتی تھی، یہ سارا سلسلہ اس کا غلامی میں جاتا تھا۔ وہاں احکام یہ ملے۔ کہا کہ غلام آزاد کرو، دین کا بنیادی اصول **فَكُّ رَقَبَةٍ** ❷ (90:13) رہ گیا۔ دنیا میں جہاں جہاں تمہیں غلام نظر آئے، ان کی آزادی کا انتظام کرو۔

یہ امت مسلمہ کا فریضہ ہے لیکن افسوس بالائے افسوس یہ ہے کہ اس کے متعلق آج بھی یہ بتایا جا رہا ہے، آپ کے ہاں Modern (جدید) ترین مفسر بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنایا جائے گا اور مردوں کو غلام۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا ماحصل: موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے

قرآن شروع سے آخر تک یہ کہہ رہا ہے کہ غلاموں کو چھوڑو، اور چھڑاؤ۔ قرآن نے صدقات کی یہ ایک شق رکھی ہوئی ہے کہ یہ جو فی الرقاب ہیں ان کو چھڑانے کے لیے بیت المال کا روپیہ ہے۔ قرآن کا ایک ہی نعرہ ہے: ''چھڑاؤ چھڑاؤ''۔ سارے قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ غلام بناؤ۔ ان کے ہاں، یہ اسی دور کی بات نہیں، آج بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو لونڈیاں اور مردوں کو غلام بنایا جائے گا۔ اس کے برعکس ساری دنیا کے ملحدوں، کافروں اور مشرکوں نے مل کر، اپنے ہاں بین الاقوامی قوانین پاس کر دیئے کہ غلامی ختم کر دی گئی ہے مگر ان مفسرین کے ہاں آج بھی یہ کہا جا رہا ہے کہ غلام اور لونڈیاں بنائی جائیں گی۔ بہر حال اس زمانے کے معاشرے میں غلام اور لونڈیاں تھیں۔ یہ کوئی قابلِ نظیر مثال نہیں ہے کہ یہ وہی ہیں جو ہمارے گھروں کے اندر ہمارے ملازم ہوتے ہیں یا ملازمہ لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان کا آپ کے دین میں سوال ہی نہیں آ سکتا کہ غلام اور لونڈیاں ہوتی ہیں، لیکن بہر حال گھروں کے اندر بطور ملازم اور نوکر، اس

---

❶ قرآنِ کریم میں جہاں بھی غلام اور لونڈیوں کا ذکر آیا ہے، ان سے مراد وہ غلام اور لونڈیاں ہیں جو اس زمانے میں عربی معاشرہ میں عام طور پر موجود تھے۔ قرآن نے انہیں آہستہ آہستہ آزاد معاشرے کا جزو بنا دیا اور آئندہ کے لیے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن۔ ص۔ 802 کا فٹ نوٹ 2)

❷ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم، مطیع اور زیر دست نہ رہے، ہر ایک گردن اٹھا کر چلے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص ص۔ 1451-1452)

زمانے میں یہ غلام اور لونڈیاں تھے۔ آیت (24:32) کے پہلے ٹکڑے میں کہا ہے کہ تم میں سے جو ایسے ہوں کہ جن کی شادی نہیں ہوئی ان کی شادی کا انتظام کرو۔ یہاں ''منکم'' کہا گیا ہے۔ یہ تو ہو گیا ''تم میں سے''۔ اب آگے ہے کہ **وَ الصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَ اِمَآئِکُمْ** (24:32) اور تمہارے گھروں میں جو یہ غلام اور لونڈیاں ہیں' ان میں سے بھی جو شادی کے قابل ہوں ان کی شادی کا بھی انتظام کرو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کس طرح ان غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کیے جاتا ہے جو اس زمانے میں موجود تھیں۔ معاشرے کے اندر وہ انہیں جزوِ خاندان بنائے جاتا ہے' معاشرے کو حکم دیتا ہے کہ ان کی شادی کا انتظام کرو۔ جہاں اس نے یہ کہا کہ تم میں سے یہ جو مثلاً تمہاری آزاد عورتیں اور مرد ہیں ان کے نکاح کا مناسب انتظام کرو' وہ اسی سانس میں اسی آیت کے اگلے ہی ٹکڑے میں کسی' دوسری آیت بھی نہیں ہے' کہتا ہے کہ اس معاشرے میں **اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ** ❶ (24:32)۔

مستغنی کا قرآنی مفہوم

اب اس آیت (24:32) میں یہ بات آتی ہے کہ شادی ہونے کے بعد اخراجات بڑھ جائیں گے۔ قرآن میں جہاں یہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں مستغنی بنا دے گا تو اس میں یہ ہے کہ یہ جتنی ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں' یہ اس مملکت کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں' جو خدا کے نام پہ قائم ہوتی ہے۔ اسے نظام خداوندی کہتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں وہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ جی! کوئی بات نہیں ہے' لڑکا کماؤ نہیں ہے' ابھی تو اس کے روزگار کا سلسلہ نہیں ہے تو کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں' شادی کر دیجیے' بیوی اپنی قسمت ساتھ لایا کرتی ہے۔ اس قسمت کا تو ہمیں پتہ نہیں ہے مگر اس کی بدقسمتی کے طعنے تو ہر روز ساس دیتی ہے۔ مثلاً: جدوں دی گھر اچ آ گئی ہیگی اے' ساڈے برکت ای اڈ گئی اے۔ ایس گھر وچوں او برکت تے اڑنی ہیگی سی' اتے کماوندا کوئی ہے نہیں' بے روزگاری تہاڈے آ' تے اک جی تسی ہو رلے آندا۔ اے کالے متھے والی جس دن دی آئی ہیگی ❷ اے جبکہ اس سے پہلے' شروع میں یہ کہا جاتا ہے کہ نہیں' شادی کر دیجیے' وہ آنے والی اپنی قسمت ساتھ لے کر آئے گی۔ صاحب! کوئی بات نہیں اور اب یہ طعنہ ہے کہ اس سیاہ بخت نے گھر کی برکت ہی اڑا دی۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ** (24:32) اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو مستغنی کرے گا لیکن جی! یہاں اصل میں اس سے مطلب قناعت کرنے کا ہے۔ روٹی تمہیں ملے یا نہ ملے' سمجھ لو کہ اللہ نے تمہیں مستغنی کر رکھا ہے' قناعت کیجیے گا۔ یعنی بات کہاں سے کہاں

---

❶ جسے متاہل زندگی بسر کرنے کے لیے معاشی امداد کی ضرورت ہو اس کا بھی مناسب انتظام کیا جائے۔ یہ سب اس خدا کے مقرر کردہ نظام کی طرف سے ہونا چاہیے جو بڑی وسعتوں کا مالک اور ہر ایک کے حالات سے باخبر ہے۔ (قوانین خداوندی کے مطابق قائم شدہ نظام مملکت کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ص۔803)

❷ یہ لڑکی جب سے گھر آ بسی ہے' ہمارے ہاں سے برکت ہی اڑ گئی ہے۔ اس گھر سے برکت تو اڑنی ہی تھی کیونکہ کمانے والا کوئی بھی نہیں تھا' تمہارے ہاں بیروزگاری تھی اور تم ایک فرد خاندان اور لے آئے (اور اب کہتے ہو کہ) یہ سیاہ بخت جب سے آئی ہے (برکت اڑ گئی ہے۔)

چلی جاتی ہے یا یوں کہیے کہ ایک بات کو بنیادی طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے جب مشکلیں پیدا ہوتی ہیں تو پھر اس سے یہ تاویلیں پیدا ہوتی ہیں' جبکہ روٹی کا علاج تو روٹی ہے۔ کون ہے جو یہ کرے گا؟ وہی جن کو حکم دیا تھا کہ وَ اَنۡکِحُوا (24:32) ان کی شادیوں کا انتظام کرو۔ انہی سے یہ کہا گیا ہے کہ جہاں یہ دیکھو کہ وہاں اس سے معاشی تنگی آئے گی' اس کا ساتھ انتظام کرو وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ (24:32) یہ سب اس خدا کے مقرر کردہ نظام کی طرف سے ہونا چاہیے جو بڑی وسعتوں کا مالک اور ہر ایک کے حالات سے باخبر ہے۔

جنسی جذبے کی تسکین کے لیے ایک ہی شکل ہے

عزیزان من! سنیئے' یہ سب کچھ انفرادی طور پہ بھی کہا ہے کہ جنسی جذبے کی تسکین کی ایک ہی شکل ہے اور وہ ہے نکاح۔ انفرادی طور پہ اس کا انتظام کرو اور پھر معاشرے سے بھی کہا کہ تم انتظام کرو' اگر اس میں معاشی مسئلہ حائل ہو رہا ہے تو وہ معاشرہ یعنی نظام مملکت اس کا بھی حل تلاش کرے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس مسئلے کو کتنی اہمیت دی جا رہی ہے اور اس کے باوجود آگے بات آئی ہے کہ جس کا ابھی نکاح کا انتظام نہ ہو سکے تو پھر کیا وہ کوئی اور شکل اختیار کر لے؟ یہ بات بڑی اہم ہے۔ یہ چیز میں ابھی عرض کرونگا کہ کیوں اہم ہے۔ کہا کہ وَ لۡیَسۡتَعۡفِفِ الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ نِکَاحًا (24:33) اس کے باوجود جس کے نکاح کا انتظام نہ ہو سکے' وہ ضبط نفس سے کام لے۔ کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ قرآن کریم نے کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق کہا ہے کہ یہ یہ چیزیں حرام ہیں۔ یہ وہی ہیں کہ بہتا ہوا لہو' مردار' خنزیر' اور ہر وہ شے جو خدا کے سوا کسی دوسرے کے نام پر دی جائے۔ تو یہ حرام چیزیں جہاں بھی قرآن نے کہا ہے' ان کے بعد یہ کہا ہے کہ اگر شکل ایسی پیدا ہو جائے کہ کوئی اور چیز کھانے کو نہیں مل رہی' اور جان پہ بن آئی ہے' جسے اضطراری حالت کہتے ہیں یعنی ایسی اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو اس وقت اس کی اجازت ہے کہ تم صرف جان بچانے کے لیے ان حرام اشیاء میں سے جو کوئی میسر آتی ہو' اسے تم کھا سکتے ہو۔ قرآن کریم نے صرف اس ایک ضرورت کے لیے اضطراری حالت کی اجازت دی ہوئی ہے۔ یہ صرف اس ایک ضرورت کے لیے ہے اس کے علاوہ سارے قرآن میں کسی اور چیز کے لیے نہیں ہے۔

جنسی معاملات کا تعلق مکمل طور پر جذبات کی اشتعال انگیزی سے ہے' اضطراری حالت سے نہیں

عزیزان من! میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں ہے۔ میں نہ فرقہ وارانہ بحث چھیڑ سکتا ہوں۔ میں کسی شیعہ کا قول نہیں کہہ رہا' بلکہ خود مودودی صاحب [1] فرما رہے ہیں کہ متعہ کی اجازت ایسی ہی اضطراری حالت کے اندر ہوتی ہے یعنی وقتی طور پر جنسی جذبے کی تسکین کے لیے جو ایک شکل پیدا کر لی جاتی ہے۔ اضطراری حالت کھانے پینے میں تو اس لیے ہوتی ہے کہ اس پہ آدمی کا کنٹرول نہیں ہے' پیاس لگتی ہے

---

[1] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ (1903-1979)

یا بھوک لگتی ہے تو وہ از خود لگتی ہے اور وہ لگتی چلی جاتی ہے۔ اس بھوک کو مٹانے کا کوئی دوسرا طریقہ ہی نہیں ہے' نہ مٹایا جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ باقی جتنی چیزیں ہیں ان کا تعلق تو جذبات سے ہے۔ جنسی جذبے کی تسکین طبعی ضرورت نہیں ہے۔ کھانے پینے کی بات اور ہے کہ وہ از خود مجبور کرتی ہے جبکہ جنسی جذبے کو تو خود بیدار کیا جاتا ہے۔ ساری عمر اس طرف خیال نہ کیجیے تو یہ کبھی بھی خود بیدار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کے لیے اضطراری حالت نہیں کہا۔ اضطرار تو وہاں ہے جہاں انسان مجبور ہوتا ہے' بے اختیار ہوتا ہے اور اگر جذبات کی اشتعال انگیزی کو آپ اضطراری حالت کہتے ہیں تو پھر تو ہر جذبے میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن میں اضطراری حالت کے لیے بھی اجازت ہے' وہاں حکم نہیں ہے' صرف وہ کھانے پینے کے معاملے میں اجازت دی ہے' کسی اور معاملے میں نہیں' نہ ہی وہ آپ کا عام اصول بن سکتا ہے کہ قرآن نے ایک معاملے کے اندر اجازت تو دی ہے اور اب آپ اصول بنالیں کہ جہاں اضطراری حالت ہو' وہاں حرام جائز ہے' وہاں حلال کے لیے تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اضطراری حالت ضرورت کے لیے ہے۔ آپ کو یاد ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ ''اونوں کیندے'': ''تو جھوٹ بولیا۔ اے کہن لگا: مینوں کی لوڑ پئی سی میں جھوٹ بولدا یعنی لوڑ پوے' تے جھوٹ بولے [1]''۔ بغیر ضرورت کوئی جھوٹ بولتا ہی نہیں ہے۔ اپنے سچے ہونے کے لیے وہ دلیل یہ دیتا ہے کہ مجھے ضرورت کیا تھی؟ سوال تو وہی ہے کہ ضرورت ہو تو پھر جائز اور ناجائز کا امتیاز کیا جائے۔ آج یہ ہے زندگی اسلام کی۔ جب یہاں ضرورت پڑے' آپ کو اضطراری حالت ہے اور ہر چیز جائز ہے تو پھر تو ہر جگہ جتنے دنیا کے اندر بڑے بڑے جھوٹے چور بدمعاش ہوتے ہیں' ان سے جو پوچھو' وہ بھی اضطراری حالت ہی ہوتی ہے کہ ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ قرآن میں کہیں اس کی اجازت نہیں ہے اور جنسی جذبے کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ **وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ** [2] (24:33)۔ ضبطِ خویش سے کام لو تا آنکہ تمہارے رشتے کا انتظام ہو سکے' تمہاری معاشی حالت کا معاشرے کی طرف سے یہ انتظام نہ ہو جائے کہ گزارا ہو سکے' جب تک نکاح کی یہ صورت پیدا نہیں ہوتی' ضبط خویش سے اپنی عفت کو محفوظ رکھو۔ عفت کا تو لفظ ہی یہاں **استعفف** سے ہے اسے کہتے ہیں کہ اپنی عفت کو برقرار رکھو۔

غلاموں اور لونڈیوں کی' بات پچھلی آیت سے ہوئی تھی' کہا تھا کہ انہیں رہا کیے چلے جاؤ' چھوڑتے چلے جاؤ۔ ہمارے ہاں ایک چیز ہے کہ اگر کوئی غلام آزادی کا پروانہ مانگے تو کہا یہ جاتا ہے کہ اس سے یہ کہو کہ اتنا روپیہ دو تو پھر تمہیں آزادی کا پروانہ دیتے ہیں۔ جاؤ محنت کرو' مزدوری کرو' کما کے مجھے دیئے جاؤ۔ جب تمہارا اتنا روپیہ ہو جائے گا' اس دن تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ عام طور پہ اسے ''مکاتبت''

---

[1] اسے کہا: تم نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ کہنے لگا: مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ میں جھوٹ بولتا۔ یعنی ضرورت پڑے تو جھوٹ بولے۔

[2] جن لوگوں کے لیے رشتے کا انتظام نہ ہو سکے' انہیں ضبط خویش سے' اپنی عفت کو محفوظ رکھنا چاہیے تا آنکہ نظام خداوندی ان کے لیے ضروری سہولتیں بہم پہنچا دے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 803)

کہا جاتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ قرآن ''مکاتبت'' کو کہاں لاتا ہے اور اس کے لیے کیا کہتا ہے؟ مکاتبت کے معنی ہیں: پروانہ راہداری لکھ کر دیدینا کہ تم آزاد ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ وَ الَّذِیۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ الۡکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ فَکَاتِبُوۡهُمۡ (24:33) ان غلاموں میں سے جو بھی تم سے کہے کہ مجھے رہا کر دو' آزاد کر دو' پروانہ آزادی دیدو' اسے یہ پروانہ دیدو۔ بس اتنا دیکھ لو کہ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِیۡهِمۡ خَیۡرًا (24:33) تمہارے ہاں سے جا کر یہ اپنا پیٹ بھی پال سکے گا' اپنے آپ کو سنبھال بھی سکے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اس پروانہ آزادی دینے کے لیے وہ شرط کیا ہے؟ یہ کہ یہاں وہ تم میں ایک فرد خاندان کی حیثیت سے رہ رہا ہے۔ اگر الگ رہے گا تو دیکھو کہ وہ ایسا نااہل اور بے سمجھ تو نہیں ہے کہ تم سے الگ ہو کر اپنی بہبود کا خود خیال بھی نہ رکھ سکے' اپنے آپ کو سنبھال بھی نہ سکے' ناقص العقل تو نہیں ہے' ایسا تو نہیں ہے کہ کچھ کام کاج ہی نہیں جانتا' کچھ کما بھی نہیں سکتا' اپنا انتظام نہیں کر سکتا' بیمار ہے۔ اس میں سب چیزیں آ گئیں۔ اگر یہ دیکھو کہ وہ یہ سارا کچھ کر سکنے کے قابل ہے تو جو غلام کہے کہ مجھے پروانہ راہداری' پروانہ آزادی دیجیے' قرآن کا حکم کہ فَکَاتِبُوۡهُمۡ (24:33) اسے پروانہ آزادی دے دو۔ یہ کہتے ہیں کہ قرآن غلام لونڈیاں بنانا سکھاتا ہے۔ یہ ملاحظہ فرماؤ کہ جو موجود تھے ان کے متعلق بھی یہ احکام ہیں لکھ کے دے رہا ہے اور اگر اگلا ٹکڑا ساتھ دیکھتے ہو کہ ہاں' وہ ٹھیک ہے' کما سکنے کے قابل ہے' کچھ ہنر جانتا ہے' کاروبار کچھ کر سکتا ہے' لیکن وہ تو غلام آزاد ہوا ہے' اس کے پاس کیا ہے جس سے وہ کچھ کرے گا اس کے لیے کہا کہ وَ اٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیۡۤ اٰتٰىکُمۡ [1] (24:33) اور اسے کچھ ساتھ پیسے بھی دو کہ لو بھئی! اس سے اپنا کاروبار شروع کرو۔ یہ ہے غلامی کے متعلق قرآن کا حکم۔

غلام اور لونڈیوں کے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا فتویٰ

عزیزان من! آج آپ کے ہاں جو Latest (جدید ترین) مفسر قرآن ہیں' افسوس ہے کہ مجھے بار بار نام لینا پڑتا ہے' کہ وہ مودودی [2] صاحب ہیں۔ ہمارے ہاں کے بڑے Modern (جدید) مفسر ہیں۔ ان کی تفسیر کی پہلی جلد میں پورا صفحہ [3] بھرا ہوا ہے کہ جنگ میں گرفتار شدہ مردوں عورتوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا جائے گا۔ ان کی ایک ایک کے پاس تعداد کوئی نہیں۔ کہتا ہے کہ وہ سپاہیوں میں بانٹ دی جائیں گی' تعداد بھی نہیں' ان کے ساتھ نکاح کی بھی ضرورت نہیں' اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ استعمال میں لانے کے بعد جب ان سے جی بھر جائے تو خواہ انہیں اپنے دوست کو تحفتاً دیدیں یا فروخت کر دیں۔ عزیزانِ من! انسان کو فروخت کیا جاتا ہے' اسے انسان تصور ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اسے جنس (Cmmodity) یا کوئی جانور جانا جاتا ہے جسے مارکیٹ میں لے جایا جا رہا ہو۔ پھر بھی یہ کہتے ہیں کہ

---

[1] اس مقصد کے لیے' اس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے' انہیں کچھ ساتھ بھی دے دیا کرو۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔803)

[2] مولانا سید ابوالاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ (1903-1979)

[3] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: تفہیم القرآن جلد اول' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' 1993' ص ص 41-340۔

اس قوم کی یہ حالت کیوں ہوگئی؟ قرآن یہ کہتا ہے کہ ان میں سے جو بھی کہے کہ میں آزاد ہونا چاہتا ہوں' اسے آزاد کرو اور اس سے پوچھو کہ دیکھ بھئی! اکیلے گزارا کرلو گے۔ اگر اس میں یہ صلاحیت ہے لیکن اس کے پاس کچھ سرمایہ نہیں ہے' جس سے وہ اپنا کاروبار شروع کر سکے تو اسے آزاد کرنے کے ساتھ تم اس کو پیسے بھی دے دو۔

لونڈیوں کے متعلق قرآن حکیم کی تعلیم

قرآن کہتا ہے کہ وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا [1] (24:33)۔ یہ جو تمہارے ہاں لونڈیاں ہیں وہ اگر کہیں نکاح کرنا چاہیں تو ان کو روکے نہ رکھو۔ آپ ذرا اس نقطہ پہ سوچیے! کہا کہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ''وہ بدکاری پر مجبور ہو جائیں۔'' چنانچہ اس صورتِ حال میں بدکاری تک کا یہ کچھ تمہارے ذمے ہوگا' کیونکہ تمہارے ذہن میں یہ ہے کہ یہ محض اس لیے تمہارے گھر میں رہیں کہ یہ کام کاج کرتی ہیں۔ اور پھر اس زمانے میں لونڈیوں سے تو جنسی تعلق تک بھی ان کے ہاں ہوتا تھا۔ کہا کہ دنیاوی مفاد کی خاطر ایسا نہ کرو کہ وہ اگر نکاح کرنے کے لیے کچھ ارادہ رکھتی ہیں تو تم ان کے اس راستے میں روک بن جاؤ کہ نہیں' ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے دہرا نقصان ہو جائے گا۔ شاید انہیں اس سے کچھ تھوڑا سا مالی فائدہ ہو جائے لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ بدکاری پر مجبور ہو جائے تو اس صورت میں یہ تمہارے خلاف جرم ہوگا۔ اس لیے قرآن کریم نے کہا کہ وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [2] (24:33)۔ معاشرے سے کہا کہ اگر کہیں تم ایسا Individual (انفرادی) کیس دیکھو کہ کوئی ایسا کرتا ہے تو تم اس میں Interfere (مداخلت) کرو اور اس کو ایسا مت کرنے دو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق یہ ذکر یوں آ رہا ہے۔

قرآنی احکامات کے ساتھ تاریخ کا نزول بھی

عزیزانِ من! آگے سورۃ النور کی ایک وہ آیت آتی ہے جس کی وجہ سے اس سورۃ کا نام ہے۔ بہت غور سے سنیے گا' بڑی اہم آیت آ رہی ہے۔ یہ اہمیت محض ہمارے حساب سے ہے ورنہ قرآن کی کونسی آیت اہم نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اس آیت کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس آیت کا قرآن کے خلاف مفہوم لے کر معاشرے میں بہت کچھ کیا جاتا ہے۔

---

[1] اور تمہاری نوجوان لڑکیاں (نوکرانیاں یا لونڈیاں)' جو نکاح کا ارادہ رکھتی ہوں' انہیں اپنے دنیاوی مفاد کی خاطر' اس سے نہ روکو۔ اس طرح وہ بدکاری پر مجبور ہو جائیں گی۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔803)

[2] اور اگر کوئی انہیں اس طرح مجبور کرے تو قانون خداوندی میں یہ شق بھی موجود ہے کہ وہ اس جبر کے خلاف' ان کی حفاظت کرے اور انہیں سامان نشوونما مہیا کرے۔ (نظامِ خداوندی کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا کرے۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔803)

متذکرہ بالا احکام دینے کے بعد کہا کہ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ (24:34) ہم نے تمہیں بڑے واضح احکام دیئے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی کہا کہ وَ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ (24:34) اس کے ساتھ تمہیں اقوام سابقہ کی تاریخ بھی دی ہے۔ ہم نے یہ کس کام کے لیے دی ہے؟ یہ بتانے کے لیے دی ہے کہ جس قوم نے ان احکام کے مطابق زندگی بسر کی، وہ کتنے عروج کے بام پہ جا پہنچی، جس قوم نے اس کی خلاف ورزی کی وہ کس طرح تباہ ہوئی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی رو سے تاریخ کی کتنی اہمیت ہے۔ یہاں اَنْزَلْنَآ (24:34) کے ساتھ دونوں چیزیں ہیں: ہم نے یہ احکام وقوانین وحی کی رو سے نازل کیے اور اس کے ساتھ یہ تاریخ بھی نازل کی ہے۔ وحی کی رو سے اقوام سابقہ کی تاریخ دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کاہے کے لیے دی ہے۔ جواب میں خود ہی کہا کہ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ (24:34) تاکہ جو بھی زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچنا چاہے، وہ اس سے عبرت حاصل کرلے، سبق حاصل کرے۔ قرآن تو جب کتاب یعنی قانون دیتا ہے اس کے ساتھ اس کی حکمت بھی بتاتا ہے یعنی The Why of it بتاتا ہے، اس کا نتیجہ بتاتا ہے۔ محض نظری نہیں ہوتا، Theoretical یا Academic نہیں ہوتا۔ تاریخی شواہد سے اس کے لیے صداقت کی دلیل بہم پہنچاتا ہے کہ دیکھو! اقوام سابقہ میں سے جس نے یہ کچھ کیا اس کا نتیجہ خوشگواریاں ہیں، جس نے اس کی خلاف ورزی کی وہ یوں تباہ ہوئی۔ یہ ہے تاریخ۔ اس وقت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ قرآن کی رو سے تاریخ کی بڑی اہمیت ہے لیکن وہ اہمیت اسی نقطہ نگاہ سے ہے جسے انسان فراموش کررہا ہے۔

''اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے'' کا قرآنی مفہوم اور وحدت الوجود کی حقیقت

عزیزان من! اب آگے جو آیت آتی ہے وہ یہ ہے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (24:35)۔ پوری آیت تو میں بعد میں تلاوت کرونگا لیکن یہ بتادوں کہ یہ بڑی ہی خوبصورت، بڑی ہی حسین، رعنا اور جاذب نگاہ ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتادوں کہ قرآن کے ساتھ یہ کیا کیا جاتا ہے۔ یہ آیت ہے کہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (24:35)۔ اس آیت کا عام ترجمہ ہے: کہا کہ اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے، کائنات کا نور ہے۔ آپ ذہن میں کہیں گے کہ اس میں کونسی ایسی بات ہے جس کی بنا پہ آپ کہتے ہیں کہ یہ کردیا اور وہ کردیا، اتنے باطل کی عمارتیں اس کے اوپر قائم ہوئیں۔ آپ سوچیں گے کہ وہ کونسی بنیاد ہے؟ لیکن جب عمارت تعمیر کرنا ہو تو بنیاد تو خود بھرنی پڑتی ہے۔ کہا کہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (24:35)۔ اس سے آپ کے ہاں ایک عقیدہ وضع ہوا، جس پہ سارے تصوف [1] کی عمارت قائم ہوئی۔

---

[1] اگرچہ تصوف (Mysticism) قریب قریب دنیا کی ہر قوم میں موجود ہے اور آج سے نہیں، تاریخ کے اولین اوراق سے اس کا تذکرہ شروع ہوجاتا ہے، لیکن اس کے باوجود مذہب (Religion) کی طرح اس کی بھی کوئی جامع اور مانع تعریف Precise Definition) آج تک نہیں ہوسکی۔ اس کا دائرہ بہت سے داخلی تجارت و کیفیات، احوال و مقامات اور شعائر و مناسبک کو محیط ہے لیکن اس میں دو بنیادی عناصر ایسے ہیں جو تصوف کی اصل سمجھے جاتے ہیں، یعنی (ا) انسان کا خدا سے براہ راست مکالمہ اور (ب) نفس انسانی کا حقیقت مطلقہ (یعنی خدا) کے ساتھ مل جانا، جسے وصال یا فنا کہتے ہیں۔ یہ کیفیات ہر فرد کی ذاتی (یعنی انفرادی) ہوتی ہیں جن میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا۔ نہ وہ فرد ان کیفیات کو کسی دوسرے کو محسوس کرا سکتا ہے، نہ ہی بتا اور سمجھا سکتا ہے..... [باقی اگلے صفحے پر]

دنیائے تصوف کے ایک بلند پایہ ستون امام محی الدین ابن عربی شیخ اکبر کی پیش کردہ تعلیم

تصوف کے اس عقیدہ کے وضع کرنے والے آپ کے ہاں کے صوفیائے تصوف کے فلسفی' امام محی الدین ابن عربی شیخ اکبر ❶ (560-638H/1165-1240AD) ہیں۔ تمام صوفیائے کرام کے سر اس نام کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ تصوف کی دنیا میں یہ بہت ہی عظیم بزرگ مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے تصوف کا فلسفہ بھی ساتھ دیا ہے۔ فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم وغیرہ ان کی کتابیں ہیں۔

[گزشتہ سے پیوستہ]----------

اس اعتبار سے تصوف' بحیثیت ایک مذہب' یکسر شخصی یا ذاتی (Personal Religion) ہوتا ہے اور یہ تجارب (Experiences) کائنات کے حسی یا مشاہداتی علم یا عقل وبصیرت کے بغیر ایک ایسے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں جو بالکل نگاہوں سے مستور اور حواس (Senses) سے پوشیدہ رہتا ہے۔ اسے باطنی ذریعہ علم کہتے ہیں۔ اس علم کے حصول کی توجیہہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ نفسِ انسان جب باطن کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے تو یہ وہاں اس حقیقتِ کلی میں جذب ہو جاتا ہے' جو کائنات کے رگ وپے میں جاری وساری ہے اور اس طرح نفسِ انسان اور حقیقتِ مطلقہ (Reality) ایک ہو جاتے ہیں اور انسان بغیر کسی ذریعہ یا واسطہ کے تمام حقائق کا براہ راست مشاہدہ کر لیتا ہے..... چونکہ حقیقتِ مطلقہ تمام مادی اور محسوس نسبتوں سے بلند اور منزہ ہے اس لیے نفس انسانی اس کے ساتھ اسی صورت میں پیوست (بلکہ اس کے اندر ضم) ہو سکتا ہے جب یہ خود تمام محسوس اور مادی علائق سے بلند اور منزہ ہو جائے۔ اس کے لیے نہ صرف دنیاوی حظائظ ولذات سے ترکِ تعلق ضروری ہے بلکہ اپنے قلب ونگاہ کو اس مقام پر لے جانا ہوتا ہے جہاں اس مخصوص دنیا کے نقوش' تصورات اور خیالات کا کوئی گزر نہ ہو۔ یعنی مادی دنیا کی آلائش تو ایک طرف محسوس اشیاء کے تصورات اور خیالات تک بھی دماغ میں نہ آنے پائیں۔ تصوف کی اصطلاح میں اس کیفیت کو ''مکمل تاریکی'' (Complete Darkness) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ضمناً Mysticism (تصوف) اصل کے اعتبار سے یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی آنکھیں بند کر لینا ہیں (پرویز: تصوف کی حقیقت' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992ء ص۔24۔)

❶ یہ تھے ہسپانیہ کے مشہور صوفی محی الدین ابن عربی (560-638ھ)' جنہیں شیخ اکبر کہا جاتا ہے اور جن کی فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم تصوف کا عروۃ الوثقیٰ سمجھی جاتی ہے۔ وہی فصوص الحکم جس کے متعلق علامہ اقبالؒ (1877-1938ء) نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ ''جہاں تک مجھے علم ہے فصوص الحکم میں سوائے الحاد وزندقہ کے کچھ نہیں۔ (اقبال نامہ ج ا' صفحہ 44)۔ یہ چھٹی صدی ہجری (560ھ) میں اندلس میں پیدا ہوئے اور 638ھ میں دمشق میں وفات پائی جہاں ان کے مزار پر ایک بہت بڑا گنبد ہے۔ (پرویز: سلیم کے نام (جلد سوم)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' 1986' ص-37)۔ اس زمانے میں ہسپانیہ میں متصوفین فلاسفر کا ایک گروہ تھا جو وحدتِ وجود کا قائل تھا۔ وہ اپنی کیفیات اور احوال کو تشبیہ اور استعارہ کے رنگ میں بیان کرتے اور اپنے عشق حقیقی کو عشق مجازی کے جاذبِ نگاہ لباس میں پیش کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربی انہی سے متاثر ہوئے' انہی کا فلسفہ' انہی کا انداز بیان' حتیٰ کہ انہی کا سا عشق مجازی بھی۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں کہ جب قرطبہ میں تھے تو ایک دوشیزہ' فاطمہ' کا قرب ان پر مدت العمر مؤثر رہا۔ پھر جب وہ مکہ میں مقیم تھے تو ایک اصفہانی عالم' مسکین الدین' سے جو مکہ میں حدیث کا درس دیتے تھے' حدیث پڑھی۔ مسکین الدین کی بیٹی عین الشمس' بڑی خوبصورت دوشیزہ تھی۔ ابن عربی اس پر فریفتہ ہو گئے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ان کے اکثر مکاشفات کا روحانی جذبہ اسی کے عشق کا رہین منت ہے۔ ان کے ملفوظات اور یہودی تصوف کی بنیادی کتاب ''زھار'' میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے۔ دونوں الہامی کتابوں کی تاویل اپنے ذاتی مکاشفات کی بنا پر کرتے ہیں۔ حروف اور اعداد سے پراسرار معنی اخذ کرتے ہیں' خوابوں کی تعبیر پر حقائق کی عمارتیں تعمیر کرتے ہیں اور انسانی مقدر کو ستاروں کے تابع مانتے ہیں۔ عقیدۃ جبر کے قائل ہیں۔ یہ عقائد ونظریات عیسائیوں سے آئے ہوں یا یہودیوں سے مسلمانوں میں منظم مذہب اور مسلک کی حیثیت سے انہیں ابن عربی ہی نے پیش کیا ہے۔ (حوالہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ: تصوف کی حقیقت' طلوع اسلام ٹرسٹ' (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992ء' ص ص 80-79)

ادھر میں بعد میں جاؤنگا کہ انہوں نے کیا فلسفہ دیا ہے۔ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ جو کچھ کائنات نظر آتی ہے' یہ کوئی شے ہے ہی نہیں' یہ سب خدا ہی خدا ہے۔چلو جی' معاملہ ختم ہوا کیونکہ اس نے جو کہا ہے کہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (24:35)۔اللہ ہی ہے' کوئی ہے ہی نہیں۔آپ سوچتے ہونگے کہ میں یہ کیا باتیں کر رہا ہوں۔

میں یہ عام باتیں نہیں کر رہا۔آپ کے ہاں جسے دین کا مغز کہا جا رہا ہے وہ اصل دین یہ وحدت الوجود ہے۔اس میں تصور یہ ہے کہ یہ سب ''وہی'' ہے یعنی خدا ہی خدا ہے۔یہ جو مختلف شکلیں نظر آتی ہیں' یہ ہمارے دماغ کی Create (پیدا) کی ہوئی ہیں۔اصل میں سب خدا ہی ہے۔سنیے! پھر وہ کہاں تک گئے ہیں۔اگر میں اس وحدت الوجود پہ جاؤں تو پتہ نہیں کہ چھ مہینے لگ جائیں۔یہ کہتے ہیں کہ اللہ بھی حق ہے' بندہ بھی حق ہے' انسان بھی حق ہے۔اب میں تو سمجھ نہیں سکتا کہ حکم دینے والا کون ہے' حکم دیا کس کو گیا ہے۔کہتا ہے کہ جب اللہ کے سوا کسی اور کا وجود ہی نہیں ہے تو یہ تمیز ہی غلط ہے۔یہ شریعت' یہ احکام' یہ سارا کچھ یونہی سب ختم ہے۔وہی حکم دینے والا ہے' اسی کو حکم دیا جاتا ہے۔اسی لیے کہتا ہے کہ اگر منصور [1] انا الحق کہتا تھا تو وہ بھی سچا تھا اور اس سے آگے بڑھتے ہیں کہ اگر فرعون انا ربکم الا

---

[1] ''ہندوؤں کے ہاں اوتار کا عقیدہ عام ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ خود ایشور (خدا) مادی مخلوق کے پیکروں میں نمودار ہوتا رہتا ہے چنانچہ ان کے ہاں (پرہلاد بھگت کے واقعہ سے متعلق) چیونٹی سے لے کر رام اور کرشن تک اوتار مانے جاتے ہیں۔یہی عقیدہ مسلمانوں کے ہاں اہل تشیع کے غالی فرقوں میں در آیا۔چنانچہ سب سے پہلے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات میں اور ان کی اولاد میں حلول کر آیا تھا۔اس کے بعد نصیریہ' کیسانیہ' قرامطہ اور باطنیہ فرقوں میں یہ عقیدہ اور بھی متشدد ہوتا چلا گیا۔وہیں سے یہ عقیدہ صوفیا کے عقائد میں داخل ہو گیا۔ان میں حسین بن منصور حلاج اس کا پہلا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔اس کا دعویٰ تھا کہ خدا کی ذات اس میں حلول کر گئی ہے۔اسی وجہ سے وہ انا الحق کا نعرہ بلند کرتا تھا۔ایک عامی سے شعر کے الفاظ میں

خود راز انا الحق کو وہی کھول رہا ہے منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے

''حلاج کے بنیادی عقیدہ کا ملخص یہ ہے کہ تخلیقِ کائنات سے پہلے خدا خود اپنی ذات میں گم تھا۔اس نے اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہا تو آدمی کو پیدا کیا۔اس طرح خدا (لاہوت)' آدم (ناسوت) میں حلول کر گیا اور یوں خدا اور انسان ایک ہو گئے۔

''خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں اس کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔ان میں سے دو ایک کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''پاک ہے اس خدا کی ذات' جس نے اپنے ناسوت کو لاہوت کا روشن بھید بنا کر ظاہر کیا۔پھر وہ اپنی مخلوق میں کھانے پینے والوں کی شکل میں آشکارا ہوا۔یہاں تک کہ اس کو اس مخلوق نے اس طرح دیکھا جیسا ایک دیکھنے والا دوسرے کو دیکھتا ہے''۔یہ عقیدہ کس قدر بالبداہت کفر تھا' اس کا اعتراف اور اعلان خود منصور نے ان الفاظ میں کیا ہے: ''کفرت بدین اللہ والکفر واجب لدی وعند المسلمین قبیح میں نے اللہ کے دین کا انکار کیا اور میرے نزدیک یہ انکار (کفر) واجب ہے' اگرچہ مسلمانوں کے نزدیک یہ بہت بُرا ہے۔اس کے کفر کی بنا پر عباسی خلیفہ المقتدر باللہ نے اسے ذی قعدہ 309ھ میں' بغداد میں قتل کر دیا اور اس کی لاش جلا کر راکھ دریا میں بہا دی۔''یہ عقیدہ اگرچہ عام نہ ہو سکا لیکن بعد میں آنے والے بعض اکابر صوفیاء نے منصور کو حق پر قرار دیتے ہوئے مستوجبِ تحسین و تبریک قرار دیا۔شیخ اکبر ابن عربی رحمہ اللہ اس کا نام بڑے احترام و عزت سے لیتے ہیں..... (باقی اگلے صفحہ پر)

علیٰ کہتا تھا تو وہ بھی ❶ سچ ہے۔ یہ بھی ❷ وہی ہے۔ یعنی اللہ حق بھی ہے اور اللہ باطل بھی۔

ہمارے ہاں یہ فلسفہ وحدت الوجود ہندوؤں کے ہاں سے وارد ہوا ہے

ابن عربی کہتے ہیں کہ یہ جو آپ کے ہاں لا الہ الا اللہ بنیاد ہے' جس کا آپ ترجمہ کرتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی الہ نہیں ہے' اس کے یہ معنی ہیں ہی نہیں۔ دنیا میں کوئی بھی الہ ہو' خواہ اسے باطل معبود کہو' وہ اللہ ہی ہے' اللہ کے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں۔ چل بھئی! یہ ہوا لا الہ۔ معاملہ ہی ختم ہوا۔ یعنی کم بخت دماغ منطقی ہو' اور گردن ذرا ٹیڑھی ہو' تو پھر دیکھو کہ وہ کیا کیا تماشے کرتی ہے۔ کیا کبھی آپ کا ذہن' ساری عمر' اس طرف جا سکتا تھا کہ لا الہ الا اللہ کے یہ معنی ہوں؟ جس لا الہ الا اللہ نے ہر الہ کی گردن کاٹ کر رکھدی' جڑ کاٹ دی کہ سوائے اللہ کے کوئی الہ نہیں ہے' اس کا ترجمہ' اس کا مفہوم' یہ دیا گیا کہ ''اس کا تو مفہوم یہ ہے کہ لا الہ کوئی بھی ہو' جسے تم دنیا میں الہ کہتے ہو' وہ کروڑوں انسان ہوں' وہ فرشتے ہوں' جس کو بھی تم پوجتے ہو' الہ کہتے ہو' وہ وہ نہیں ہے' وہ اللہ ہی ہے۔ ٹھیک ہے جی! یہ ہوتی ہے Logic (منطق) یعنی دودھاری تلوار۔

آپ دیکھتے ہیں کہ کس طرح برت رہے ہیں کہ یہ جو مختلف نام ہیں' یہ سارا وحدت الوجود کا فلسفہ ہے جو انہوں نے ہندوؤں کے ہاں سے لیا ہوا ہے جبکہ ہندوؤں کا یہ فلسفہ خود ان کے ہاں ختم ہو چکا ہے۔ بہرحال عام فقیروں کی ان کے ہاں جو روش چلی آ رہی ہے' اس مسلک کے تحت آپ ان کے ہاں روز سنتے ہونگے کہ میاں! گنگا ایک گھاٹ بہتیرے' عقل کے ہیں یہ سارے پھیرے۔ یہ گھاٹ تو مختلف ہیں۔ گھاٹ کے مختلف ہو جانے سے گنگا الگ الگ نہیں ہو جاتی۔ کبیر (1518-1440ء) کہتا ہے کہ یہ تمہارے عقل کے پھیر ہیں جو تم' میاں! ان گھاٹوں کو بھی الگ الگ سمجھ رہے ہو: گنگا ایک ہے' گھاٹ بہتیرے ہیں۔ چل بھئی!

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ سمیت .....اور صوفیائے نے بھی منصور کی عظمت اور بزرگی کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔'' (ماخوذ از پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' ادارہ طلوع اسلام' رجسٹرڈ لاہور' 1992ء' ص ص 79-77)۔

❶ ابن عربی اپنی کتاب فصوص الحکم کلمہ موسویہ میں یہ تک کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ فرعون ایمان پر مرا تھا اور اس کی بخشش ہو چکی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ تو یہاں تک بھی لکھ گئے ہیں (جس کے نقل کرنے سے میرا قلم تھرتھراتا ہے اور روح کانپتی ہے) کہ پس فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے انا ربکم الاعلیٰ کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔ (پرویز رحمۃ اللہ علیہ: سلیم کے نام جلد سوم' ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) لاہور' 1986' ص ص 41-40)

❷ ابن عربی اپنی مشہور کتاب فصوص الحکم میں لکھتے ہیں کہ ''جس مقام سے نبی لیتے تھے' اسی مقام سے انسان کامل' صاحب الزمان' غوث' قطب لیتے ہیں۔'' (پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص۔60)

وہی رام ہے، وہی رحیم ہے، وہی فرعون ہے، وہی منصور ہے۔

میں بھی ایک زمانے میں اس کشتی کا سوار رہ چکا ہوں

عزیزانِ من! جرأت اجازت نہیں دیتی کہ میں ان صوفیاء کی بیبا کی کے ایسے شعر پیش کروں۔ ایک پورا دور تھا کہ میں خود بھی ان کے آستانوں پر سر جھکایا کرتا تھا۔ یہ سارا کچھ مجھے معلوم ہے۔ یہ سب کچھ تعلیم کے طور پر حاصل کیا تھا۔ خدا کے حضور معافی چاہتا ہوں کہ یہ چیزیں اسی منطق کے ساتھ پیش کرتا تھا۔ ❶ وہاں تو ایک طرف نبی اکرم ﷺ اور دوسری طرف میں، گو کہ میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ ''دونوں یک سنگ ❷ ہیں۔ کہا ہے کہ یہ تو یونہی تمہاری نگاہ ہے جو تمہیں کہیں وہ ابولہب نظر آتا ہے اور یہ معاذ اللہ معاذ اللہ کہیں وہ محمد ﷺ نظر آتا ہے۔ اس 'بعد کا سوال ہی نہیں ہے، نہ ابولھب کا، نہ محمد ﷺ کا' سب سارے ایک ہیں۔ یہاں تو رام بھی وہی ہے رحیم بھی وہی ہے۔ جو کچھ تم کہتے ہو کہ یہ الگ الگ ہیں، غلط ہے۔ یہ صرف نگاہ کا پھیر ہے کہ بلھے شاہ ہورین، تے شاہ حسین ❸ ہوریں۔ اے تو

---

❶ ہر انسان کے اندر ایک قوت ہے جسے قوت خیال کہہ لو یا Will Power (قوت ارادی)، جسے اگر خاص طریقوں سے Develop (اُجاگر) کرلیا جائے تو اس سے ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں جنہوں نے ایسا نہ کیا ہو۔ یہ کچھ ہر انسان کرسکتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی تمیز نہیں...... ہندو سادھوؤں اور سنیاسیوں سے (جو علانیہ بت پرستی کرتے ہیں) ایسی ایسی ''خارق عادات'' باتیں سرزد ہوتی ہیں جو مسلمان پیروں سے بھی نہیں ہوتیں۔ اس بات میں تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ میری عمر کا ایک بڑا حصہ انہی وادیوں میں گزرا ہے اور میں نے یہ سب کچھ خود کر کے دیکھا ہے۔ اس کے لیے میں اپنے ہاں کی خانقاہوں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ سادھوؤں کی سمادھیوں تک سے بھی ہو آیا ہوں۔ وہاں یہی دیکھنے گیا تھا کہ اگر یہ ''کرامات'' دین اسلام کا مغز ہیں تو پھر مشرکین سے یہی کچھ کیسے سرزد ہو جاتا ہے! لہٰذا اس بات میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔ (حوالہ: پرویز رحمۃ اللہ علیہ: سلیم کے نام (جلد سوم)، ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، لاہور، 1986، ص-44)

❷ یہ الفاظ حدیقہ سنائی کے ایک شعر کے ہیں جسے لکھتے وقت ہزار بار روح تھرتھراتی ہے اور دل کانپتا ہے۔ اس لیے دل پر پتھر رکھ کر اور صد بار نقل کفر کفر نباشد کہتے ہوئے، یہ شعر لکھ رہا ہوں۔

در مذہبِ عاشقاں یک رنگ ابلیس و .... ﷺ است یک سنگ

یہاں نبی اکرم ﷺ کا اسم گرامی لکھا ہے۔ استغفر اللہ ثم استغفر اللہ (حوالہ: پرویزؒ: سلیم کے نام (جلد سوم)، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 186، ص۔41)

❸ شاہ حسین (فقیر نمانا) ...... مادھو لال کے عشق میں سرشار ناچتا اور گاتا ہے:

رانجھن رانجھن مینوں سب کوئی آکھو، ہیر نہ آکھو کوئی — جس شوہ نوں میں ڈھونڈھ رہی ساں، لدھا شوہ سوئی
رانجا میں وچہ، میں رانجھے وچہ، ہور خیال نہ کوئی — میں نئیں، اوہ آپ ہے، اپنی آپ کرے دل جوئی

میں محبوب محبوب پکارتے خود ہی محبوب بن گئی۔ اب مجھے ہیر (عاشق) کوئی نہ کہے۔ مجھے رانجا (محبوب) کہو۔ میں جس محبوب کو ڈھونڈ رہی تھی، وہ مجھے مل گیا ہے۔ محبوب مجھ میں ہے، میں محبوب میں ہوں اور کوئی خیال نہیں۔ اصل یہ ہے کہ میں ہوں ہی نہیں۔ وہ خود ہی ہجر کے آزار میں مبتلا ہے اور خود ہی اپنی دل جوئی کرتا ہے۔ (ماخوذ از پرویزؒ: تصوف کی حقیقت: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور، 1992ء ص92)

پوچھوای نا۔اے تے فیر نہلے تے دہلے ماردے نیں جاکے۔گلاں کرنیاں ہوندیاں ایہو جیاں پاگلاں نے' تے زبان ہیگی پنجابی اچ اسیں اونوں کیندے نیں کہ آپے دھیاں' تے آپ پتر' تے آپ بنیاماپے۔آپ جیوئے' تے آپے مارے' تے آپے کرے سیاپے۔ ❶ وہاں بھگت کبیر (1440-1518AD) کے الفاظ میں ''گنگا ایک' گھاٹ بہتیرے' کہت کبیر عقل کے پھیرے۔ یہاں کچھ اور آگے گیا ہے اور کہا ہے کہ آپے جیوئے' تے آپ ای مرے' آپے ای کرے سیاپے۔ ❷

خود کوزہ و خود کوزہ گرو' خود گل کوزہ' خود رندو سبوکش
خود برسرآں کوزہ خریدار برآمد' بشکست و رواں شد
خود گشت صراحی و مے و ساغر' خود بزم نشیں شد
خورد آں مے و سرمست ببازار بر آمد' شورِ دل وجاں شد

مٹی وی آپ' کمہار وی آپ' چاک وی آپ' پیالہ وی آپ' بنانے والا وی آپ' پین والا وی آپ' خریدن والا وی آپ' توڑن والا وی آپ' چلے جان والا وی آپ۔ ❸

بات صرف شاعری تک ہی محدود نہیں رہی

یہ بات صرف شاعری تک ہی محدود رہتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ یہ تو چیز ہی اور تھی۔ میں نے کہا ہے کہ جب یہ بات یہاں تک آ گئی کہ ''یہی پتہ نہیں کہ حکم کون دیتا ہے' کس کو دیتا ہے'' تو یہ سارے شریعت وغیرہ کے احکام ختم ہو گئے۔ آپ ان کے ہاں دیکھتے ہیں کہ بھنگڑ' چرسی' شرابی اور چمٹے والے' ان تمام کی پوجا ہوتی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ جو شریعت کے احکام ہیں' یہ سحر

---

❶ بلھے شاہ اور ہے' شاہ حسین اور ہے' اس کا تو پوچھو ہی نہیں۔(ان میں فرق کرو تو یوں ہے کہ) ایک نہلا ہے تو دوسرا دہلا۔اس میں تو ان پاگلوں نے ایسی ہی باتیں کرنا ہوتی ہیں اور پھر زبان ہے پنجابی۔اس میں یوں کہتے ہیں کہ آپ ہی بیٹی' آپ ہی بیٹا' آپ ہی ماں باپ بنا بیٹھا ہے۔ خود ہی جیتا ہے' خود ہی مارتا ہے' خود ہی آہ وفغاں کرتا ہے' خود ہی چلے جا رہا ہے۔

❷ جینے والا بھی خود اور مرنے والا بھی خود اور چیخ و پکار' آہ وفغاں کرنے والا بھی خود۔(بس خود ہی خود ہے)

❸ خود ہی مٹی' خود ہی کمہار' خود ہی چاک' خود ہی پیالہ' خود ہی بنانے والا' خود ہی پینے والا' خود ہی خریدنے والا' خود ہی توڑنے والا' چلا جانے والا بھی خود۔(بس وہ تو خود ہی خود' آپ ہی آپ ہے)۔

بنی ❶ کے لیے ہیں۔ ہم تو ہر پیکر کے اندر اسی کو دیکھتے ہیں۔ مثلاً شراب پیتا ہے تو یہ حسین نہیں پی رہا' وہی پی رہا ہے۔ ''چل بھئی'' کہو خدا کو۔ وہ یہ کچھ آپ کہتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیا کچھ کہا جا رہا ہے۔

تصوف میں مولانا رومؒ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ سے لے کر مجدد الف ثانی تک کا حصہ

عزیزانِ من! آپ کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ یہ ایک دل خراش داستان ہے۔ ابن عربی کے سلسلہ میں آپ نے دیکھا کہ وحدت الوجود کی رو سے کفر اور ایمان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ابن عربی اس وحدت کو فلسفیانہ رنگ میں بیان کرتے ہیں لیکن رومیؒ اسے اپنے ساحرانہ انداز کے مطابق' تشبیہہ و استعارات کی رنگینوں کے پردوں میں وجہِ فریبِ نگاہ بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم انڈے کو دیکھو۔ اس میں زردی اور سفید متمیز طور پر الگ الگ نظر آئے گی۔ لیکن.....

---

❶ مثلاً ''بلھے شاہ ہونی کہندے نے'': (بلھے شاہ فرماتے ہیں)

واہ سوہنیاں! تیری چال عجائب لٹکاں نال چلیندے ہو
آپے ظاہر و آپے باطن' آپے لک لک بہندے ہو
آپے ملاں' آپے قاضی' آپے علم پڑھندے ہو۔
ہن کس تھیں آپ چھپائیدا!

(پیارے محبوب! تمہارے انداز بھی عجیب ہیں۔ خود ہی ظاہر ہو' خود ہی باطن۔ خود ہی سب سے چھپ چھپ کر بیٹھتے ہو۔ خود ہی ملا ہو' خود ہی قاضی.....اور خود ہی تعلیم دینے والے عالم۔ اس کے بعد کہو کہ تم اپنے آپ کو چھپاتے ہو' تو کس سے چھپاتے ہو!) .....

دوسری جگہ کہا کہ:

اربع عناصر محل بتائیو' وچہ وڑ بیٹھا آپے
آپے کڑیاں' آپے نینگر' آپے بنیائیں ماپے
آپے مریں' تے آپے جیویں' آپے کریں سیاپے
بلھیا! جو کجھ قدرت رب دی' آپے آپ نجاپے

(اس نے خود ہی مادی کائنات کو پیدا کیا اور خود ہی اس کے اندر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ خود ہی لڑکا ہوتا ہے' خود ہی لڑکی اور خود ہی ماں باپ۔ وہ خود ہی زندہ ہوتا ہے اور خود ہی مرتا اور اپنے مرنے پر آپ ہی سیاپے کرتا ہے۔ یہ وہ بھید ہیں جو کسی کی سمجھ میں اپنے آپ آ نہیں سکتے)۔ (پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص ص 91-90)

بیضہ را چو ریز پر خویش پر درد از کرم
کفر و دیں فانی شد و شد مرغِ وحدت پر فشاں[1]

''جب اس نے اس انڈے کو اپنے کرم کی حرارت سے سیا' تو زردی اور سفیدی (کفر و ایمان) کا امتیاز ختم ہو گیا اور مرغِ وحدت پر فشاں نمودار ہو گیا۔''

رومی کے ہاں بحر اور موج کی مثال عام طور پر ملتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

بحر وحدانیت جفت و زوج نیست
گوہر و ماہیش غیر از موج نیست

اور اس کے بعد اس نتیجہ تک پہنچتے اور پہنچاتے ہیں کہ.....

اتصالے بے تکیف' بے قیاس
ہست رب الناس را باجان ناس

خدا اور بندہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ نہ انسانی عقل و قیاس اس کا احاطہ کر سکتے ہیں نہ کیف و کم کے ذریعے اسے بیان کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس باب میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ.....

می گفت در بیاباں رند دہن دریدہ
صوفی خدا ندارد اونیست آفریدہ

مولانا رومؒ کہتے ہیں کہ میں نے سنا صحرا کے اندر وہ کہہ رہا تھا ''خدا وہ انہیں ہے'' میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا' میں تو ہوں ہی وہ جو پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ وحدت الوجود کی ایک تعبیر تو یہ ہے کہ خود موجود ہے' سب خدا ہے۔ اس کی دوسری تعبیر ویدانتی ہے جس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی روح کا ایک جزو انسانی پیکر میں پہنچ کر مادہ کی دلدل میں پھنس گیا ہے اور نہایت کرب و اذیت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد و منتہیٰ یہ ہے کہ ترکِ علائق سے روحِ خداوندی کو اس دلدل سے آزادی دلائے تاکہ یہ جزو اپنے کل سے جا ملے۔ رومی وحدت الوجود کی ابن عربی کی تعبیر کے ساتھ ویدانتی تعبیر کے بھی قائل ہیں۔

ابن عربی نے کہا تھا کہ جس مقام سے نبی اور رسول لیتے ہیں' اسی مقام سے ہم غوث و ابدال لیتے ہیں۔ رومی نے اس دعویٰ کو اس انتہا تک پہنچا دیا جس سے آگے حد ہی باقی نہیں رہتی۔ وہ کہتے ہیں:

---

[1] پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص۔84

مکر کن در راہ نیکو خدمتے
تا نبوت یابی اندر امتے [1]

یعنی وہ مقامِ نبوت کو پہنچ جانے کو بھی ممکن قرار دیتے ہیں (استغفر اللہ) ۔ اس راہ کے اندر صرف اللہ ہی نور السموات والارض ہے۔ میرے اللہ! اسے کون روک سکتا ہے۔ اب یہاں سے یہ کچھ چلا آ رہا تھا۔ آپ کے ہاں محی الدین اکبر عربی سے لے کر داراشکوہ [2] تک یہ سب چلا آ رہا تھا۔ اس میں نہ تو وہ ہندو الگ' نہ مسلمان الگ' وہ سارا ایک یعنی رام بھی وہی اور رحیم بھی وہی۔ ہندوؤں کی ساری ویدانت یہی ہے۔ جب آگے آئے تو یہ بات ہوئی کہ صاحب! یہ ہے معاملہ مجدد الف ثانی۔ انہوں نے یہ کہا کہ نہیں' یہ سب وہی نہیں ہیں۔ ہیں تو وہ الگ الگ۔ اب آگے دیکھیے کہ Compromise (مصالحت) کیسے ہوتا ہے؟ انسان پھر یہ جو سلوک کے' تصوف کے منازل ہیں' وہ طے کر کے ترکِ دنیا' ترکِ آلائش سے آہستہ آہستہ آخر میں جا کر ذاتِ باری تعالیٰ میں فنا ہو جاتا ہے یعنی آخر میں تم ایک ہو جاتے ہو۔ پہلے الگ الگ رہتے ہیں۔ وہاں جو اتنا کچھ انہوں نے کہا تھا' یہ بچے اور یہاں آ کر یہ ہوا کہ 'عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا' یہ فانی باللہ اور باقی باللہ آپ کے ہاں کے سب منازل ہیں: پہلی منزل فنا فی اللہ اور پھر فنا فی الرسول' پھر فنا فلاں۔ [3] یہ جو آپ کے ہاں سلجھا ہوا تصوف کہا جاتا ہے' وہ یہ ہے کہ آخر میں جا کر یہ اس میں فنا ہو جاتے ہیں۔

تصوف میں بریلوی فرقے کا کردار: نور اور بشر کا معاملہ

عزیزانِ من! اب اس سے آگے چلیے۔ آج کل ہمارے ہاں ایک بریلوی فرقہ ہے' جسے رضائی فرقہ بھی کہتے ہیں۔ اس فرقہ کے بانی احمد رضا خان بریلوی ہیں۔ یہ آپ کے ہاں دین مصطفیٰ ﷺ دینے والے ہیں۔ اس بریلوی فرقے کے نمائندہ مولانا احمد

---

[1] پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص۔86

[2] پہلا مسلمان دانشور جس نے مسلمانانِ ہند کو' ہندو تصوف (ویدانت وغیرہ) سے روشناس کرایا' ابوریحان البیرونی تھا۔ یہ نابغہ روزگار' غزنوی عہد حکومت میں ہندوستان آیا اور اس نے پنجاب (ضلع جہلم) میں ہندو پنڈتوں سے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوؤں کی بیشتر اہم کتابوں کا عربی اور فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس طرح ہندی مسلمان پہلی بار اُپنشدوں اور یوگ کی تعلیم سے آشنا ہوئے۔ جس طرح عباسی خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں جب یونانی فلسفہ کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں تو مسلمان افلاطون، ارسطو، فلاطینوس وغیرہ کے فلسفہ اور تصوف سے آگاہ ہوئے تھے۔ بیرونی کے بعد شاہنشاہ اکبر نے مہابھارت' رامائن اور اسی نوع کی دیگر سنسکرت کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا لیکن اس باب میں سب سے زیادہ نقصان داراشکوہ نے پہنچایا۔ اس نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے اپنشدوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا اور اس کا نام سرِ اکبر رکھا۔ وہ اس کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ قرآنِ کریم میں جس ''کتاب مکنون'' کا ذکر آیا ہے' وہ اپنشد ہیں۔ اس نے یوگ بششٹ کا فارسی ترجمہ' منہاج السالکین کے نام سے کرایا۔ ان کتابوں میں وحدۃ الوجود کا فلسفہ (تصوف) اس کی شدید ترین شکل میں بیان کیا ہے۔ (پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص87)۔

[3] اس کی منازل یوں بھی کی جاتی ہیں: پہلے فنا فی الشیخ' پھر فنا فی الرسول' اور پھر فنا فی اللہ۔

شاہ نورانی ❶ ہیں۔ آپ نے نہ صرف ان کی مسجدوں میں' بلکہ ہر جگہ سنا ہوگا کہ حضور ﷺ نور تھے یا بشر تھے۔ نور اور بشر کا مناظرہ روز ہوتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ ان بریلوی حضرات نے کہا کہ بھئی! وہ بات تو نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ تو خود نور خدا تھے۔ اب انہوں نے بحث کی جو شکل نکالی اس میں وہ نبی اکرم ﷺ کا اسم گرامی ساتھ لے آئے۔ اب ان کی وجہ سے تو کسی کو جرأت نہیں ہوگی کہ کوئی کچھ کہے کہ وہ تو نور خدا تھے' جب خدا نور تھا اور وہ خدا کے نور تھے تو وہ تو ایک ہی ہوئے' چنانچہ ان کے ہاں یہ مانا جاتا ہے کہ رسول اللہ محض انسانوں کی خاطر بشری شکل میں نظر آتے تھے۔ احمد رضا بریلوی کا شعر ہے:

وہی جو مصطفوئ عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

(معاذ اللہ)

اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ''اٹھا دو پردہ' دکھا دو چہرہ کہ نور باری حجاب میں ہے''۔ نور اور بشر کا جو جھگڑا تھا' اس میں یہ رسول اللہ ﷺ کو وہی مانتے ہیں کہ ''اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر'' یہ صرف یہاں تک ہی نہیں ہے ان کی ذرا کتابیں کھول کر دیکھیے کہ کہاں تک چلے گئے ہیں۔ ❷

انسان میں حد بشریت تک اللہ کی صفات

اب آپ اللہ تعالیٰ کے متعلق سنیے۔ اس کی خصوصیت ہیں' جنہیں اسماء الحسنہ (Balanced Attributes) کہتے ہیں۔ اس کی کچھ صفات وہ ہیں جو صرف اس کے لیے مختص ہیں۔ وہ کسی بھی حد تک انسان کے لیے نہیں ہو سکتیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے اندر تو انسان علیٰ حد بشریت شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ علیم ہے' یہاں انسان صاحبِ علم ہوتا ہے۔ وہ خبیر ہوتا ہے' یہاں انسان باخبر بھی ہوتا ہے لیکن اس

---

❶ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔

❷ بریلوی (یا رضائی) فرقہ کے بانی مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ نے مرنے سے پہلے بہت سی وصیتیں کی تھیں جن کا مجموعہ ''وصایا شریف'' کے نام سے شائع ہوا ہے..... حضرت مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کو مجدد کہا جاتا ہے اور علوم شریعت کے بلند ترین ماہر۔ ان کے ملفوظات ہیں.....جس عقیدہ کی بنیاد پر (ان کے ہاں) غلو کی عمارت اٹھتی ہے' وہ عقیدہ تصوف کی جان ہے اور وہ تمام صوفیاء کے ہاں موجود۔ یعنی یہ عقیدہ کہ مرنے کے بعد یہ حضرات بدستور زندہ رہتے ہیں' اس دنیا میں آتے جاتے ہی نہیں بلکہ حاضر و ناظر ہوتے ہیں۔ ان کے مریدوں کے اعمالنامے ان کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ وہ ان کی لب پر آنے والی دعاؤں ہی کو نہیں سنتے' دل میں گزرنے والی خواہشات کا بھی علم رکھتے ہیں اور انہیں پورا بھی کرتے ہیں۔ یہ سب عقائد قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ کے خلاف ہیں۔ ان کے عقائد کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز رحمۃ اللہ علیہ: تصوف کی حقیقت' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص ص 108-107-

کی کچھ صفات وہ ہیں جو اسی کے لیے مختص ہیں ان میں کوئی دوسرا شامل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً وہ ہیں: **هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ** ❶ (57:3)۔ یہ جو آخر' ظاہر باطن صفاتِ خداوندی ہیں یہ صرف خدا کے لیے ہیں مگر یہ دیکھئے کہ یہ بریلوی حضرات کیا کہتے ہیں؟ اوّل تو یہ ہے کہ..... نہ ہوسکتے ہیں دو اوّل' نہ ہوسکتے ہیں دو آخر۔ یہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ ''**هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ**''۔ ❷ یہ وہی قرآن کی آیت (57:3) ہے اور آگے ہے کہ ''**بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ** ❸ لوحِ محفوظ خدا تم ہو'' اور دلیلیں سنیے کہ نہ دو اول ہوسکتے ہیں' نہ دو آخر ہوسکتے ہیں۔ تم اول اور تم آخر ہو' تم ابتداء تم انتہا ہو۔ اور پھر ڈرتے ہیں کہ

''خدا کہتے نہیں بنتی ' جدا کہتے نہیں بنتی
خدا پر ہی یہ چھوڑا ہے' وہی جانے کہ کیا تم ہو؟''

یہ پرانی باتیں نہیں ہیں۔ یہ آج آپ کے ہاں کا جو یہ بریلوی فرقہ ہے' جو دین مصطفیٰ کے داعی ہیں' وہ یہ کہتے ہیں۔

حیات النبی ﷺ کا عقیدہ

عزیزانِ من! مسلمانوں کو پتہ ہی نہیں ہے کہ ان کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ اور یہ کوئی بھنگڑ خانے کے فقیر نہیں ہیں جو یہ کچھ کہہ رہے ❹ انہیں مجدد مانا جاتا ہے' ان کا نظام ❺ لایا جا رہا ہے۔ وہ آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں اولیا اللہ بھی اس حد تک شریک ہوتے ہیں۔ حیات النبی کا یہ ایک عقیدہ بھی تو آپ نے سنا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں' حاضر و ناظر ہوتے ہیں' ہر جگہ موجود ہوتے ہیں' میلاد کی مجلس کے اندر' آپ کو پتہ ہے' کہ جب سلام پڑھتے ہیں تو کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ اس وقت تشریف لاتے ہیں' ان

---

❶ اس کی ذات' زمان و مکان (Time and Space) کی نسبتوں سے ماوراء ہے۔ سب سے اول بھی وہی ہے اور سب سے آخر بھی وہی۔ اس کے لیے نہ ابتداء ہے' نہ انتہا۔ وہ ہر شے پر غالب ہے لیکن اس کا غلبہ غیر مرئی (Unseen) اور غیر محسوس (Abstract) طور پر کام کرتا ہے (قانون ہوتا ہی غیر مرئی اور غیر محسوس ہے' اس کے نتائج محسوس (Concrete) اور مرئی (Visible) ہوتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ) جملہ کائنات اس کی صفت خالقیت و ربوبیت کی مظہر اور اس کی ہستی کی زندہ شہادت ہے' لیکن اس کی ذات' انسانی نگاہوں سے پنہاں اور مستور ہے۔ اس اعتبار سے وہ باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی۔ اسے الٰہیات کی اصطلاح میں یوں کہا جائے گا کہ وہ Transcendent بھی ہے اور Immanent بھی۔ (پرویز رحمۃ اللہ علیہ : مفہوم القرآن' طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' ص 1276-1275 بمعہ فٹ نوٹ ۱)۔

❷ مولانا احمد رضا خاں (مرحوم) کے صاحبزادہ مولانا حامد رضا خاں' حضور نبی اکرم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

نہ ہوسکتے ہیں دو اوّل' نہ ہوسکتے ہیں دو آخر — تم اول اور آخر' ابتدا تم انتہا تم ہو

❸ اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ (57:3) ان کا یہ شعر یوں ہے:

هو الاوّل هو الاخر هو الظاهر هو الباطل — **بکل شیءٍ علیم** لوحِ محفوظِ خدا تم ہو

❹ یعنی احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ بریلوی

❺ یاد رہے یہ نومبر 1977ء کی 4 تاریخ کو کہا گیا تھا۔

کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونا چاہیے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور ﷺ ہی نہیں، حضور ﷺ کے اتباع میں جو چلنے والے یہ صوفیاء ہیں، یا اولیاء کرام ہیں، ان کی بھی یہی صورت ہے۔ وہ بھی مرنے کے بعد زندہ ہوتے ہیں، ہر جگہ موجود ہوتے ہیں، ہر ایک کے حالات سے باخبر ہوتے ہیں، ہر ایک کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ **اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (24:35) کی تفسیر ہو رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نور ہیں، یہ اولیاء اور صوفیا بھی۔ اور ان کے اتباع میں چلنے والے، ان سے کسبِ فیض کر کے تو وہ اس وقت واشنگٹن اور لندن میں بھی ہونگے۔ پھر سنیے، اس وحی کے متعلق کیا کہنا ہے! نبی اکرم ﷺ کے متعلق، میں نے کہا ہے کہ یہ سن رکھیے۔ یہ آپ کو معلوم ہو کہ آپ کے سلام کے یہ کیا عقائد بتائے جاتے ہیں۔ مولانا احمد رضا خان صاحب (مرحوم) اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

وہی لامکاں کے مکیں ہوئے، سرِ عرش تخت نشیں ہوئے
وہ نبی ہیں جس کے ہیں یہ مکاں، وہ خدا ہے جس کا مکاں نہیں

کہا ہے کہ ''وہ نبی ہیں جس کے ہیں یہ مکاں''۔ او Illegal Allotment (غیر قانونی الاٹمنٹ) ہوگئی ہوئی سی۔ اوکڈ کے، تے او تھے بیہہ گئے۔ [1] وہ ''نبی ہیں جس کے ہیں یہ مکاں وہ خدا ہے جس کا مکاں نہیں''۔ اس کے بعد کہا کہ

وہی نورِ حق، وہی ظلِ رب، ہے انہی سے سب، ہے انہی کا سب
نہیں ان کی ملک میں آسمان کہ زمیں نہیں، کہ زماں نہیں؟ [2]

انہی کا سب ہے اور وہی سب کچھ ہیں۔ یہ ہیں جو آپ کے ہاں دین کا تصور دیتے ہیں، اور یہ ہیں جو آپ کے ہاں نظام مصطفیٰ ﷺ لانا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ بقول ان کے عقائد کے وہ مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ آگے بہت کچھ آپ کو سناؤں لیکن طبیعت میں ناخوشگواری پیدا ہوتی ہے۔ عزیزان من! اور آگے جانے کو جی نہیں چاہتا، یہ بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ صرف انہی کی ایک بات سنا دوں کہ جب یہ مرنے کے بعد زندہ ہوتے ہیں تو کس شکل میں زندہ ہوتے ہیں؟ کہا کہ جیسے یہاں زندہ ہوتے ہیں، مرنے کے بعد بھی اسی طرح زندہ ہوتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، تمہارے ہاں آتے ہیں، ملتے جلتے ہیں۔ اگر میری بیٹیاں اور بہنیں نہ بیٹھی ہوں تو آگے بھی ایک فقرہ کہہ دوں۔ بغیر کہے وہ سمجھ لیجیے۔ ان کے ہاں کی یہ چیز سن کر شرم وحیا کی آنکھیں زمین سے گڑ جاتی ہیں۔ [3]

---

[1] وہ غیر قانونی الاٹمنٹ ہوگئی تھی۔ اسے خالی کرایا اور پھر خود آ بسے۔

[2] یہ ہے مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون انہی کے الفاظ میں اور یہ ہیں زبان سے **اشھد ان محمد اعبدہ ورسولہ** کا اقرار کرنے والوں کے عقائد رسول اللہ کے متعلق! اور یہ ہے وہ مقام جہاں تصوف پہنچاتا ہے۔ (پرویز رحمۃ اللہ علیہ: تصوف کی حقیقت، طلوع اسلام ٹرسٹ ارجسٹرڈ) لاہور 1992، ص 98)

[3] اسے بیان کرنے کے لیے سینے پر پتھر رکھنا پڑتا ہے۔ اسے پڑھنے سے پہلے صد بار معاذ اللہ، استغفر اللہ کہنا پڑتا ہے۔ سنیے اور سر پیٹ کر رہ جائیے: ''انبیاء علیہم السلام کی قبور مطہرہ میں ازواج مطہرات پیش کی جاتی ہیں اور وہ ان کے ساتھ شب باشی فرماتے ہیں (مولانا احمد رضا خاں مرحوم: ملفوظات۔ حصہ سوم۔ ص 28)۔ مزید وضاحت وتوضیح کے لیے دیکھیے: تصوف کی حقیقت، طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور 1992ء، ص 108۔

اب آگے سنیے کہ وہ کیسے زندہ ہوتے ہیں۔

مولانا احمد رضا خانؒ کی وصیتیں

مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی وفات سے قریباً کوئی دو گھنٹے پہلے کچھ وصیتیں کی تھیں۔ان کی وہ وصیتیں ''وصایا شریف'' کے نام سے چھپی ہوئی موجود ہیں' وہ کسی سے بھی چھپی ہوئی نہیں ہیں۔اس میں ایک وصیت یہ بھی ہے کہ میری اس وفات کے بعد جب میں پردہ کر جاؤں (وہ وفات نہیں کہتے' وہ پردہ کرنا کہتے ہیں) تو اس کے بعد ہفتے میں دو تین بار اور چیزوں کے علاوہ کچھ ان اشیاء کی بھی فاتحہ دی جائے۔جن کا میں ابھی ذکر کروں گا اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو چیزیں فاتحہ میں دیتے ہیں' وہ ان کو پہنچتی ہیں' وہ انہیں کھاتے پیتے ہیں۔اپنے متعلق یہ فرما رہے ہیں کہ میرے پردہ کر جانے کے بعد ہفتے میں دو تین بار ان چیزوں میں سے بھی فاتحہ میں کچھ ضرور ساتھ رکھ لی جائیں۔اور جو چیزیں ان کا جی چاہے بھیجیں' ان کے علاوہ بالتخصیص یہ چیزیں بھی بھیج دیا کریں: ''دودھ کا برف خانہ ساز [1] اگر دودھ بھینس کا ہو' مرغ کی بریانی' مرغ کا پلاؤ خواہ بکری کا ہو' شامی کباب' پڑاٹھے اور بالائی فیرینی اردکی پھریری دال' مع ادرک ولوازم' گوشت بھری کچوریاں' سیب کا پانی' انار کا پانی' سوڈے کی بوتل' دودھ کا برف۔یہ نوری کتب خانہ لاہور سے ''وصایا شریف'' کے نام سے چھپے ہوئے موجود ہیں۔ [2] یہ جو نئے کتب خانے کھلے ہیں' وہ داتا دربار (لاہور' پاکستان) کے باہر کی بلڈنگ میں ہیں۔ان میں یہ نوری کتب خانہ ہے۔اس لیے کہہ رہا ہوں کہ سندر ہے۔اب یہ ''وصایا شریف'' میں ساری وصیتیں تھیں جو آپ سن رہے ہیں۔یہ ان کی آخری وصیتوں میں سے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ میری زبان زیب نہیں دیتی کہ کچھ اور مواد بھی پیش کروں جو اس قسم کے مجموعہ ''وصایا شریف'' میں درج ہے۔سوال یہ ہے کہ یہ سارا کچھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (24:35) کی تفسیر بیان ہو رہی ہے۔اسی قرآن میں ہے کہ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا ۙ وَّ یَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا (2:26) جو صحیح راستے پہ جانا چاہے وہ جاتا ہے اور اگر اس طرح سے اس کو کھینچا تانی کرنا شروع کرے تو اس سے پھر اس قسم کی مار پڑتی ہے' وہاں سے غلط راہوں پر چل نکلتا ہے۔مگر ان کے ہاں یہ ہے کہ قرآن کے باطنی معنی ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا جو تت تھا' جو مغز تھا' وہ تو ہم نے لے لیا ہے۔اور یہ جو تم باقی لفظوں سے قرآن پڑھتے ہو' یہ تو ہوئی ہڈیاں۔وہ ہم نے کتوں کے آگے پھینک دی ہوئی ہیں۔مولانا روم [3] کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے اس میں سے یہ مغز لے لیا ہے۔یہ

---

[1] خانہ ساز۔گھر کا بنا ہوا۔

[2] مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ : وصایا شریف' نوری کتب خانہ' لاہور' ص۔8۔

[3] مولانا جلال الدین رومیؒ 1207ء میں بلخ میں پیدا ہوئے' بچپن کا زمانہ نیشاپور میں گزرا اور خواجہ فرید الدین عطارؒ کے زیر تلمذ رہے۔پھر قونیہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور حضرت شمس تبریزیؒ کی صحبت میں تصوف کی منازل طے کیں۔مولانا رومؒ وحدت الوجود کے قائل اور پیام بر ہیں۔انہوں نے اپنی مشہور مثنوی میں اس مسلک کی تبلیغ کی ہے۔مولانا رومؒ کے ہاں ایک جوش اور حرارت پائی جاتی ہے۔ان کی یہی چیز مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کو بھا گئی ہے۔

اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ کی تفسیر ہو رہی ہے: مغز قرآن تو یہ ہے۔

کسی غیر محسوس شے کو مثال سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا

عزیزان من! اب قرآن کی طرف آیئے۔ پہلی چیز تو یہ ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ نور السموت والارض (24:35)۔ اللہ نے اپنے آپ کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔ یہ پہلی بنیاد ہی غلط ہے۔ مثال کے ذریعے آپ کسی محسوس شے کو کسی اس محسوس شے سے سمجھا سکتے ہیں جو اس سے ملتی جلتی ہو، غیر محسوس شے کو آپ مثال کے ذریعے سمجھا ہی نہیں سکتے۔ آپ کسی بڑے سے بڑے فلاسفر سے کہیے کہ وہ بتائے کہ درد کیا ہوتا ہے۔ وہ اگر کہے کہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے، تو اسے کہیے کہ مثال دے کر سمجھایئے کہ کیا ہو رہا ہے۔ کوئی ہے ذریعہ کہ آپ مثال دے کر سمجھائیں؟ یہ ہماری عام وہ غیر محسوسات چیزیں ہیں جنہیں ہم کہتے ہیں اور وہ جو ''برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم'' ہے تو کیا اس ذات باری تعالیٰ کو کسی مثال کے ذریعے سمجھایا جا سکتا ہے؟ یہ چیز میں نہیں کہتا، اس نے خود کہا ہے کہ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ❶ (42:11)۔ کسی شے کی مثال سے آپ سمجھایئے۔ آپ نہیں سمجھا سکتے۔ خود اس ذات کا آپ کے ہاں، کسی طرح، آپ کے تصور میں آنا، تو ایک الگ بات ہے، کوئی مثال بھی ایسی نہیں ہو سکتی جس سے ذاتِ باری تعالیٰ کو سمجھایا جا سکے۔ محدود (Finite) اور لامحدود (Infinite) میں فرق ہی یہ ہوتا ہے۔

کائنات کی ہر شے کو ہدایت سے نوازا گیا ہے

عزیزان من! قرآن کہتا ہے کہ خدا کو مثال کے ذریعے نہیں سمجھایا جا سکتا کیونکہ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ (42:11) اس کی مثل کوئی شے نہیں ہے۔ یہ مثال خدا کی نہیں ہے۔ نور السموت والارض کی مثال سے بھی خدا نے اپنے آپ کو نہیں سمجھایا۔ اس چیز کو سمجھنے کے لیے اس آیت سے پوچھیے اور دیکھیے گا کہ اس کا مفہوم کتنا واضح ہو جاتا ہے۔ سب کچھ نور علیٰ نور ہے اور اس آیت نے تو مزید بات صاف کر دی کہ یَہۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ (24:35) خدا کا دیا ہوا نور وہ ہے جس سے وہ ہر شے کو ہدایت کرتا ہے۔ یہ ہدایت کی روشنی ہے، یہ نور ہدایت ہے اور اس کے لیے خدا نے اسے اللہ نورِ السموت والارض خود کہہ دیا۔ کہا کہ پہلی چیز یہ ہے کہ خدا نے کائنات کو پیدا کیا تو اشیائے کائنات کو ان کی منزل تک پہنچنے کا جو صحیح راستہ ہے اس کی راہنمائی اپنے ذمہ لے لی۔ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی (20:50)۔ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کی تخلیق کی اور پھر جس منزل تک پہنچنا اس کا منتہا ہے، اسے اس کی طرف جانے کا راستہ دکھا دیا۔ اس نے سماوات والارض کے متعلق یہ کہا۔ خارجی اشیاء کے اندر یہ ہدایت، یہ راہنمائی عطا کی۔ یہ راہنمائی کائنات کی ہر

---

❶ اس کی مثل کوئی شے نہیں۔

شے کے اندر موجود ہے۔ یہ ان میں By Instinct (جبلتاً) رکھ دی ہے۔ ہر شے کو یہ معلوم ہے۔ اسی لیے ان کی طرف کسی پیغمبر یا رسول آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انڈے سے نکلتے ہی مرغی کے اس چوزے کو پتہ ہوتا ہے کہ مجھے پانی کی طرف نہیں جانا' ادھر رہنا ہے۔ چیل کا سایہ پڑے تو ماں کے پروں کے نیچے آ جاتا ہے۔ یہ کچھ کسی استاد نے اسے نہیں سکھایا' یا کسی پیغمبر نے نہیں سمجھایا۔ اسی کے ساتھ کے انڈے سے بطخ کا بچہ نکلتا ہے' وہ بھاگتا ہوا پانی کی طرف چلا جاتا ہے۔ یہ ہے **اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی** ❶ (20:50)۔ کائنات کی اشیاء کے اندر تو یہ صورت ہے۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ کائنات کی جو باہر کی اشیاء ہیں ان میں سے **کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِیْحَهٗ** (24:41) ہر ایک اپنی اپنی ''صلوۃ'' اور ''تسبیح'' کو خوب جانتی ہے۔ کیا الفاظ ہیں صاحب! صلوۃ ''فرائض منصبی'' کو کہتے ہیں اور تسبیح کہتے ہیں ''سرگردانی سے کسی شے کو حاصل کر لینا''۔ یعنی وہ جانتے ہیں کہ ہمارا فریضہ منصبی کیا ہے اور اس کے حصول کے طریقے کیا ہیں۔ ہزار ہزار میل شہد کی یہ مکھی اڑ کر چلی جاتی ہے' کوئی راستہ نہیں ہوتا' کوئی بجلی کے کھمبے نہیں ہوتے' کبھی راستہ نہیں بھولتی۔ ہر مکھی اپنے شہد کے ٹھکانے کے اندر سیدھی براہ راست آ جاتی ❷ ہے۔ انسان دے بچے دی روز ڈھونڈ پئی ہوئی ہوندی ہیگی اے' اشتہار نکلن ڈئے ہوندے ہیگے نیں' رل گیا ہووے گا۔ ❸

انسانوں کی طرف بھی وحی نازل کی اور اس طرح پوری کائنات کو نور سے بھر دیا

کائنات کی ہر شے میں جو خدا کی ہدایت تھی' وہ اس نے از خود دیدی۔ انسانوں کے لیے یہ ہدایت وحی کے ذریعے' ایک ''فرد'' کی طرف سے آئی اور اس نے انسانوں کو دی۔ یہ ہدایت آخری مرتبہ' مکمل غیر متبدل محفوظ شکل میں' قرآن کے اندر ہے اور قرآن کریم کو خدا نے نور کہا ہے: **قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ** (5:15) تمہاری طرف خدا کی طرف سے ایک نور یعنی روشنی آ گئی ہے' یعنی ایک ایسی کتاب ہے جو خود نہایت واضح ہے اور واضح کرنے والی ہے۔ تاریکی میں ہدایت کا پہلا ذریعہ ہی روشنی ہے۔ اس نے قرآن کو روشنی کہا ہے۔ ایک مقام پہ نہیں' متعدد مقامات پہ یہی کہا ہے۔

آگے چلیے' نبی اکرم ﷺ کی طرف جو وحی نازل کی گئی اس کے متعلق فرمایا کہ **وَ كَذٰلِكَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا**

---

❶ ہمارا رب وہ ہے جو ہر شے کو پیدا کرتا ہے اور پھر اسے وہ راستہ بتا دیتا ہے (جس پر چل کر وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ انسانوں تک یہ راہنمائی وحی کے ذریعے آتی ہے' جسے لے کر ہم تمہارے پاس آئے ہیں)۔ (پرویز رحمۃ اللہ علیہ: مفہوم القرآن' ص۔710)

❷ اور وہ قانونِ مشیت یہ ہے کہ جو شخص عقل و فکر سے کام لے کر اس کی طرف رجوع کرے وہ اس سے راہ نمائی حاصل کر سکتا ہے۔

❸ انسانی بچے کی ڈھنڈیا پڑی ہوتی ہے' اشتہارات نکل رہے ہوتے ہیں کہیں گم ہو گیا ہو گا۔

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِیْمَانُ ❶ (42:52) تو اس سے پیشتر جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں' ایمان کسے کہتے ہیں۔ خدا کی طرف سے تمہیں یہ Objectively (خارج سے) ملا ہے' یہ تمہاری اپنی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ یہ علم اس کی طرف سے دیا گیا ہے۔ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا (42:52) ہم نے اس وحی کو' اس قرآن کو نور بنا کر بھیجا ہے۔ کا ہے کے لیے بھیجا ہے؟ تا کہ نَهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (42:52) ہم اپنے بندوں کو اپنے قانون مشیت کے مطابق زندگی کا صحیح راستہ دکھائیں۔ ❷ یہاں (24:35) میں' یہ کہا تھا کہ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ (24:35) یہ اسی آیت اللہ نور السموت والارض کے قریباً آخری الفاظ ہیں اور یہی الفاظ قرآن کے متعلق اس آیت میں ہیں کہ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ❸ (42:52)۔ یہ لوگوں کے لیے نور ہے' تو قرآن کریم اللہ کا وہ نور ہے' اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (24:35) جو خارجی کائنات میں اور انسانوں کی دنیا کے اندر ہدایت کی روشنی ہے' جو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ اور اس میں ایک عجیب چیز اور بھی ہے۔ عربی زبان میں نور اسے کہتے ہیں جو اپنی دلیل آپ ہو یعنی وہ اپنے آپ کو دکھانے کے لیے کسی اور روشنی کا محتاج نہ ہو' اس لیے قرآن کریم اپنی دلیل آپ ہے اور اس قدر روشن اور واضح ہے کہ اسے اپنی وضاحت کے لیے کسی خارجی روشنی کی ضرورت نہیں۔ نور کا دوسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر شے کے اصلی مقام کو متعین کر دیتا ہے اور اس کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک واضح کر دیتا ہے اس لیے قرآن کریم انسانی زندگی میں ہر شے کے متعلق بتا دیتا ہے کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے۔ اسی کا نام ہدایت یا راہنمائی ہے یعنی غلط اور صحیح میں امتیاز کر دینا۔

عربی زبان میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی کو زیادہ شدت کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ اسم فاعل کے معنی میں آتا ہے۔ نور کے معنی ہوتے ہیں ''منور' نورانیت' نور دینے والا' روشن کرنے والا'' اس آیت اللہ نور السموات والارض کا ترجمہ ہی یہ ہے کہ کائنات میں روشنی عطا کرنے والا اللہ ہے۔ یہ اس کا لفظی ترجمہ ہے۔ عربی قاعدے کی رو سے ان میں سے کسی سے پوچھیے کہ کیا مصدر اسم فاعل استعمال ہوتا ہے یا نہیں؟ ہاں' وہ منور ہے اور کائنات کا روشن کرنے والا ہے۔

اس آیت نے لوگوں کو بڑی گمراہی میں ڈال رکھا ہے

عزیزان من! خدا کے کائنات کو روشن کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس نے اشیائے کائنات میں فطری طور پہ' By Instinct ہدایت

---

❶ اسی طرح اے رسول! ہم نے اس قرآن کو تیری طرف وحی کیا ہے۔ یہ ہمارے عالم امر سے بڑی توانائیاں ساتھ لیے' تیری طرف نازل ہوا ہے۔ (اسے تم نے اپنی محنت اور کسب و ہنر سے حاصل نہیں کیا۔ کسب و ہنر سے حاصل کرنا تو ایک طرف رہا) تجھے تو اس سے پہلے اس کا بھی علم نہیں تھا کہ خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب کیسی ہوتی ہے۔ اور ایمان کسے کہتے ہیں! (پرویز رحمۃ اللہ علیہ: مفہوم القرآن' ص۔1140)

❷ اس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورہ النحل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2003ء

❸ ہم نے اس قرآن کو جگمگاتا ہوا نور بنا دیا جس سے ہم اپنے بندوں کو اپنے قانون مشیت کے مطابق' زندگی کا صحیح راستہ دکھاتے ہیں۔

ودیعت کردی۔ انسانوں کی طرف جو ہدایت بھیجی وہ قرآن کے ذریعے بھیجی اور اس کے متعلق کہا ہے کہ **مَثَلُ نُوْرِهٖ** (24:35) اس کی مثال نور کی سمجھو۔ سوال یہ ہے کہ چونکہ وہ نور، جو ہدایت تھا، جو خدا کے پاس علم تھا، وہاں تک تو وہ Abstract تھا، وہاں تک تو وہ غیر محسوس تھا، اور جب وہ ہماری طرف آیا ہے تو وہ ایک محسوس شکل میں ہے۔ محسوس شکل کیا ہوتی ہے، جو معنی ہوتا ہے وہ تو محسوس نہیں ہوتا۔ جب علم لفظ میں آتا ہے تو محسوس ہو جاتا ہے، آپ کو پھر پتہ چلتا ہے۔ یہ علمِ خداوندی، یہ ہدایت خداوندی، تو خدا کے پاس محسوس شکل میں نہیں تھی۔ جب یہ ہمارے ہاں آئے تو محسوس شکل میں آئے۔ اس لیے کہا **مَثَلُ نُوْرِهٖ** (24:35) اس کی مثال نور کی سمجھو، یعنی خدا کی اس مشعلِ ہدایت یعنی وحی کی مثال یوں سمجھو۔ اس کے برعکس خدا کی مثال کے لیے تو اس نے خود کہا تھا کہ **لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ** [1] (42:11)۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس آیت نے لوگوں کو بڑی گمراہی میں ڈال رکھا ہے۔ خدا نے اپنے متعلق کہا تھا کہ **لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ** (24:11)۔ اس کی مثل تو کوئی نہیں ہے۔ یہاں کہا کہ **مَثَلُ نُوْرِهٖ** (24:35) اس کے نور کی مثال یہ ہے جو ہم آگے بتاتے ہیں۔ یہ مثال خدا کی نہیں ہے۔ یہیں سے واضح ہو گیا کہ ''نور السموت والارض'' میں خدا خود نور نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے نور کی مثال ہے۔

خدا کے نور کی مثال اور خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نورانی چراغ کی خصوصیات

عزیزانِ من! اب اس کے نور کی مثال سنیے۔ پہلے میں لفظوں میں کہونگا کہ وہ مثال یوں ہے کہ **كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ** (24:35) ایک طاق ہے، جس کے اندر ایک چراغ رکھا ہوا ہے۔ طاق کے باہر جو دیا ہے اس کے اوپر تو ہواؤں کا اثر ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بجلی کے بلب (Electric Bulbs) تو ہوتے نہیں تھے کہ جب ہوائیں چلیں یا جھکڑ چلے تو ان پہ کوئی اثر ہی نہ ہو۔ دیا جو اس کے اوپر ہے اس پر تو اثر ہوتا ہے۔ اس زمانے میں دیئے طاق کے اندر رکھے جاتے تھے۔ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ باطل اس کے دائیں، بائیں، پیچھے، سے آ نہیں سکے گا تو مثال وہ طاق سے سمجھائی۔ کیسی عمدہ مثال ہے! اس زمانے کا دیا طاق میں رکھا ہوا ہے، محفوظ ہے، خارجی اثرات سے متاثر نہیں ہوتا۔ بھئی! دیئے کو بجھانے کے لیے آگے سے بھی تو جھکڑ پڑ سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ نہیں کیونکہ **اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ** (24:35) اس دیئے کے آگے سے بھی حفاظت کے لیے ہم نے شیشے کا ایک صندوق لگا دیا ہے۔ اگر آگے بھی اسی قسم کی دیوار ہوتی جیسی کہ طاق کی ہے تو پھر تو یہ روشنی باہر آ ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ محفوظ مقام میں ہے۔ اب یہ روشنی شیشے میں سے آ رہی ہے۔ یہ قرآن کے الفاظ ہیں جن کے ذریعے سے اس کے معنی ہم تک پہنچتے ہیں اور وہ شیشہ واضح صاف مصفا ہے۔ اس میں سے یہ معنی تم تک پہنچتی ہے۔ کہتا ہے کہ **اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ** (24:35) شیشے میں سے جو اس کی کرنیں نکلتی ہیں وہ یوں سمجھو کہ ستارہ صبحگاہی ہے جو فضا کی تاریکیوں میں نور پاش ہے۔

---

[1] اس کی مثال کوئی شے نہیں ہے۔

کیا پوچھتے ہو نور کے تڑکے کا! بس ایک تارا ہوتا ہے۔ اگر آپ کبھی اس وقت اٹھتے تو دیکھتے اس تارے کو۔ وہ بڑا ہی روشن تارا ہوتا ہے۔ کہا کہ وہ شیشہ یوں سمجھو کہ ستارہ صبحگاہی ہے جس سے دودھ کی طرح نور کی ندیاں رواں چلی آ رہی ہوں۔ عرب سفیدے کے لیے دودھ کی مثال دیا کرتے تھے۔ یہاں کہا کہ اس میں سے نور کی ندیاں رواں چلی آ رہی ہوں اور پھر اس تارے کے نور کی ندی دنیا کے کسی چراغ میں سے لے لیجیے تو وہ کسی وقت ختم ہو جائے گی لیکن اس کی نورانیت' اس چاند اور سورج اور ستاروں کی نورانیت ختم نہیں ہوگی۔ جب سے یہ کائنات بنی ہے اس میں سے یہ نور نکل رہا ہے اور یہ نور نہ مدھم پڑتا ہے نہ ختم ہوتا ہے۔ اس نور کے متعلق کہا کہ **تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا** (6:115) اس نور یعنی قرآن میں خدا کا ضابطہ قوانین تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے' اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مکمل ہو چکا ہے۔ اب یہاں زجاج یعنی چراغ کی مثال دی ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **يُوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ** (24:35)۔ اب اس زمانے کے چراغ میں تو کوئی تیل بھی ڈالنا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں زیتون کا تیل ہوتا تھا۔ کہا کہ ٹھیک ہے یہ چراغ ایک ایسے بابرکت شجر زیتون کے تیل سے روشن ہو جو مشرق اور مغرب کی نسبتوں سے ماوراء ہو' تمام نوع انسانی کے لیے یکساں ہو۔ عالمگیر آسمان سے نازل شدہ وحی کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ شرق اور غرب کی نسبتوں سے ماورا ہو۔ اب وہ جو دیا ہے اسے تو بہرحال کسی دوسری ماچس کو اٹھا کے جلانا ہوتا ہے' اسے باہر کی آگ سے روشن کرنا ہوتا ہے' وہ اپنی روشنی دینے کے لیے خارج کی روشنی کا محتاج ہوتا ہے۔ کہا کہ نہیں' وہ تیل کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی خارجی روشنی سے اسے جلائے۔ **وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ** (24:35)۔ خارج کی آگ سے اس دیئے کو جلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ازل سے جل رہا ہے' ابد تک جلتا رہے گا۔ کسی خارج کی آگ نے اس کو نہیں جلانا' وہ وحی فکر انسان کا محتاج نہیں اور نہ روشنی حاصل کرنے کے لیے تمہیں جا کے اس دیئے کو جلانے کی ضرورت پڑے گی' خارج سے کسی شے کی ضرورت نہیں۔

چراغ اپنی دلیل آپ ہوتا ہے

قرآن کو سمجھنے کے لیے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن اپنے آپ کو خود واضح کرتا ہے۔ جلتا ہوا دیا ہے' جو چراغ ہے۔ یہ بتانے کے لیے کہ فلاں جگہ چراغ ہے' آپ کو کوئی چراغ نہیں لے جانا پڑتا۔ وہ چراغ اپنی دلیل آپ ہوتا ہے کہ میں یہاں ہوں اور یہ میری روشنی ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے' عزیزان من! کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اس کی آیات خود سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ وہ اپنے معانی اور تفسیر کے لیے کسی خارجی امداد کا محتاج نہیں ہے۔ اس لیے کہا ہے کہ باہر سے آگ لا کر اس کو جلانے کی ضرورت نہیں ہے' یہ جلتا ہوا ہے۔ اسے نور علی نور (24:35) کہا۔ کیا پوچھتے ہو اس کے! وہ چراغ نہیں' روشنی کی تہیں (Layers) ہیں جو ایک کے اوپر دوسری' تو بر تو' تہ در تہ چڑھی ہوئی ہیں۔ وہ سارے کا سارا نور ہے۔ نورِ مجسم ہے۔ اس میں روشنی ہی

روشنی ہے گویا جگمگاتے تہ در تہ چراغ ہیں۔ خدا کے اس نور یعنی وحی کے لیے کہا کہ **يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ** (24:35) یہ ہے خدا کا وہ نور یعنی وحی جس کی طرف وہ ہر اس شخص کی راہ نمائی کرتا ہے جو اس سے راہنمائی لینا چاہے۔ اس لیے جو اس روشنی سے ہدایت حاصل کرنا چاہتا ہے اسے اس کے ذریعے ہدایت مل جاتی ہے۔ اس میں پہلی شرط یہ ہے کہ اپنی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں۔ اپنی آنکھیں بند کیجیے تو یہ دیا تو رہا ایک طرف' آپ کو سورج کا دیا بھی کچھ روشنی نہیں دے سکتا۔

عزیزانِ من! یہ "من یشآ" جہاں آتا ہے' ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ہوتا ہے کہ "جس کو خدا چاہتا ہے' اس کو ہدایت دیتا ہے"۔ اس ایک لفظ کے غلط ترجمے نے سارے ہی تصورات الٹ کے رکھ دیئے ہیں۔ آپ کے ہاں یوں ہے کہ "جسے وہ چاہتا ہے' اسے ہدایت ملتی ہے"۔ تو جن کو ہدایت نہیں ملی ہوئی ان کا جرم کیا ہے۔ بقول ان کے وہ کہتا ہے کہ انہیں ہم جہنم میں ڈالیں گے۔ ہدایت آپ نہیں دتی' تے جہنم اچ اوناں نوں پا دیو۔ [1] یہاں ہدایت وراہنمائی کے سلسلے میں یہ الفاظ ہیں: **من یشآء** (24:35) یعنی جو راہنمائی حاصل کرنا چاہتا ہے یہ وحی اس شخص کی راہ نمائی کرتی ہے۔ اس سے ہمارا کام تو یہ ایک چراغ دیدینا تھا۔ اس سے روشنی حاصل کرنا یا نہ کرنا' تمہارا اپنا کام ہے۔ **يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ** (24:35) اللہ مجرد حقیقتوں (Abstract Realities) کو اس قسم کی محسوس (Concrete) مثالوں سے اس لیے بیان کرتا ہے تا کہ لوگ بات اچھی طرح سمجھ جائیں۔ اس لیے یہاں کہا ہے کہ ہم ان محسوس مثالوں کے ذریعے سے مجرد حقائق کو یوں سمجھا دیتے ہیں۔ یہ مثالیں اس کی طرف سے دی جاتی ہیں جو **وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ** (24:35) جو جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور اسے کس قسم کی مثالوں سے واضح کیا جانا چاہیے ورنہ ہمارے علم کے اندر تو ہر شے ہے لیکن ہمارا علم تم تک محسوس ذرائع سے پہنچے گا۔ اس لیے انہیں محسوس ذرائع سے سمجھانا پڑا ہے۔

قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا

یہ آیت اتنی حسین ہے کہ اگرچہ میں نے الفاظ کے معنی سمجھا دیئے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ میں قرآن کا ترجمہ نہیں کیا کرتا۔ قرآن کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا' ان الفاظ کے مرادف مل ہی نہیں سکتے اور زبان تو ایک طرف رہی عربی میں بھی نہیں مل سکتے۔ قرآن کریم کی زبان بھی اتنی وسیع ہے اور پھر قرآن کا انتخاب بھی یہ ہے۔ یہ میں یونہی نہیں کہہ رہا۔ عربی زبان کے اندر تفسیریں ہیں۔ قرآن کی ایک تفسیر ایسی بھی ہے کہ جس میں انہوں نے تفسیر نہیں کی بلکہ قرآن کا لفظ لیا ہے پھر اس کے آگے بریکٹ (قوسین) کے اندر عربی ہی کا ایک اور لفظ لکھ دیا ہے تو وہ عربی زبان کے الفاظ ہو گئے۔ آپ قرآن کے الفاظ کے لیے ان الفاظ (مترادفات) کو لیجیے اور

---

[1] ہدایت خود نہیں دی اور جہنم میں انہیں ڈال دو۔

قرآن کی آیت کو لیجیے' زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ عرب لکھنے والے ہیں' عربی زبان میں لکھا ہوا ہے۔ حسنِ انتخاب کی اس کی یہ کیفیت ہے اس لیے اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ ہمارے ہاں تو وہ ایک طرف رہا' میں نے کہا ہے کہ گب [1] (Gibb) اس کا اعتراف کر رہا ہے۔ وہ اپنے ہاں کے ان لوگوں سے کہہ رہا ہے جنہوں نے قرآنِ کریم کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ دراصل وہ انہیں پھٹکار رہا ہے کہ تمہاری مت ماری گئی جو تم اس قرآن کا ترجمہ کر رہے ہو۔ اؤ یہ ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد اس نے مثال کے طور پہ ایک آیت دی ہے [2]' اس میں چھ (6) الفاظ ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ تم ساری دنیا کی انگریزی لے آؤ اور مجھے ان کا ترجمہ کر کے بتا دو [3]۔ گب (Gibb) اپنے ہاں کے لوگوں کو لکھ رہا ہے کہ قرآن کا مفہوم ہمارے لفظوں میں بیان ہوسکتا ہے' اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔

عزیزان من! دو تین منٹ ہیں اجازت چاہتا ہوں کہ میں اس آیت کا مفہوم بتا سکوں۔

اس آیت کا ''مفہوم القرآن'' میں مفہوم

میں نے ''مفہوم القرآن'' میں اس کا جو مفہوم دیا ہے اسے اب میں ان الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ ''خدا نے ہر شے کو پیدا کیا ہے اور اسے اس راستے پر چلنے کے لیے راہنمائی دی جو اس کے لیے مقرر کیا گیا تھا (20:51) اور یہی وہ خدا کا نور ہے جو ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ اشیائے کائنات میں یہ ہدایت ان کی پیدائش کے ساتھ' ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ لیکن انسانوں کو یہ راہنمائی کتاب کی شکل میں دی گئی ہے۔ خدا کی مشعلِ ہدایت (وحی) کی مثال یوں سمجھو' جیسے کسی طاق میں' جو پیچھے سے بند ہو' اس لیے محفوظ' اور سامنے سے کھلا ہو' جس سے روشنی ساری فضا میں پھیل جائے' ایک جگمگاتا چراغ ہو' ایسا ٹھنڈی اور صاف روشنی دینے والا چراغ' جیسے ستارۂ صبحگاہی فضا کی تاریکیوں میں نور پاش ہو' اور اس چراغ کو ایک صاف اور شفاف شیشے کے فانوس میں رکھ دیا گیا ہو' تا کہ وہ تمام خارجی اثرات سے محفوظ رہے۔ (41:42) خود فانوس

---

[1] H.A.R. Gibb۔ یہ برطانوی ماہر علوم شرقیہ ہیں۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنی معروف کتاب Modern Trends in Islam (اسلام میں جدید رجحانات) کے ص.4 پر کیا ہے۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

The Koran is essentially untranslatable, in the same way that great poetry is untranslatable.

[2] (50:43)

[3] وہ آیت ہے: انا نحن نحی و نمیت و الینا المصیر (50:43)

اس کے الفاظ یہ ہیں:

"Verily We give life and death and unto Us is the journeying," "It is impossible to present in English (or perhaps any other language) the force of the five-times repeated "We" in the six words of the original. (Gibb:Modern Trends in Islam, P.4).

بھی ایسا درخشندہ گویا وہ چمکتا ہوا تارہ ہے جس سے نور کی ندیاں رواں ہیں۔ وہ چراغ ایک ایسے بابرکت شجر کے تیل سے روشن ہو جو مشرق اور مغرب کی نسبتوں سے بلند، تمام نوع انسان کے لیے یکساں ہو۔ ایسا تیل جو اس کا محتاج نہ ہو کہ کوئی خارجی روشنی اسے جلائے۔ وہ اپنے آپ روشن ہو اور دوسروں کو بھی روشنی دے۔ وہ اپنے معانی اور تفسیر کے لیے خارجی امداد کا محتاج نہ ہو۔ وہ چراغ نہیں، روشنی کی تہیں ہیں جو ایک کے اوپر دوسری، تو برتو، چڑھی ہوئی ہیں۔ وہ سارے کا سارا نور ہے۔ نور مجسم ہے۔ اس میں روشنی ہی روشنی ہے۔ گوہر میں آب گوہر کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

''یہ ہے خدا کا وہ نور (وحی) جس کی طرف وہ ہر اس شخص کی راہنمائی کرتا ہے جو اس سے راہنمائی لینا چاہے۔ اللہ مجرد حقیقتوں کو اس قسم کی محسوس مثالوں کے ذریعے اس لیے بیان کرتا ہے تاکہ لوگ بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہ مثالیں اس خدا کی طرف سے دی جاتی ہیں جو جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور اسے کس قسم کی مثالوں سے واضح کرنا چاہیے۔''

میں نے اپنے مفہوم القرآن میں ان آیات کا یہ مفہوم لکھا ہے، عزیزان من! اب وقت ہو گیا۔ سورۃ النور کی یہ 35 ویں آیت تھی، جسے ہم نے ختم کیا ہے۔ 36 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀ ..... ❀❀❀ ..... ❀❀

ساتواں باب: سورۃ النور (آیات 36 تا 39)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾

عزیزان من! نومبر 1977 کی 11 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورۃ النور کی آیت 36 سے ہو رہا ہے: (24:36)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیت میں خدا کے نور یعنی خدا کے عطا کردہ نورِ ہدایت' قرآن کریم' سے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا گیا تھا کہ یہ ایک جگمگا تا چراغ ہے' طاق کے اندر رکھا ہے تا کہ اِدھر اُدھر کی' خارج کی' ہوائیں اور جھکڑ سے وہ محفوظ رہے۔ اس کے سامنے ایک نہایت صاف شفاف شیشہ ہے یعنی وہ الفاظ جن کے ذریعے سے اس کی روشنی باہر آتی ہے۔ جگمگا تا ہوا چراغ' ستارہ صبح کی طرح روشن' اس تیل سے جلتا ہے جو شرق اور غرب کی نسبتوں سے پاک ہے۔ اسے جلانے کے لیے کسی خارجی روشنی کی' آگ کی' ماچس کی' ضرورت نہیں۔ وہ خود جلتا ہے اور ساری دنیا کو نور دیتا ہے اور یہ تھا وہ نور جس کے متعلق خدا نے کہا کہ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (24:35) جو بھی اس چراغ سے روشنی حاصل کرنا چاہے اسے روشنی مل جاتی ہے۔

خدا مثالوں کے ذریعے باتوں کو سمجھاتا ہے اور اسی تسلسل میں آگے ہے کہ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ (24:36) یہ چراغ ان تمام گھروں کے اندر ہوتا ہے۔ اس سے گھر کو بلندی اور رفعت نصیب ہوتی ہے۔ ایک گھر کا چراغ تو اسی گھر کا چراغ ہوتا ہے' دوسرے گھر کا نہیں ہوتا۔ یہ وہ عالمگیر چراغ ہے جو ہر گھر میں ہوتا ہے اور اس کے ذریعے خود اس گھر کو بلندی اور رفعت نصیب ہو جاتی ہے۔ عام طور پہ تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے مساجد مراد ہیں اور مساجد کو اونچا بنانا اور اونچے مینارے بنانے مراد ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بھی کہا جائے۔ ان میں بھی قرآن کا' خدا کا' ذکر ہوتا ہے' قرآن کا چرچا ہوتا ہے لیکن اسے محدود کیوں کیا جائے' بالخصوص اگلی آیت میں اسے صرف مساجد تک

تک محدود نہیں رکھا گیا۔

گھروں کے اندر صفاتِ خداوندی کا چرچا

میں ابھی عرض کرونگا کہ جن گھروں میں صفاتِ خداوندی کا چرچا ہوتا ہے انہیں رفعت اور بلندیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ گھر ہیں کہ وَ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ (24:36) جن میں صفاتِ خداوندی کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔ وہ یہ تدبیریں سوچتے رہتے ہیں کہ اس چراغ کی روشنی کو عام کرنے کے لیے کیا کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ وہ اس کے لیے سرگرداں رہتے ہیں، ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ اس آیت میں، صبح وشام، محاورہ ہے جیسے ہم دن رات کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہمیشگی اور دوام ہوتا ہے، مسلسل ہوتا ہے یعنی وہ ہمیشہ اس فکر میں مسلسل سرگراں رہتے ہیں کہ اس چراغ کی روشنی کو کس طرح زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور آگے یہ کہا کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ راہبوں کی کوٹھڑیاں یا خانقاہیں ہیں، جن کے اندر یہ چراغ جل رہا ہے اور وہ ان میں مصروف وردو وظائف ہیں۔ قطعاً نہیں، یہ تصوف والوں کی خانقاہیں نہیں ہیں بلکہ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (24:37) یہ عام لوگ ہیں جو کاروبار کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہ کاروبار یہ خرید وفروخت انہیں خدا کے قانون سے غافل نہیں ہونے دیتی، اور نہ ہی انہیں ان کے اہم فرائضِ حیات سے غافل کرتی ہے۔ بس یہ فرق ہوا جن گھروں میں، جن کے سامنے اس چراغ کی روشنی ہے اور دوسرے لوگوں میں۔ فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو یہ دنیاوی کاروبار قوانینِ خداوندی سے غافل کر دیتا ہے، ادھر سے ان کی توجہ ہٹا دیتا ہے لیکن جن کے گھروں میں، جن کے ہاں، جن کے سینوں میں، اس چراغ کی روشنی ہوتی ہے، دنیاوی کاروبار انہیں خدا کے قوانین سے غافل نہیں ہونے دیتا اور ان کا فریضہ حیات وہی رہتا ہے جو مومنوں کا فریضہ حیات ہر جگہ بتایا گیا ہے یعنی اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ (24:37) وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں افراد معاشرہ قوانین خداوندی کا اتباع کیے چلے جاتے ہیں اور اس نظام کے قیام کا مقصد عالمگیر ربوبیت انسانیہ ہے یعنی تمام نوعِ انسانی کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا ہے۔

قرآن حکیم کے چراغ کی روشنی میں نظام کے قیام کا ماحصل

یہ وہ لوگ ہیں جو اس نظام کو قائم کرتے ہیں اور یہ اس چراغ کی روشنی میں قائم کیا جاتا ہے۔ اسی کو اسلامی نظام کہتے ہیں۔ جہاں یہ نظام قائم ہوتا ہے اس کو اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ وہ اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر یہ نظام قائم نہ ہوا تو پھر يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ (24:37) اس قسم کا انقلاب آجائے گا، اس قسم کے فساد برپا ہو جائیں گے، جن میں دلوں کی حالت بدل جائے گی، نگاہیں دھندلا اٹھیں گی۔ اگر ایسا انتظام نہ کیا گیا، یہ نظام نہ قائم کیا گیا، تو یہاں تو پھر جنگل کا قانون ہوگا، ایک ایسا جھکڑ چلے گا، ایک ایسا انقلاب آئے گا جس میں کوئی چیز بھی اپنی اصلی حالت میں نہیں رہے گی۔ یہاں انقلاب کے معنی الٹ دینے والی چیز ہے۔ انقلاب کا یہ لفظ قلب سے ہے اور قلب کے معنی الٹ دینے والی چیز ہوتی ہے تو گویا یہاں پھر ایسا الٹ دینے والا ایک نظام آئے گا

جس کے اندر کوئی چیز بھی اپنی اصلی حالت پر نہیں رہے گی' وہ انقلاب نگاہیں بدل دے گا' دلوں کو الٹا کے رکھ دے گا۔ اس لیے وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ ہماری طرف سے اس نظامِ خداوندی کے قائم کرنے میں کوئی کوتاہی ہو اور وہ نظام قائم ہو جائے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ کوئی شے اپنی اصلی حالت پر نہ رہے۔ اس کے اندر ہر شے الٹ جائے۔ اس واسطے بھی وہ صبح شام ہر وقت کوشاں رہتے ہیں کہ یہ نظام قائم ہو جائے جو اس چراغ کی روشنی سے اس پورے خطہ زمین کو منور کر دے تاکہ یہ خطہ ارض اپنے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ یہ نور ہے یعنی وہ وحی خداوندی سے جس سے کرہ ارض کے جگمگا اٹھنے کا قرآن نے کہا ہے۔ آخر الامر یہ ہونا ہے۔ یہ نور یہی قرآن کا نور ہے۔ جب بھی قرآن کی حدود کے مطابق کوئی نظام قائم ہوگا' یہ کرہ ارض خدا کی ربوبیتِ عالمگیری سے جگمگا اٹھے گا۔ یہ اس کی نشانی ہوگی۔ یہاں کہا ہے کہ وہ دوسرے لوگ ڈرتے ہیں کہ کہیں اس قسم کا یہ نظام نہ قائم ہو جائے۔ وہ جن کے دلوں میں قوانین خداوندی کے چراغ کی روشنی ہے وہ صلوٰۃ کا اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں۔ اس صحیح نظام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ **لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ** (24:38) ہر شخص کو اس کے کاموں کا صحیح نتیجہ مل جاتا ہے' کوئی عمل رائیگاں اور بے نتیجہ نہیں رہتا۔ غلط اعمال کا تباہ کن نتیجہ اور اچھے اعمال کا احسن اور خوشگوار نتیجہ۔ اس کی رو سے' اچھے اعمال کے نتائج ایک ایک کے' سو سو [1] ہو کر ملتے ہیں۔ جو لوگ قانون خداوندی کے مطابق' اس طرح رزق حاصل کرنا چاہیں' انہیں خدا کا قانون' ان کے اندازوں سے کہیں بڑھ کر دیتا ہے۔ یہ قانون مکافاتِ عمل ہے جو انسانی زندگی میں اس نظام کی رو سے نافذ ہوتا ہے جو قرآن کی روشنی میں قائم کیا جاتا ہے۔

قرآنی معاشرے میں اعمال کا ثمر بغیر حساب ملتا ہے

اگر اس نظام کے برعکس باطل کا نظام ہو تو پھر یہ ہوتا ہی نہیں ہے کہ صحیح صحیح نتائج میسر آئیں۔ اس میں تو ہوتا یہ ہے کہ کھیتی کوئی بوتا ہے اور فصل کوئی کاٹ کے لے جاتا ہے' بھیڑ کسی کی ہوتی ہے اور اسے مونڈھ کے کوئی اور ہی لے جاتا ہے۔ [2] وہ کہتے یہ ہیں کہ وہ اس لیے اس نظام کو قائم کرتے ہیں کہ اگر یہ نظام قائم نہ ہوا تو پھر سلب ونہب اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو جائے گا' کسی کو اس کے کام کا صحیح نتیجہ نہیں مل سکے گا اور اگر نظام' قرآن کی روشنی میں' قائم ہوگا تو ہر ایک کو اس کے اعمال کا' اس کے کاموں کا' صحیح صحیح نتیجہ ملے گا بلکہ اگلی بات یہ ہے کہ یہ اس سے بھی زیادہ ملے گا اور بغیر حساب ملے گا۔ جہاں بغیر حساب کہا گیا ہے' اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بالکل اندھا دھند ملے گا۔ بغیر حساب کے معنی ہوتا ہے ''جو تمہارے حساب کی رو سے ہے اس سے زیادہ ملے گا' تم جو اپنے ہاں کچھ حساب کرتے ہو وہ جو اس کے ہاں سے اس

---

[1] فی کل سنبلةٍ مِّائة حبة (2:261)۔

[2] عربی میں ''جرم'' کے یہی معنی ہیں۔

نظام سے ملتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ملتا ہے اور اس کی یہ بات قرآن نے دوسری جگہ کہی ہے۔ قرآن نے اس نظام میں عدل اور احسان کو فرض قرار دیا ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَ الۡاِحۡسَانِ ❶ (16:90)۔ عدل تو یہ ہوتا ہے کہ کسی کی محنت کا پورا پورا معاوضہ اس کو دیدیا جائے۔ یہاں تک تو عام طور پہ مانتے ہیں کہ ہاں ایسا تو ہونا چاہیے لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ اگر کسی کی محنت کا جو پورا پورا معاوضہ دیا جا رہا ہے' اس سے اس کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو غلط نظام میں یعنی غیر قرآنی نظام میں پھر یہ کسی کا Concern (وجہ پریشانی) نہیں ہوتا۔ وہاں تو یہ ہوتا ہے کہ وہ جانے' اس کی ضروریات جانیں' جو بھی آپ نے مزدور سے طے کیا ہے اسے اگر شام کو اس کی دیہاڑی اس کے مطابق آپ دے دیتے ہیں تو عدل کا تقاضا پورا ہو گیا لیکن یہ کہ جو اسے ملا ہے' اس سے اس کے بچوں کا پیٹ بھی پالا جا سکے گا یا نہیں؟ یہ آپ کا Concern (وجہ پریشانی) نہیں ہے' یہ کسی کا بھی Concern نہیں ہے۔ یہ اس کی اپنی مصیبت ہے۔ وہ اس معاملے میں یتیم ہے' وہ تنہا ہے۔ اس کے لیے قرآن نے ''احسان'' کا کہا ہے۔ احسان کے معنی ہوتے ہیں ''جو کمی کسی میں رہ جائے' اس کمی کو پورا کر کے' توازن برقرار رکھنا''۔ اب یہ جو ساتھ مل رہا ہے' یہاں جو قرآن نے کہا ہے وہ یہ ہے کہ لِیَجۡزِیَهُمُ اللّٰہُ اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا وَ یَزِیۡدَهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ؕ وَ اللّٰہُ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ❷ (24:38)۔

نظامِ سماوی کا نتیجہ

بات عدل اور احسان کی چلی آ رہی تھی۔ اس میں کہا یہ جا رہا تھا کہ حساب کی رو سے تو ٹھیک تھا' تم نے اس کی جو اجرت مقرر کی تھی وہ دیدی' وہ بھی اس سے مطمئن ہو گیا کیونکہ عدل کا یہ تقاضا تو پورا ہو گیا لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ عدل کا ہی تقاضا پورا ہو۔ سوال یہ بھی ہے کہ اگر اس میں اس کی کمی رہ جاتی ہے تو وہ کمی بھی پوری ہونی چاہیے۔ یہ قرآنی نظام وہ کمی پوری کرتا ہے اور وہ یہاں ہے' جو کہا گیا ہے کہ وہ بغیر حساب دیتا ہے یعنی تمہارے حساب سے زیادہ دیتا ہے۔ یہ احسان ہو گیا۔ قرآن کے نظام میں عدل اور اس کے ساتھ احسان دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے گھروں میں یہ چراغ جلتا ہے۔ اس سے ان گھروں کی عظمتیں اور بلندیاں عروج پہ پہنچ جاتی ہیں۔ کاروبارِ حیات ان کو اس قانون کی طرف سے غافل نہیں ہونے دیتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جانتے ہیں کہ اگر اس کے مطابق نظام قائم نہ ہوا تو دھاندلی مچ جائے گی' سلب و نہب ہوگا' استحصال ہوگا' Exploitation ہوگی' لوٹ کھسوٹ ہوگی۔ اس لیے وہ اس کے

---

❶ اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے

❷ (یہ انقلاب خدا کے اس قانون مکافات کی رو سے رونما ہوتا ہے جس کے مطابق ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہو کر سامنے آ جاتا ہے' غلط اعمال کا تباہ کن نتیجہ) اور اچھے اعمال کا حسین اور خوشگوار نتیجہ' اس کی رو سے نتائج ایک ایک کے سو سو ملتے ہیں 2:61)۔ جو لوگ قانونِ خداوندی کے مطابق' اس طرح رزق حاصل کرنا چاہیں' انہیں خدا کا قانون' ان کے اندازوں سے کہیں بڑھ کر دیتا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔805)

مطابق کوشش کرتے ہیں کہ یہ قرآنی نظام قائم ہو جائے تا کہ ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا بدلہ ملے اور اگر اس سے اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی، کوئی کمی رہ جاتی ہے تو پھر اس کے حساب سے اس کو زیادہ دیا جائے۔ یہ ہے جسے اس نے احسان کہا ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اس چراغ کی روشنی میں نظام قائم کرتے ہیں اور یہ ہے وہ جو نظامِ خداوندی قائم ہوتا ہے۔

پہلے دور کی ملوکیت کا نظام ہی آج کا جمہوری نظام ہے

عزیزان من! اب اس کے برعکس دوسرے لوگ بتائے کہ **وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا** (24:39) جو اس نظام سے انکار کرتے ہیں یعنی جو سیکولر (Secular) نظام اپنے ذہن میں رکھتے ہیں، ان کے بارے میں بتایا ہے۔ یاد رکھیے! یہ جو کفر کی اصطلاح ہے آج کی اصطلاح میں اس کا ترجمہ ہی سیکولرازم (Secularism) ہونا چاہیے۔ سیکولرازم کے معنی ہوتے ہیں کہ وحی یا اس کی اقدار یا اس کی رو سے قائم کردہ حدود کوئی نہیں ہیں، انسانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ خود اپنے لیے ایک نظام قائم کر لیں، خود قوانین وضع کر لیں، خود ہی ان قوانین کو نافذ کر دیں، اس کے اوپر کوئی حد بندی نہ ہو، کوئی کنٹرول نہ ہو، Final Authority (آخری سند) یہی لوگ ہوں۔ پھر وہ آج کا جمہوی نظام ہو یا پہلے دور کی ملوکیت، قدر مشترک ان میں یہی ہوتی ہے کیونکہ اس میں ایک انسان کا فیصلہ ہو یا انسانوں کا ایک گروہ ہو، منتخب افراد ہوں Elected Members ہوں، پارلیمنٹ ہو، یہاں انسانوں کے فیصلے کے اوپر کوئی اور کنٹرول نہیں ہوتا، وہ فائنل اتھارٹی ہوتے ہیں، انہی کو Sovereignty (حاکمیت) حاصل ہوتی ہے، اقتدارِ مطلق حاصل ہوتا ہے۔ یہ اسے سیکولر نظام کہتے ہیں۔ یہ کفر ہے۔

اسلام کیا ہے؟

قرآنی نظام یہ ہے کہ اس میں معاملات امت کے باہمی مشاورت سے طے پاتے ہیں لیکن ان کی مشاورت قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہوتی ہے۔ بس یہ ہے فرق۔ اسے آپ Controlled Democracy کہہ سکتے ہیں یعنی وہ مشاورت جو قرآن کے غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے کی جائے۔ یہ ایمان ہے، یہ اسلام ہے۔ اور اگر یہ کنٹرول، یہ لائن اور یہ حدود اٹھا دی جائیں تو یہ سیکولرازم ہے۔ یہ اس زمانے کی اصطلاح میں کفر ہے۔ آج سیکولرازم (Secularism) اور کفر مرادف ہیں۔ اس میں کیا ہوتا ہے؟ عجیب چیز ہے، عزیزان من! سامنے عجیب آیت آ رہی ہے۔ کہا کہ **وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً** (24:39) جو اس سے انکار کرتے ہیں، ان کے اعمال، ان کے کام کی مثال، ایک سراب کی طرح ہے جیسے کوئی پیاسا، چٹیل میدان میں، سراب کو پانی سمجھ کر اس کی طرف لپکے۔ سراب یعنی Mirage [1] کو تو آپ سمجھتے ہیں۔ یہاں تو وہ سراب (Mirage) کبھی نظر نہیں

---

[1] Mirage is an optical phenomenon in which an image, often inverted is produced as a result of refraction of light by layers with differing densities. The commonest form involves an image of the sky, producing illusion of water.

آتے۔ ہم لوگوں کو صحرا میں' لق ودق میدان میں' چٹیل میدان میں' خاص طور پر صحراؤں کے اندر' دور سے سورج کی چمک سے' وہی پوری ریت پانی کی جھیل بن کر دکھائی دیتی ہے۔ وہ پانی نظر آتا ہے۔ معلوم نہیں یہاں کبھی آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں۔ میں نے کئی دفعہ یہ دیکھا' یہ تارکول کی سڑکیں ہیں۔ گرمی میں یہ تارکول ذرا پگھل جاتا ہے' سڑک سیدھی ہو' دور سے دیکھا جائے' سورج چمک رہا ہو تو سڑک پر پانی نظر آتا ہے۔ وہ چھوٹے سے پیمانے پہ ہوتا ہے لیکن صحراؤں کے اندر' صحرا تو تاحد نگاہ صحرا ہی ہوتا ہے' اس کے سامنے حد بندی ہی نہیں ہوتی' اس میں جو بالکل ہموار ریت کے اوپر سورج چمکتا ہے۔ تو اس سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ وہاں بالکل جھیل کی طرح' سمندر کی طرح' پانی نظر آتا ہے۔ اسے سراب (Mirage) کہتے ہیں۔ ظمأن پیاس کی شدت کو کہتے ہیں۔ یہاں ہم آپ پانی کی قدر پہچان ہی نہیں سکتے۔ اس کا صحرا نوردوں سے پوچھیے۔ پانی حیات کی' زندگی کی بنیاد ہے۔ صحرا میں ہوں' راستہ بھولے ہوئے ہوں' اور پانی ختم ہو جائے' صحرا میں پانی کہیں نہیں ملتا' تو انسان پیاس کی شدت سے تڑپ اٹھتا ہے اب یہ چیز سامنے رکھیے۔ پیاس کی شدت' پانی کی تلاش' دور سے یہ چمکتی ہوئی ریت کا سراب نظر آتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ پیاسا بھاگ کے' لپک کے' اسے پانی سمجھ کر' اس کی طرف جاتا ہے۔

سراب (Mirage) کا یہ نتیجہ مکافاتِ عمل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے

عزیزان من! پہلے میں ان الفاظ کو آپ کے سامنے لاتا ہوں اور پھر عرض کرونگا کہ قرآن بات کیا کہہ گیا ہے۔ کہا کہ **حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ** (24:39) لپک کر جاتا ہے' وہاں جا کر دیکھتا ہے تو اسے کچھ نہیں ملتا۔ یعنی جس چیز کی تلاش میں تھا وہ وہاں نہیں ہوتی۔ وہاں ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ سراب (Mirage) کا یہ نتیجہ' خدا کے قانون مکافات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ سراب کو پانی سمجھنے والوں کی جتنی کوششیں ہوتی ہیں' وہ رائیگاں چلی جاتی ہیں' ان کی ساری دوڑ دھوپ رائیگاں گئی۔ اس لیے کہ انہوں نے سراب (Mirage) کو پانی سمجھ لیا۔ اور یہاں سے ایک بڑی چیز سامنے آئی۔ میں اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ غور طلب ہوتا ہے' یہ شاعری نہیں ہے کہ وہ برائے وزنِ بیت ایک لفظ کا اضافہ کر لیتے ہیں کہ صاحب! وزن ٹوٹ جاتا ہے اور اس لیے ایک لفظ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے' بات کوئی نہیں ہے' ضرورت شعری کے لیے وہ لفظ دیتا ہے۔ قرآن تو یہ شاعری نہیں ہے۔ سراب (Mirage) کہہ دینے سے بات پوری ہو جاتی ہے۔ سراب (Mirage) کو پانی سمجھتا ہے' لپک کر' اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہے۔ یہاں لفظ ہے ''بقیعۃ'': چٹیل میدان کہ جہاں کوئی سرسبزی نہیں' کچھ نہیں۔ اسے اس میں سراب (Mirage) نظر آتا ہے اور وہ اسے پانی سمجھتا ہے۔ قرآن کے ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہو جانا پڑتا ہے۔

عزیزان من! بات یہ ہوئی کہ سراب (Mirage) کہنے سے تو بات پوری ہو جاتی ہے: وہ سراب ہے' پانی سمجھتا ہے' اس کی طرف لپکتا ہے' بیچ میں یہ جو ساتھ کہہ دیا کہ وہاں بالکل چٹیل میدان ہے' اسے سراب نظر آتا ہے۔ ذرا سی فکر سے' عقل سے' Reason

(استدلال) سے' کام لے' تو ذہن میں یہ بات فوراً آ جاتی ہے کہ جہاں پانی ہو' وہاں کوئی تو سرسبزی کا نشان ہو جانا چاہیے' درخت ہونے چاہئیں' کوئی پودے ہونے چاہئیں' کوئی گھاس ہونی چاہیے' لیکن وہ ایسا میدان چٹیل ہے جہاں کوئی سرسبزی (Greenery) کا نشان تک نہیں ہے۔ کہا کہ اگر ذرا غور و فکر سے کام لو تو ذہن میں آ جائے کہ یہ پانی نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر پانی ہوگا تو وہاں یقیناً کوئی نہ کوئی سرسبزی ہوگی۔ وہ تو میدانِ چٹیل ہے' کہیں سبزی کا نشان تک نہیں ہے تو اتنی بڑی پانی کی جھیل وہاں کیسے ہو سکتی ہے؟ کہا کہ یہ اس کے باوجود کھڑے ہو کر اتنی سی بات بھی کیوں نہیں سوچتا۔

آیات اللہ کا مفہوم

میں یہ عرض کروں کہ قرآن جسے آیات کہتا ہے یا آیات اللہ کہتا ہے' وہ کوئی محسوس شے ہوتی ہے جو کسی حقیقت کی علامت بنے جیسے سبزی' درخت' پودے' ہریالی (Greenery) اس کی علامت بنتی ہے کہ یہاں پانی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ آیات اللہ کے اوپر غور بڑا ضروری ہے۔ اگر یہ شخص فکر سے کام لیتا تو کبھی سراب (Mirage) کو پانی نہ سمجھتا' اس کے فریب میں نہ آتا۔ وہیں وہ سوچ لیتا کہ یہاں ہریالی کا کام نہیں' یہ پانی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کے باوجود یہ اس کو کیوں پانی سمجھتا ہے یعنی جو پیاس کی شدت ہے' وہ اسے یہ سمجھنے ہی نہیں دیتی۔ کیا بات ہے! پیاس کی شدت نے اس کی فکری صلاحیتوں کو ماؤف کر دیا ہے۔ یہ بات' جو بڑی بدیہی سی تھی' وہ اتنی سی بات کو بھی نہیں دیکھتا' نہیں سوچتا۔ اس لیے کہ ظمان' پیاس کی شدت ہے' کچھ سوچنے ہی نہیں دیتی۔

جذبات کی شدت عقلی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیتی ہے

عزیزانِ من! یہاں بات بڑی اہم آ گئی۔ انسان فریب کھاتا ہی اس وقت ہے جب جذبات کی شدت' عقل و فکر کی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ سراب (Mirage) کے ساتھ بقیعۃ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے بات کہاں جا پہنچی! بات ایک مثال کی' صرف سراب' کی نہیں رہی' پیاسے کی نہیں رہی۔ قرآن نے ایک عظم اصول دنیا میں دیدیا کہ ''انسان فریب وہاں کھاتا ہے جہاں جذبات کی شدت' فکر کی قوتوں پہ غالب آ گئی ہوتی ہے۔'' یہاں مثال پیاس کی شدت کی تھی۔ اس کا تجربہ ہر شخص کو ہو سکتا ہے۔ واقعی یہ بات ہے کہ اگر پیاس کی شدت اتنی تیز ہو پھر آدمی کھڑا ہو کر نہیں سوچتا کہ ذرا سوچوں تو سہی کہ کیا یہ پانی ہو بھی سکتا ہے' کہیں کوئی پرندہ نظر نہیں آتا' کہیں کوئی درخت نظر نہیں آتا' یہی تو پانی کی علامات ہوتی ہیں۔ یہ علامات تو ہیں نہیں' تو پانی کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پیاس کی شدت اسے کھڑا ہو کر یہ کچھ سوچنے کی گنجائش ہی نہیں دیتی۔ بات اس نے یہ کہی کہ یہ جذبات کی شدت ہے جو عقل اور فکر کی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیتی ہے اور اسی کو قرآن سراب کہتا ہے۔ دنیا میں سارے فریب انسان اسی سے کھاتا ہے۔ یہ جو جان بوجھ کر کوئی باتیں ڈالتے

ہیں۔ ❶ استحصال کرتے ہیں' انہیں چھوڑ دیجیے۔ جو فریب خوردہ دل ہوتے ہیں ان کی طرف آیئے۔ آدمی فریب کس وقت کھاتا ہے؟ ایک شعر کہا گیا ہے جو اتنا گہرا اور اتنا بلیغ ہے کہ واقعی ذہن میں آتا ہے کہ اگر شاعری کی بھی اتنی بلندی ہو تو کیا بتاؤں کہ ایک شعر کے انداز میں شاعر کیا کچھ کہہ جاتا ہے۔ یہ شعر ذرا مشکل سا ہے اور ہے بھی فارسی میں۔ کہتا ہے۔

زنقش تشنہ لبی داں بہ عقل خویش مناز
دل فریب گر از جلوہ فراز نہ خورد

اگر تو نے سراب کو پانی نہیں سمجھا ہے تو یہ نہ سمجھ کہ یہ میری عقل کی کاریگری ہے کہ میں فریب میں نہیں آیا۔ اصل بات یہ ہے کہ میری پیاس کی شدت اتنی نہیں تھی' نقش تشنہ لبی داں: یہ پیاس کی شدت کی کمی تھی۔ بہ عقل خویش مناز: یہ نہ سمجھ کہ میری عقل کی کاریگری تھی۔ دل فریب گر از جلوہ فراز نہ خورد: تیرے دل نے اگر سراب کو پانی نہیں سمجھا تو اسے یہ نہ کہہ کہ میری عقل بڑی تیز ہے۔ اصل میں بات یہ تھی کہ پیاس کی شدت نہیں تھی۔ یہاں جو جذبات کی شدت ہے' آدمی فریب کھاتا ہی وہیں ہے۔ جذبات کی شدت سے فریب کھاتا ہے۔

کسے معلوم تھا عشق اس قدر لاچار کرتا ہے
دل اس کو جانتا ہے بیوفا اور پیار کرتا ہے

آدمی فریب کھاتا ہے۔

کچھ تو نے دیئے فریب ہم کو
کچھ ہم نے بھی خود فریب کھائے

اس مقام پر دوسروں کا فریب تو خیر فریب ہوتا ہی ہے' آدمی خود بھی فریب کھاتا ہے۔

یہ جانتا ہوں کہ خاک آشیاں نہیں ہوتی
مگر جلے ہوئے تنکوں کو چن رہا ہوں میں

آپ دیکھیں گے کہ ان میں جذبات کی شدت ہے۔ ساری آشیاں سازی' وہ آرزو' وہ تمنا' وہ جذبہ' اتنا شدید ہے کہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ جانتا ہوں کہ خاک آشیاں نہیں ہوتی مگر یہ جو جاننا ہے' یہ اس کے مطابق کام نہیں کر رہا۔ جو آشیاں سازی کی شدت ہے وہ اس قسم کی سعی لاحاصل کے اوپر بھی آمادہ کر رہی ہے۔ اس لیے وہ کہہ رہا ہے کہ یہ جانتا ہوں کہ خاک آشیاں نہیں ہوتی مگر جلے ہوئے تنکوں کو چن رہا ہوں میں۔ کیفیت یہ ہوتی ہے۔ جب آدمی فریب کھاتا ہے تو جو باتیں دوسرے لوگوں کو عام طور پر نظر آتی ہیں' جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تو

---

❶ اسے تصوف میں Suggestion دینا اور نفسیات کی زبان میں Suggest کرنا کہتے ہیں۔

پاگل ہو گیا ہے اونوں تے اے وی نظر نہیں آؤندیاں۔ جے توں وی اوی حالت اچ ہوندا تے تینوں وی نظر نہ اوندا۔ [1] بہ عقل خویش من از'' یعنی یہ جناب کی عقل کی کاریگری نہیں ہے۔ بہ نقش تشنہ لبی داں یعنی آپ کی پیاس اتنی تیز نہیں تھی جتنی میری پیاس تیز ہے۔ اس لیے انسان اس طرح سے فریب کھاتا چلا جاتا ہے۔ کیسے فریب کھاتا چلا جاتا ہے:

نظر نیچی کیے وہ سوچتا تھا جوہر تازہ
میں سمجھا تھا جفاؤں پر پشیماں ہوتا جاتا ہے

یہ خود فریبی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آدمی الٹ کیوں سمجھتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خود فریبی جذبات کی شدت سے پیدا ہوتی ہے اور اس شدت میں ایک لذت ہوتی ہے۔ اس طرح جذبات کی شدت عقلی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیتی ہے۔

مذہب کسی مقام پر بھی نہیں مگر دین قدم قدم پر غور کرنا سکھاتا ہے

عزیزان من! اب ہم اصل مقام پر آ گئے۔ دین میں ہر چیز کنکریٹ (Concrete) یعنی ٹھوس نتائج سے سامنے آتی ہے جیسے لیبارٹری کے اندر دو اور دو چار ہوتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ سائنٹفک فارمولا ہو' اس کے مطابق یہ چیزیں ملائیں۔ اس طرح سے یہ کیا' اس کے بعد یہ نتیجہ نکلے گا۔ اس میں آدمی فریب نہیں کھا سکتا' نتیجہ نکلا ہے: فارمولا صحیح تھا' میرا پروسیس بالکل ٹھیک تھا۔ نتیجہ نکل آیا ہے۔ اگر نتیجہ نہیں نکلا تو کھڑے ہو کر سوچے گا کہ کہیں فرق ہے: اس میں فارمولا غلط ہے یا میرا پروسیس کچھ غلط تھا' کہیں بھی غلطی ہے۔ نتیجہ نہیں نکلا تو پھر کوشش کرے گا۔ یہ دین ہے لیکن مذہب میں یہ چیز نہیں ہوتی۔ وہاں خود فریبی ہوتی ہے۔ جو ہزار دانے کی تسبیح ہے' یہ پھیرتے جاؤ' یہ لفظ گنتے جاؤ' جنت مل جائے گی۔ وہ کبھی بھی کھڑا ہو کر نہیں سوچتا کہ ایک لفظ کو ہزار دفعہ گننے سے جنت کیسے مل جائے گی؟ وہ اس خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے' رہنا چاہتا ہے۔ وہ ہزار دانے ختم کرنے کے بعد لیبارٹری والی ٹیسٹ ٹیوب تو اس کے سامنے نہیں ہوتی کہ وہ دیکھ سکے کہ وہ نتیجہ نہیں نکلا' پھر کچھ کرنا پڑے گا۔ ایک سائنٹسٹ کو عمر بھر پتہ نہیں کتنی دفعہ تجربے دہرانے پڑتے ہیں' کتنی مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں' کتنی خاراشگافیاں کرنا پڑتی ہیں' جب کہیں جوئے شیر آتی ہے لیکن خود فریبی کی کیفیت ہو تو جونہی تسبیح کے دانے پورے ہوئے' اطمینان ہو گیا کہ صاحب! جنت مل گئی۔ یہ سراب (Mirage) کو پانی سمجھنے کی بات ہے' یہ جذبات کی شدت ہے جو ایک تسبیح کے دانے کے بعد سمجھ لیتا ہے کہ جنت مل گئی ہے۔

---

[1] اسے تو وہ بھی نظر نہیں آتیں۔ اگر تم بھی اسی حالت میں ہوتے تو وہ تمہیں بھی نظر نہ آتیں۔

ہم نے سراب کو پانی سمجھا ہوا ہے

عقیدت مندی اسے کہتے ہیں' اعتقاد کی شدت اسے کہتے ہیں۔ اس میں فکر آتی ہی نہیں ہے۔ فکری طور پر اس سے پوچھیے کہ صاحب! یہ کیوں اور کیسے ہوتا ہے؟ دونوں میں ربط کیا ہے؟ ایک لفظ ہزار دفعہ دہرانے سے وہ مل جاتا ہے تو کیا اس میں کوئی ربط ہے؟ کہا جاتا ہے کہ جی! یہ ربط کی بات نہیں ہے' یہ ایمان کی بات ہے۔ اصل میں' میاں! تم میں یہ چیز ہے نہیں' تم اس کو کیا جانو' ایمان پختہ ہونا چاہیے۔ یعنی اس کے معنی ہیں کہ جذبات کی شدت ہونی چاہیے۔ روز اس افیون میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ وعظوں سے' نصیحتوں سے' مسجد سے' روز ان جذبات میں شدت پیدا کی جاتی ہے کہ آدمی کہیں سوچنے کی طرف نہ آجائے۔ میں نے کہا ہے کہ اس میں بڑی لذت ہوتی ہے' آدمی چھوڑنا نہیں چاہتا' یہ میرا تجربہ ہے۔ میں چالیس سال سے یہ چیز پیش کرتا چلا آرہا ہوں کہ جسے دین کہتے ہیں وہ لیبارٹری کی ٹیسٹ ٹیوبیں (Test Tubes) ہیں' فارمولا ہے' یہ اس کا پروسیس ہے' یہ چیزیں اکٹھی کرو' اس پروسیس (عمل) سے یہ کچھ کرو' تو یہ نتیجہ نکلے گا۔

جنت کا حصول اتنا آسان نہیں: یہ سعی بے حاصل کی لذت ہے

اب یہ چیز بڑی مشقت طلب ہے' محنت چاہتی ہے۔ اس سے پہلے یہ کہنا ضروری ہے کہ میاں! جو طریقے تم نے اختیار کر رکھے ہیں کہ ایک لفظ ہزار دفعہ گن لینے سے یہ جنت ملتی ہے' یہ چیز غلط ہے' اس سے نہیں ملتی۔ دین اللہ تو یہ کہتا ہے کہ جب تک جنگ کی آماجگاہوں میں جا کر سر نہ دیدو' جان نہ دیدو' جنت نہیں ملتی۔ یہ سو دفعہ لفظ گننے سے کیسے جنت مل جائے گی۔ میں نے دیکھا کہ جو مذہب پرست طبقے کے اندر بڑے ہوئے' ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب میں نے یہ چیزیں کچھ دنوں کے لیے سنائیں تو انہوں نے آنا بند کر دیا۔ میں نے کہا کہ کیوں' آئے کیوں نہیں؟ کہنے لگے: نہیں بابا توبہ! وہ جو جنت ہمیں حاصل تھی' تم نے تو وہ بھی ہم سے چھین لی اور جو جنت تم بتا رہے ہو' وہ تو نہ نو من تیل ہو' نہ رادھا ناچے۔ یہ تو بڑی مشقت طلب ہے جو تم بتا رہے ہو۔ وہ بالکل ٹھیک ہے صاحب! خدا کے لیے ہمیں نہ چھیڑیئے ہم قطعاً نہیں آئیں گے' ہمیں اپنے اس نشے کے اندر ہی مست رہنے دیجیے۔ یہ جو لذت' آرام طلبی کی لذت ہے یہ بڑی لذت ہے۔ کس انداز سے [1] وہ کہہ گیا ہے کہ بس ہجوم ناامیدی! بس' زیادہ نہیں' بس!

بس ہجومِ نا امیدی' خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت' ہماری سعی بے حاصل میں ہے

---

[1] مرزا اسداللہ خاں غالب (1797-1869ء)

''سعی بے حاصل کی لذت''! کیا انداز ہے کہنے کا کہ بس ہجوم ناامیدی! آپ دیکھتے ہیں کہ کتنے زور کا ہے یہ بس! وہ کہتے ہیں کہ پرویز صاحب! آگے نہ بتائیے' قرآن کی کچھ اور آیت نہ پڑھ دیجیے' خدا کے لیے نہ پڑھ دیجیے' وہ جو اتنی آسانی سے ہمیں جنت حاصل ہوئی تھی' تم تو اسے چھین کے لیے چلے جا رہے ہو۔

عزیزان من! یہ ہے' وہ سراب (Mirage) کو پانی سمجھنے والا۔ اب آپ سمجھے کہ قرآن نے بقیعة سراب کے ساتھ کیوں کہا۔ یہاں نظر آ رہا ہے کہ اگر وہ عقل وفکر سے ذرا کام لے تو دیکھے گا کہ اگر پانی ہے تو کوئی نہ کوئی تو ہریاول (Greenery) وہاں ہونی چاہیے۔ کہتا ہے کہ اگر یہ سچ ہے تو پھر تو انسان فریب کھا ہی نہیں سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ اس ہریالی (Greenery) کے بغیر وہ دوڑا ہوا اس کی طرف اس لیے جاتا ہے کہ وہ جو اس کی پیاس کی شدت ہے' اس میں شدتِ جذبات کی ایک بدیہی[1] سی بات ہے جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور یہ اس میں اس لیے مست رہتا ہے کہ اس سعی بے حاصل میں ایک لذت ہوتی ہے۔ بس بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے'[2] نہ کچھ کرنا پڑے' نہ کرانا پڑے اور مفت میں یہ جنت ہاتھ آئی ہوئی ہو۔ یہ اک لذت' ہماری سعی بے حاصل میں ہے' اس لیے بس ہجوم ناامیدی! یہ خاک میں مل جائے گی۔

مذہب سعی بے حاصل کی لذت کا نام ہے

عزیزان من! سعی بے حاصل میں ایک لذت ہوتی ہے۔ مذہب اسی سعی بے حاصل کی لذت کا نام ہے۔ اس افیون کا چھڑانا آسان نہیں ہے۔ آپ قرآن کے دین کو سامنے لانے کی کوشش کریں تو وہ کہے گا کہ بس! خاک میں مل جائے گی یہ جو اک لذت' ہماری سعی بے حاصل میں ہے۔ قرآن اس سے یہاں لاتا ہے پھر آہستہ آہستہ' یہی چیز اگر صدیوں تک متواتر مسلسل چلی آئے تو ایک اسے تواتر کی سند مل جاتی ہے۔ ہر وہ چیز جو پرانی ہو جائے وہ ہمارے ہاں اسلاف کا مسلک بن جاتی ہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ جو موجودہ دور کے مثلاً یہ آج کے بزرگ یا علمائے کرام ہیں' ان پر تو ہر ایک تنقید کرتا ہے' روز ان کے ہاں جوتیوں میں دال بٹتی ہے' ایک دوسرے کے ساتھ مناظرے مباحثے کفر کے فتوے' یہ سب کچھ ہوتے ہیں۔ جب یہ مر جاتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک علیہ الرحمہ ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اسلاف میں شامل ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کی ہڈیاں جتنی پرانی ہو جاتی ہیں' یہ اتنے ہی زیادہ مقدس ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کسی بزرگ کے متعلق یہ کہہ دیجیے کہ ابھی دس بیس برس ہوئے کہ ان کا انتقال ہوا' ذہن پہ ان کا تقدس اتنا نہیں آتا۔ یہ کہیے کہ صاحب! یہ بارہ

---

[1] وہ بات جس میں دلیل کی حاجت نہ ہو۔

[2] جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت' کہ رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے (غالب)

سو سال پہلے کے بزرگ ہیں تو ان کا تقدس بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح پرانا گڑ تریاق بن جاتا ہے۔ وہ جو سعی بے حاصل کی لذت ہے' وہ پختہ سے پختہ تر ہوتی جاتی ہے۔ وہ جو ابلیس کی مجلس شوریٰ کا آخری شعر اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے' اس میں ابلیس کا پروگرام ہے' جس کی تلقین وہ اپنے شتونگڑوں [1] کو کرتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اس امت پر

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں [2]

لہٰذا اس کے لیے یہ کرو کہ

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

انہیں سعی بے حاصل کی لذت سے نکلنے ہی نہ دے۔ جب انسان کے اندر یہ چیز پختگی حاصل کر لیتی ہے تو پھر یہ نگاہ کا زاویہ بدل دیتی ہے' پھر ہر شے ان کو اسی طرح نظر آتی ہے جیسی یہ پہلے اپنی فریب خوردگی کی حالت میں اس کو دیکھتے ہیں۔ ایک رنگین شیشہ عینک آنکھوں کے اوپر آجاتا ہے تو پھر باہر کی ہر چیز اسے اسی رنگ میں رنگین نظر آتی ہے۔ ہر چیز کی قیمت اندازِ نگاہ کے مطابق ہوتی ہے جس زاویہ نظر سے کسی چیز کو آپ دیکھیں گے وہی اس کی قیمت ہو جائے گی۔ اگر یہ دنیا' زاویہ نگاہ بدل لے تو پھر باہر کی دنیا بدل جائے گی۔

نہ کلی ہے وجہِ نظر کشی' نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی' سببِ نشاط بہار ہے

یہ زاویہ نگاہ کا بدل جانا ہے۔ آخر اتنے مایوسی کے شعر کیوں آئیں؟ کیوں نہ کوئی خوبصورت سا شعر آئے؟ لیجیے' اختر شیرانی کا ایک شعر ہے:

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں میں' حسین معلوم ہوتی ہے

یہ ساری زاویہ نگاہ کی تبدیلی ہے۔

---

[1] مشیروں

[2] عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف۔ ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں۔ (اقبالؒ: ارمغان حجاز حصہ اردو)

قرآنی تعلیم انسان کے زاویہ نگاہ کو بدل دیتی ہے

عزیزان من! سعی بے مقصد میں جو لذت ملتی ہے اگر اس میں پختگی اور دوام حاصل ہو جاتا ہے تو نگاہ کا زاویہ ہی ایسا ہو جاتا ہے کہ ہر سراب (Mirage) اس کو چشمہ (Fountain) نظر آتا ہے اور اگر قرآن کی رو سے زاویہ نگاہ بنتا ہے تو ہر وہ سراب (Mirage) جو سامنے آتا ہے وہ اس کو پہلے کھڑے ہو کر سوچتا ہے کہ کیا اس کے قریب کوئی درخت ہے' کوئی پرندہ اڑ رہا ہے؟ اگر یہ کچھ نہیں ہے تو وہ وہیں کہہ دیتا ہے کہ یہ سراب ہے' پانی نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے زاویہ نگاہ کا بدلنا۔

دنیائے تصوف میں نفس کشی کی انتہا آرزو کا خاتمہ ہے: پرویز کی کہانی پرویز کی زبانی

قرآن کریم کیا کرتا ہے؟ وہ پیاس کی شدت کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں پھرتا' وہ جذبات کو فنا نہیں کرتا۔ جذبات تو فنا ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ ان کا راستہ متعین کرتا ہے۔ وہ نفس کشی جو ہمارے ہاں تصوف کی انتہا بتائی جاتی ہے' اس کے معنی ہوتے ہیں: ترکِ آرزو یعنی انسان کے اندر کوئی آرزو ہی پیدا نہ ہو۔ اندازہ لگائیے کہ کوئی آرزو ہی پیدا نہ ہو' یہ اس کی انتہا اور معراج تھی' جس زمانے میں' میں ان سے نکل آیا۔ مجھے تو معلوم ہے' ہم اندر رہے' سب کچھ کرتے رہے' میری تو وہ منطق عجیب قسم کی ہوتی تھی۔ انتہائی طور پہ یہ کہا گیا کہ مقصد یہی ہے کہ کوئی آرزو نہ رہے۔ میں نے کہا: پھر صاحب! یہ جو نفس کشی کی آرزو آپ کے دل میں ہے' وہ بھی نہ رہے تو پھر نفس کشی والی بات ہی ختم ہو گئی۔ کہنے لگے: تو مردود ہو گیا ہے' اس لیے اب اس طرف جا رہا ہے کیونکہ سوچنا شروع کر دیا کہ یہ بھی تو آرزو ہے' جبکہ مقصد فنا فی اللہ ہونا کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بھی تو آرزو ہے' اور جسے آپ ترکِ آرزو کہتے ہیں تو یہ تو ساری آرزوئیں ہیں' نگاہ کا زاویہ ہے:

وہ چاہتے تھے' نہ دیکھے کوئی ادا میری
چھپے جو مجھ سے' تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی؟

میں نے کہا ہے کہ یہ جو حصولِ جنت ہے یا حصولِ فنا فی اللہ ہے یا وصالِ حق ہے' کیا حضرت صاحب! یہ بذات خود آرزو نہیں ہے؟ لیکن وہاں تو فکر کے اعتبار سے کوئی سوال ہوتا تو جواب ملتا! بات تو ساری جذبات ہی کی ہے۔ جذبات کو فکر کی کسوٹی کے اوپر سامنے لائیے' کٹ کے رہ جاتی ہے' وہ ساری منطق لیکن قرآن جذبات کو فنا نہیں کرتا۔ جذبات کی رو سے تو سارا عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی کا دارومدار ہی جذبات پر ہوتا ہے۔ پھر وہ کرتا کیا ہے؟ یہی تو بات ہے۔ پھر وہ نہ عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتا ہے' نہ اسے فنا کرتا ہے۔ ان لوگوں کی عجیب حالت ہوتی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی: عقل کے دو پہلو

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (1058-1111AD) کی آدھی زندگی فلاسفر کی حیثیت سے گزری' جس میں عقل کی اہمیت' عقل کی رفعت' عقل

کی بلندی' المختصر ساری دنیا کے اوپر عقل ہی عقل نظر آتی ہے۔ زندگی کے آخری حصے میں آ کر کہا کہ عقل اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس کو کوئی اہمیت دی جائے۔ ارے' یہ کیا بات ہوئی؟ جن سے میں اعراض برتتا تھا' میں نے ان سے کہا کہ جی' امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (1058-1111AD) نے عقل کی رو سے ثابت کیا ہے کہ عقل قابل اعتماد شے نہیں ہے' تو اگر یہ قابلِ اعتماد نہیں تو عقل کی رو سے جو ثابت کیا ہے وہ کیسے قابلِ اعتماد ہو گیا؟ تو مردود ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ جی ہو ہی گیا ہوں۔

قرآن اور مقامِ عقل

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ نہ یہ جذبات کے پیچھے لٹھ لیے پھرتا ہے' نہ یہ عقل کے پیچھے۔ وہ مومن کی Definition (تعریف) یہ بتاتا ہے کہ **لِاُولِی الْاَلْبَابِ o الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (3:190-191) مومن' وہ صاحبانِ عقل وفکر ہیں' جو اٹھتے' بیٹھتے' لیٹتے' قوانین خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں اور ارض وسما کی تخلیق پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔ کیا بات ہے کہ عقل کا یہ مقام ہے اور **یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا** (3:191) وہ قوانینِ خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں' عقل سے کام لیتے ہیں' اسے وحی کی روشنی کے تابع رکھتے ہیں' جس کی وجہ سے پھر جذبات کا جو سراب ہے' وہ سراب انہیں نظر آتا ہے' پانی پانی نظر آتا ہے۔ یہ جذبات اور عقل کو آپس میں سمو دینا ہے۔ یہ ہے دین۔ قرآن عقل اور جذبات دونوں کو سمو دیتا ہے۔ پھر سن لیجیے۔ وہی نور السموت والارض (24:35) سے بات چلی ہوئی تھی۔ یہ جو چراغ ہے' وحی آسمانی چراغ ہے' یہ قرآن ہے۔ اس وحی (قرآن) کی روشنی میں عقل سے کام لیا جائے۔ اس کے برعکس وہ عقل جسے اقبالؒ نے عقل خود بیں کہا ہے جو وحی کی روشنی میں کام نہیں کرتی' بلکہ تنہا ہی کام کرتی ہے اور سیکولرازم کی ہی غلام ہے' اے کاش! یہ عقلِ جہاں بیں بن جائے۔ دراصل یہ عقل ہی وہ عقل ہوگی جو وحی کی روشنی میں کام کرے گی۔ لہٰذا اگر اس طرح حدودِ قرآنی کے اندر رہتے ہوئے' اس نورانی عقل سے کام لیا جائے اور اپنی بے مایہ عقل کو اور اپنے سرکش جذبات کو تعلیمِ قرآنی کے تابع رکھا جائے' تو پھر آپ دیکھیے گا کہ اس کے کیا نتائج نکلتے ہیں۔ اس وقت تو حالت یہ ہے کہ اگر مغرب کے سیکولرازم میں تنہا عقل ہے تو مشرق میں جذبات ہی جذبات پائے جاتے ہیں۔

حصولِ منزل کے لیے انسانی عقل کو قندیلِ سماوی کی ضرورت کیوں ہے؟

ان حقائق کے پیشِ نظر' مفکرِ قرآن' علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے کہ اے انسان! اٹھ اور وحی کی روشنی میں ایک نئی دنیا وجود میں لا اور اپنی اس عقل کی مٹی کو عشقِ قرآن کے پانی سے گوندھ اور پھر جو جی میں آئے اس سے کرتا چلا جا۔ جس وقت عقلِ انسان وحی کی روشنی میں دیکھتی ہے' تو وہ ہر شے کو اپنے اصلی رنگ میں پہچان سکتی ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بڑی مقدس دعا ہے کہ یا اللہ! مجھے ہر شے کی حقیقت سے آگاہ کر دے' سراب پانی نہ نظر آئے' جھوٹا نگ جھوٹا نگ نظر آئے' سچ سچ نظر آئے اور جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر انسان کبھی نہ کسی کو فریب دیتا ہے' نہ کسی سے فریب کھاتا ہے۔ پھر وہ دور سے اگر سراب پانی نظر آتا ہے تو وہ بقیعۃ دیکھتا ہے کہ

چٹیل میدان کے اندر پانی نہیں ہوسکتا۔

قرآن کی نظر میں لفظ سراب کے استعمال کی اہمیت

غور فرمایا کہ قرآن نے ایک لفظ یقیعة (24:39) کے ساتھ سراب کے لفظ کا کیوں اضافہ کیا ہے؟ سراب کے لفظ کا استعمال' میں نظر بظاہر کہونگا کہ زائد نظر آتا ہے۔ سراب کہہ دیا جائے تو پھر اس کے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب آپ نے سمجھا کہ اس لفظ کے ساتھ اسے کہنے کی ضرورت تھی۔ اسی ایک لفظ نے تو اس چیز کو' محض ایک سراب کی مثال نہیں' بلکہ ایک عالمگیر حسین حقیقت بنا دیا ہے۔ پیاس کی شدت اسے اتنا سوچنے کی مہلت نہیں دیتی۔ جذبات کی شدت میں اٹھ نہ کھڑے ہوا کرو۔ وہاں جاؤ گے تو وہ پانی کا چشمہ نہیں' وہ تو ریت کا تودہ نظر آئے گا۔ تمہیں وہاں کچھ نہیں ملے گا۔ ملے گا کیا؟ مکافاتِ عمل کا جو قانونِ خداوندی ہے' اس کی رو سے تم وہاں جا کر دیکھو گے کہ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ (2:217) ان کے اعمال ضائع چلے گئے۔

سب سے زیادہ نقصان میں رہنے والے کون ہیں؟

عزیزان من! سورۃ الکھف کی یہ آیت بڑی اہم ہے کہ قُلْ ھَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا (18:103) اے رسول! ان سے کہو کہ آؤ' تمہیں ہم بتائیں کہ سب سے زیادہ نقصان میں کون لوگ ہیں؟ ذہن میں یہ آئے گا کہ اس کے بعد یہ کہا جائے گا کہ جو کچھ نہیں کریں گے سب سے زیادہ نقصان میں رہیں گے۔ کہا کہ بات یہ نہیں ہے بلکہ یہ وہ ہیں جو بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا (103-18) بہت کچھ کریں گے اور سب سے زیادہ نقصان میں رہیں گے۔ وہ کون ہوں گے؟ ان کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (18:104) یہ وہ ہونگے جو وحی خداوندی کے بغیر' اسی سیکولرازم کے نظام کے تابع' اپنی ساری کوشش اسی میں کھو بیٹھے ہیں۔ وَ ھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (18:104) اور وہ اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ بڑے ہی کاریگری کے کام کر رہے ہیں حالانکہ وہ سب مصنوعی ہوتا ہے۔ یہاں لفظ ہے: صنعاً ان کے لیے یہ قرآن ہے' عزیزان من! کہا کہ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا [1] (18:104)۔ کس فریب میں مبتلا رہتے ہیں لیکن اپنے ذہن میں تصور کامیابی کا رکھتے ہیں جبکہ وہ بات تو ساری کی ساری تصنع اور مصنوعی ہوتی ہے اور اس کے باوجود یہ اسے بالکل حقیقی سمجھے ہوئے' برابر اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ وَ لِقَآئِہٖ [2] (18:105) یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی غلط روش سے کامیاب زندگی بسر کرلیں

---

[1] وہ بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنی کاریگری سے بنا رہے ہیں' وہ بہت اچھا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔683)

[2] یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین زندگی سے انکار کرتے اور سرکشی برتتے ہیں' اور اس کا یقین ہی نہیں رکھتے کہ انہیں اس کے قانون مکافات کا سامنا کرنا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔683)

گے۔ان کا یہ خیالِ خام ہے۔یہ جو ربھم والی آیت تھی کہ جہاں پانی ہوگا وہاں کچھ نہ کچھ سبزی اور درخت ہونا چاہیے' اس کے متعلق انہوں نے کچھ غور ہی نہ کیا' چنانچہ وَ لِقَآئِہٖ (18:105) اس طرح انہوں نے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے انکار کیا۔

حبطت کا قرآنی مفہوم اور میزان کھڑی کرنے کی ضرورت کا نہ ہونا

آخر الامر' اس غور نہ کرنے اور خدا کے قانون مکافاتِ عمل سے انکار کرنے کا' نتیجہ یہ ہوا کہ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (18:105) ان کے سارے کام' ان کی ساری کوششیں' رائیگاں گئیں۔یہ عرب حبطت کا لفظ عجیب مقام پہ بولتے تھے۔ہم لوگ جو' اب شہر والے ہیں' ہمیں تو پتہ نہیں کہ وہ باہر کے گوالے کیا کچھ گاگروں میں ڈال کر لے آتے ہیں۔او آن کے پہلے اوتھوں پوندے کچھ۔قصور دے لاگے جیہڑ یاں چرخڑ یاں لگیاں ہو یاں نیں' ملائی اوتھوں نکلی۔رستے اچ آئے' تے اوتھے پانی پایا' فیر آئے تے دوکاندارنوں دتا۔اونیں کڑھائی دا کچھ جیہڑا سی' اووچ پایا۔اوہدے بعد کر کرا کے اوتہاڈے گھر آئے۔تہانوں کی پتہ اے کی ہوندا اے۔ ❶

جنہوں نے کبھی اس دودھ دینے والے جانور کو دیکھا ہے' وہ جانتے ہیں کہ جانور دے تھلے اک ہوانہ ہوندا' اے جہیدے وچوں دودھ نکلدا ہیگا ❷ بعض جانور ایسے ہوتے ہیں کہ ''ہوانے ایڈے ایڈے ہوندے ہیگے نیں' تے دودھ اوہدے وچوں کچھ وی نہیں نکلدا' ایویں دو چار ٹپکنے نکلدے نیں۔ ❸ یہ جو ہوتا ہے کہ اتنا بڑا ہوانہ اور دودھ اس میں نہیں ہے اس کو وہ کہتے تھے: حبط اعمال۔ان کے اعمال کے نتائج وہ ہوانے ہیں جو نظر تو بڑے بڑے آئیں'' تے دودھ وچوں ککھ نہ ہووے۔'' ❹ یہ عرب کیا قوم تھی!

قرآن کا انتخابِ الفاظ دیکھیے۔قرآن نے یہ کہا ہے کہ اعمال کا ذرہ ذرہ تلے گا لیکن ان کے متعلق کہا ہے کہ لَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (18:105) ان کے اعمال تولنے کے لیے میزان ہی کھڑی نہیں کی جائے گی۔سعی بے مقصد کے فریب میں رہنے والوں کے اعمال تولنے کے لیے میزان کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

---

❶ وہ آ کر پہلے تو وہاں اس میں کچھ ملاتے ہیں۔پھر ''قصور'' (پنجاب کے ایک ضلع کا نام) کے نزدیک جو ملائی نکالنے والی چرخیاں لگی ہوتی ہیں وہاں ان سے دودھ کی ملائی (کریم) نکالی۔آگے آئے تو کچھ پانی ملایا۔پھر دوکانداروں کو دیا پھر انہوں نے کڑھائی چڑھانے کا کچھ اس میں ڈالا' اس کے بعد یہ کچھ کر کرا کر وہ آپ کے گھر آیا۔آپ کو کیا معلوم کہ اس دودھ کے ساتھ کیا کچھ کیا ہے۔

❷ جانور کا ایک ''ہوانہ'' ہوتا ہے جس سے دودھ نکلتا ہے۔

❸ ان کے ہوانے بڑے بڑے ہوتے ہیں مگر دودھ ان میں سے کچھ بھی نہیں نکلتا۔بس یونہی چند قطرے نکلتے ہیں۔

❹ مگر دودھ ان میں سے کچھ بھی نہ نکلے۔

دس سال میں چالیس ہزار شہر اور قلعے حقیقت کا اور حق کا زندہ ثبوت تھے

عزیزان من! مذہب سے مراد صرف مسلمان کا مذہب نہیں۔ دنیا میں رسول دین لاتے تھے۔ وہ لیبارٹری میں ٹیسٹ کر کے بتاتے تھے۔ جب ان لوگوں [1] نے بازنطینی ایمپائر فتح کی ہے تو وہاں ایک مسلمان سپاہی سے پوچھا گیا تھا۔ وہ ان کا کوئی فلاسفر ہوگا۔ اس نے کہا تھا کہ ہر دعوے کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ حقیقت کے معنی حق کے ہوتے ہیں یعنی جو ٹھوس شے سامنے آجائے تو اس نے پوچھا یہ تھا کہ تم بتاؤ کہ تمہارا لا الہ الا اللہ کا جو یہ کلمہ ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس مسلمان سپاہی نے کہا تھا کہ یہ چالیس ہزار شہر اور قلعے جو ہم نے دس سال کے عرصہ میں فتح کیے ہیں' یہ اس کی حقیقت نہیں تو اور کیا ہے؟ عزیزانِ من! جذباتی فریب میں نہیں رہتا۔ یہ دین ہوتا ہے جس سے ہر عمل کا ٹھوس نتیجہ سامنے آتا ہے جب خدا کی اقدار' احکام اور حدود نظر انداز ہو جاتی ہیں' نہیں' بلکہ کر دی جاتی ہیں' ہو نہیں جاتیں' کیونکہ دین پر عمل کرنا ہی نہیں ہے' بلکہ دین پر عمل کرانا بھی ہے' جو کچھ آسان نہیں' پھر انہیں سعی لاحاصل کی جذبات انگیزی میں آہستہ آہستہ مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ اس میں لذت ملتی ہے لیکن اس کے لیے بھی کچھ کم محنتیں نہیں کرنا پڑتیں۔ یہاں مذہب کی دنیا میں بھی اگر آپ دیکھیں کہ صبح چار یا پانچ بجے جب وہ سردی کے موسم میں لحاف کے اندر سوتے ہیں ذرا سر بھی باہر نکالنے کو جی نہیں چاہتا' بہر حال اٹھتے ہیں' ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے ہیں' مسجد جاتے ہیں۔ سردی کے موسم میں نمازیں پڑھتے ہیں۔ مئی جون کے اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کے گرم دن کے اندر روزے بھی رکھتے ہیں۔ حج کے لیے اتنی دور جاتے ہیں اور پھر اگر اہل طریقت کی ان ریاضتوں اور مراقبوں کا پوچھیے کہ یہ کیا ہوتی ہیں؟ بڑی مشقتیں اٹھاتے ہیں' یہ سارا کچھ کرتے ہیں۔ یہ سارا کچھ ہونے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ **فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا** (18:105) ان کی تمام تگ و تاز رائگاں گئی۔ ان کے اعمال سے وہ نتائج کبھی مرتب نہیں ہونگے جو ان کے پیش نظر تھے حتیٰ کہ ظہورِ نتائج کے وقت ان کے اعمال کا وزن معلوم کرنے کے لیے میزان تک کھڑی نہیں کی جائے گی۔ وہ اپنی بے مائیگی کی شہادت آپ ہونگے۔

صحیح عمل کی نتیجہ خیزی کے لیے زراعت کی مثال

عزیزان من! قیامت کا دن' ہمارے لیے بڑا اہم ہے لیکن یاد رکھیے مرنے کے بعد ہی قیامت نہیں آتی' یہاں ہر سانس میں قیامت ہوتی ہے۔ عمل کا نتیجہ تو روز بروز سامنے آتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے قرآن نے صحیح عمل کے لیے زراعت کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ نتائج کو دیکھنے کے لیے کھیتی کی مثال دی ہے۔ کھیتی جذباتی طریق پہ زمیندار کو خوش نہیں کر دیتی کہ ہاں ہاں فصل اُگ آئی ہے' بڑی ہوگئی ہے' اب یہ اتنی بڑی ہوگئی ہے' اب اس میں بال و دانے پڑ رہے ہیں۔ وہ آکر روز دیکھتا ہے کہ واقعی اس میں نمود ہوگئی ہے۔ اس کے پیمانے کے مطابق وہ

---

[1] یعنی عربوں نے

بڑھ رہی ہے' اتنی بڑی ہوگئی ہے۔ جس دن بھی وہ دیکھتا ہے کہ ایسی صورت نہیں ہے' تو وہیں کھڑا ہو جاتا ہے کہ کہیں کوئی نقص ضرور ہے' کہیں وہ اس کی کھدائی کرے گا اس میں سپرے کرے گا جو نئے نئے طریقے ہیں۔ یعنی اس کو پتہ ہے کہ اس کی نمود رک رہی ہے' وہ فریب میں نہیں رہتا۔ دیکھا آپ نے قرآن نے دین کی مثال زراعت سے کیوں دی ہے لیکن جب یہ چیز ہو کہ نہ اس نے وہ فصل بوئی' نہ دیکھا تو پھر حالت یہ ہے:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبط دوا ہے اور میں ہوں

تو پھر اس کا ہوتا یہ ہے کہ وہ ساری مشقتیں اٹھاتا ہے' ٹھوس نتائج کی طرف اس کی نگاہ تو جاتی نہیں' وہ کہتا ہی نہیں کہ ٹھوس نتائج نکلیں گے۔

ہمارے ہاں مذہب کی اس زندگی میں ثواب کو محسوس طور پر ماپنے یا ٹیسٹ کرنے کا کوئی پیمانہ نہیں

عزیزان من! اعمال کے ٹھوس نتائج نکلیں گے مگر ہمارے ہاں تو مذہب کی دنیا میں یہ کہا جاتا ہے کہ ثواب ہوگا۔ بھئی! بتا دیجیے کہ وہ ثواب کیا ہوتا ہے؟ جواب ہوتا ہے کہ یہ پتہ چلے گا مرنے کے بعد جا کر۔ تو اب اس کے لیے کوئی ٹیسٹ نہیں ہے' پہچاننے کا کوئی معیار نہیں ہے کہ نتیجہ نکل رہا ہے یا نہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ کیوں ہوگا' اور یہ کیوں ہوا ہے؟ اس لیے کہ **یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا** [1] (18:104) غلط جذباتی کام کر رہے تھے اور اپنے ذہن میں اس مصنوعی کو حقیقی سمجھ رہے تھے۔ آپ اپنے جیب میں مصنوعی' کھوٹے سکے رکھے اور جب بازار میں جا کر انہیں دیں گے' تو وہ آپ کو پلٹ کر تھما دیگا۔ یہاں وہ دوکاندار ترازو ہی نہیں اٹھائے گا۔ اگر آپ نے اسے کھوٹا سکہ دیا ہے تو سوال ہی نہیں ہے' وہ تولنے کے لیے ترازو ہی نہیں اٹھائے گا۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے' عزیزان من! جب محض جذبات کی شدت میں' انسان چلتا رہے اور عقل و فکر کے ساتھ اس کو نہ دیکھے' تو پھر اس کو سراب بھی آگے پانی بن کے دکھائی دیتا ہے لیکن اس سے پیاس تو نہیں بجھتی اور انسان کو جو وہاں تک پہنچنے میں اتنی مشقت اٹھانی پڑتی ہے وہ رائیگاں جاتی ہے' بالکل ایسی رائیگاں کہ اسے تولنے کے لیے میزان کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لیے کہا ہے کہ **وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍۢ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً** [2] (24:39)۔ یہاں اس آیت میں یہ دوسرا لفظ ''بقیعۃ'' ہے۔ ایک لفظ ''ظمان'' ہے۔ پیاس کی شدت ہے جو اسے سوچنے ہی نہیں دیتی کہ واقعتہ یہ پانی ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ **حَتّٰٓی اِذَا جَآئَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْـًٔا** (24:39)

---

[1] وہ بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنی کاریگری سے بنا رہے ہیں' وہ بہت اچھا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔683)

[2] جو لوگ اس آسمانی روشنی کی راہنمائی سے انکار کرتے ہیں' ان کے اعمالِ حیات کی مثال یوں سمجھو جیسے کوئی پیاسا' چٹیل میدان میں' سراب کو پانی سمجھ کر' اس کی طرف لپکے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔805)

مرمر کر وہ اس کی طرف بھاگتا چلا جاتا ہے۔ وہاں جا کر دیکھتا ہے کہ وہاں کچھ نہیں ہے۔ کوئی شے بھی نہیں ہے۔ وہ یکسر فریب نگاہ تھا۔

اہلِ شریعت کے بعد اہلِ طریقت کا عمل

عزیزان من! یہ خدا کا قانون مکافات ہے جو اس قسم کے اعمال کے لیے میزان بھی کھڑی نہیں کرتا۔ سوچیے! مشقت اتنی اٹھائے اور اس کے بعد کیفیت یہ ہو کہ ایک رتی بھر بھی اس کا وزن نہ نکلے۔ یہ ہے حبطت اعمال' لیکن یہ انہیں ایک سعی لا حاصل' سعی بے مقصد سے نکلنے نہیں دیتے۔ وہ جو ہجوم نا امیدی ہے' وہ اس کو بدلتے رہتے ہیں کہ نہیں نہیں' نا امید نہیں ہونا چاہیے' بس یہ وہی ہوگا۔ میں نے کہا ہے کہ وہ نتائج اس کے بعد کی دنیا کے اوپر اٹھا رکھتے ہیں۔ اب نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حالت دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی جاتی ہے۔ اس طرف سے اس مداوے کے لیے اہلِ طریقت آتے ہیں کہ اللہ اپنے محبوب بندوں کی آزمائش کرتا رہتا ہے۔ ''آزمائش کرتا رہتا ہے سارے بدن میں صاحب!'' پھر وہ جو بڑے بڑے حضرت صاحب ہیں ان کے قصے شروع ہو جاتے ہیں کہ جی! وہ حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ آ گیا۔ پوچھیے یہ صاحب جو جاتے ہیں کون ہیں! پھر یہ مولانا رومؒ وغیرہ کہانیاں لے کر آئے۔ یہ سامری ہے۔ قرآن میں لفظ سامری ہے' جو راتوں کو داستانیں سنا سنا کر سلاتے ہیں کہ جی! ان کے سارے بدن میں کیڑے پڑ گئے [1] تھے اور اگر کبھی ایک کیڑا نیچے گر جاتا تھا تو اٹھا کر پھر اس کو وہیں رکھ دیتے ہیں کہ اللہ نے خود تیرا یہ رزق دیا ہے' میں تجھے اس سے کیسے محروم کر سکتا ہوں۔ چلے ہوئے ہیں' یہ داستانیں سناتے۔ جتنی آپ کی حالت زیادہ خراب ہوتی چلی جائے گی اتنا ہی زیادہ وہ ان کو اللہ کے محبوب بناتے چلے جائیں گے کہ اس کا رنگ ہی یہی ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ وہ بھی تو بڑی مذاق کی بات لیکن وہ بڑی حقیقت کی بات کہہ گیا کہ ''قیامت میں مختلف قومیں آتی گئیں' جاتی گئیں' اب ایک قوم چلی آ رہی ہے: صاحب! ننگے دھڑنگے' یونہی ذرا سی جھنڈی پہنے ہوئے' تھوڑا سا بدن ڈھکے ہوئے' مردہ چہرے' انہیں کھانے کو کچھ نہیں ملا' آواز آ رہی ہے کہ ہٹ جاؤ' اِدھر اُدھر ہو جاؤ' اب خدا کی محبوب ترین قوم چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اوہ! یہ محبوب ترین' قوم ہے؟ اللہ کے رنگ میں رنگی ہوئی قوم ہے کیونکہ نہ وہ کھاتا ہے' نہ ان کو کھانے کو ملتا ہے' نہ وہ پہنتا ہے' نہ ان کے ہاں کوئی کپڑا لتا ہیگا' نہ اوہدا کوئی مکان ہے' نہ ایناں نوں کوٹھا نصیب ہویا ہیگا [2]۔ اللہ کے رنگ میں رنگی ہوئی قوم چلی آ رہی ہے۔

---

[1] ان سے مراد حضرت ایوب علیہ السلام لیے جاتے ہیں۔

[2] نہ انہیں پہننے کو ہے' نہ اس کا کوئی مکان ہے' نہ انہیں کوئی مکان نصیب ہوا ہے۔

مذہب کی کاریگری صرف یہ ہے کہ انسان ساری عمر سراب ہی میں گزار دے

مذہب میں انسان کو فریب نفس میں مبتلا رکھا جاتا ہے' سراب کو آب دکھایا جاتا ہے۔ عزیزان من! مذہب کی کاریگری یہ ہے کہ ساری عمر آپ کو یہ نہ سمجھنے دے کہ یہ سراب (Mirage) ہے' پانی نہیں ہے۔ چمکتی ریت پہ چلتے جائیں اور آپ کہیں کہ ''واہ واہ کیا سواد آیا ہے جناب کو! وہ نرا کوکا کولا تھا۔ یہی ہے: **كَسَرَابٍۢ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً** [1] (24:39)۔ میں نے کہا کہ قرآن کریم' عزیزان من! کبھی ایسے پڑھا کریں۔ آپ کو بھی تو کچھ ہفتے ان چار لفظوں کے اوپر' میرے ساتھ لگ گئے کہ سراب لفظ کے ساتھ' اس بقیعۃ کا کیوں اضافہ ہو رہا ہے اور شدت کے ساتھ ظمان کیوں کہا جا رہا ہے۔ کہا کہ **حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا** [2] (24:39)۔ یہاں آیا ہے کہ **لَمْ يَجِدْهُ** (24:39)۔ وہاں کچھ نہ ملا۔ نہ ملنے کے معنی یہ نہیں تھے بلکہ یہ ہیں کہ **وَ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ** (24:39) ایسے مقام پر البتہ انسان کو ایک چیز ضرور مل جاتی ہے یعنی خدا کا قانونِ مکافات جو اسے اس سعی لاحاصل کا پورا پورا حساب چکا دیتا ہے۔ اس طرح ملا تو خدا کا قانون مکافات ملا کہ جس نے یہ کہا کہ تیرے حصے میں تکان آئی' تیرے حصے میں محرومی آئی' ناامیدی آئی' تیرے حصے کے اندر یہاں تمہیں کچھ نہ ملا۔

جو بیج کونپل ہی نہ بنے' وہ پودا کیسے بن سکتا ہے؟

عزیزان من! میں نے پھر عرض کیا ہے کہ انسان وحی خداوندی کی روشنی میں عقلِ انسانی سے کام لے' پھر جذبات کو اس کے تابع رکھے اور اس کے بعد دیکھے کہ کس طرح یہاں محسوس دنیا کے اندر' آپ کے ہاں' محسوس نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ وہ تو دعا یہ سکھاتا ہے کہ **رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً** (2:20)۔ پہلے فی الدنیا حسنۃ کہتا ہے' پھر کہتا ہے فی الاٰخرۃ حسنۃ۔ اور یہ ٹیسٹ ہے جس کی دنیا حسنۃ نہیں ہوتی یعنی اسے خوشگواریاں نہیں میسر آتیں' اس قوم کی آخرت حسنۃ ہو ہی نہیں سکتی۔ جس بیج میں سے پہلے دن کونپل ہی نہیں ملتی' وہ پک کر پھل کیسے دیدیگا۔ یہ زندگی ابتدائی اسٹیج کہہ لیجیے جب اس میں حسنات ہوں گی' کھیتیاں ہونگی تب جا کر آخرت میں وہ آپ کو پھل بھی دیں گی۔ یہ ہے: **فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً** (2:201)۔

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

---

[1] ان کے اعمال کی مثال یوں سمجھو جیسے کوئی پیاسا' چٹیل میدان میں سراب کو پانی سمجھے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔805)

[2] یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں تو وہاں اسے (پانی چھوڑ) کوئی شے بھی نہ ملے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔805)

کہتے ہیں کہ وہاں جا کر نتیجہ نکلے گا مگر قرآن کہتا ہے کہ وَ اللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ [1] (24:39) ہم تو بڑی جلدی حساب کر دیتے ہیں۔

عزیزان من! کبھی سریع الحساب پہ غور کیجیے کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ وہ اتنا لمبا وقت لیتا ہی نہیں۔ قرآن کریم نے آسمانی روشنی کے مقابلہ میں ایک دوسری مثال بھی دی ہے مگر وقت تھوڑا ہے۔ معاف رکھیے گا' بات کچھ لمبی چلی جائے گی۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ مجھے ایک اعلان کرنا ہے۔ آپ سے دو چار منٹ کی معافی لے لونگا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ النور کی آیت 36 سے 39 تک آ گئے ہیں' 40 ویں سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّاۤ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

❀❀ ..... ❀❀❀ ..... ❀❀

---

[1] اللہ کا قانونِ مکافات' اعمال کے حساب کرنے میں ذرا دیر نہیں لگاتا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔806)

آٹھواں باب: سورۃ النور (آیات 40 تا 52)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾ وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْۤا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْۤا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾

عزیزان من! آج نومبر 1977ء کی 25 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورۃ النور کی آیت 40 سے ہو رہا ہے: (24:40)۔ پچھلے جمعہ کو جشن قرآن عظیم کے سلسلے میں خصوصی درس تھا اس لیے وہ جو مسلسل درس چلا آ رہا تھا اس میں ناغہ ہو گیا تھا۔ تجدید یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ انسان کو خدا کی دی ہوئی راہنمائی' جسے اس نے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (24:35) کہا تھا' کی روشنی میں سفر زندگی طے کرنا چاہیے۔ اس طرح زندگی بسر کرنے کے خوشگوار نتائج بتائے تھے۔ اس کے بعد اگلی آیت میں یہ کہا تھا کہ جو اس روشنی سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں' ان کے اعمال کی پہلی مثال سراب (Mirage) کی سی ہے' جس میں

لوگ خدا کی عطا کردہ راہنمائی میں زندگی کا سفر طے نہیں کرتے۔ یہ ان کی پہلی کیٹگری ہے کہ وہ اپنے جذبات کو اپنا الہ بنا لیتے ہیں۔ اس نے کہا یہ تھا کہ پھر شدتِ جذبات میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ریت بھی پانی کا چشمہ بن کر دکھائی دیتی ہے' کوئی شے اپنی اصلی ہئیت میں اس کے سامنے آتی نہیں' وہ غلط فہمی و خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہاں اس نے بتایا تھا کہ اگر وہ ذرا بھی کھڑا ہو کر اپنی عقل و فکر سے ہی کام لے تو وہ دلائل کی رو سے بھی اس نتیجے پہ پہنچ سکتا ہے کہ یہاں پانی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تو چٹیل میدان ہے' یہاں سبزی کا' روئیدگی کا' نام ونشان بھی نہیں ہے۔ اس لیے یہاں اتنی لمبی چوڑی پانی کی جھیل کیسے ہو سکتی ہے لیکن شدت جذبات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ پھر عقل و فکر بھی ماؤف ہو جاتی ہے۔ اس طرح پہلی کیٹگری تو یہ ہوئی کہ عقل و فکر تو ہے لیکن انسان شدتِ جذبات کی وجہ سے ان سے کام نہیں لے سکتا۔ اس سے اس کی ساری دوڑ دھوپ' ساری تگ وتاز' ساری سعی و عمل' رائیگاں جاتی ہے اور آخر میں جا کر وہ دیکھتا یہ ہے کہ جسے پانی سمجھا تھا وہ توریت کی دھوکا دینے والی چمک تھی۔

غلط انسانی فکر کے گھٹا ٹوپ بادل سوچ کی شعاؤں کو بھی روک لیتے ہیں

سراب (Mirage) کی مثالی والی کیٹیگری کے بعد' قرآن کریم ایک دوسری کیٹیگری' انسانوں کا ایک دوسرا گروہ' سامنے لاتا ہے۔ یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو جہالت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی مثال یوں ہے کہ **اَوۡ كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّجِّىٍّ يَّغۡشٰهُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ يَدَهٗ لَمۡ يَكَدۡ يَرٰٮهَا** ❶ (24:40)۔ اس آیت میں کہا کہ اس دوسری کیٹیگری یعنی اس دوسرے گروہ کے لوگ وہ ہیں جن کے اعمال کے متعلق یوں سمجھو کہ تاریکیاں ہیں' ایسی تاریکیاں ہیں کہ پہلے تو جیسے سمندر کی تہ میں باہر کی روشنی قطعاً نظر نہیں آتی' اور پھر سمندر بھی ساکن نہیں ہے' موج در موج ہے یعنی اگر پانی کی ایک سطح پر ہے ہٹتی ہے تو اس کے بعد اس سے دگنی چوگنی اور اس کے اوپر آ جاتی ہے۔ اوپر آسمان میں روشنی تو ہوتی ہے لیکن اس سورج کے آگے تاریک گھٹا ٹوپ بادل آ جاتے ہیں۔ وہ اس روشنی کو بھی روک دیتے ہیں۔ اس سمندر کی تاریکی کا اندازہ لگائیے کہ سمندر کی تہ تک' اور اوپر تہ در تہ' موج در موج تاریکیاں ہیں' پھر باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ کہا کہ ان تاریکیوں کے اندر دوسری چیز کا نظر آنا تو ایک طرف' انسان کو خود اپنا ہاتھ بھی نظر نہیں آتا۔ یہ قرآن نے جہالت کی تہ در تہ تاریکیوں کی مثال دی۔ وہاں دھوکا دیدینے والی چمک تھی جس سے انسان فریب کھا جاتا ہے' اس کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ یہاں چمک کی وجہ سے خود فریبی نہیں ہے بلکہ تاریکیوں کے اندر ڈوبا ہوا ہے اور سب سے بڑی چیز اس تاریکی کی یہ ہے کہ خود اپنا آپ بھی نظر نہیں آتا۔ یہ ہے اصل چیز جو یہاں کہی گئی ہے۔

---

❶ یا (آسمانی روشنی کے مقابلہ میں) ان کے اعمال کی مثال یوں سمجھو جیسے کسی تلاطم انگیز سمندر کی گہرائیوں میں انتہائی تاریکی ہو۔ اس تاریکی کو اور تاریکیاں' موج در موج ظلمات کے گہرے پردے بن کر ڈھانپ رہی ہوں۔ ان تاریک موجوں کے اوپر' چاروں طرف' کالی گھٹائیں چھا رہی ہوں۔ مختصراً یہ کہ تاریکیوں پر تاریکیوں کی تہہ چڑھ رہی ہو اور حالت یہ ہو کہ اگر کوئی اپنا ہاتھ باہر نکالے تو اسے وہ ہاتھ بھی نظر نہ آئے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔806)

قرآن نے ظلمت کے لیے ہمیشہ جمع کا صیغہ اور نور کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے

عزیزان من! ظلمت کے معنی تاریکی ہوتا ہے۔ میں ذرا آگے چل کر عرض کرونگا کہ مادے (Root) کے اعتبار سے یہ ''ظ ل م'' ہے۔ ظلم یہیں سے ہے۔ ظلمت تاریکی ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے' جمع کے صیغے میں آیا ہے' ظلمات ہی آیا ہے۔ اس کے مقابلے میں نور روشنی کو کہتے ہیں اور وہ ہر جگہ واحد کے صیغے میں آیا ہے۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے جو قرآن نے کہی ہے۔ نور تو حق ہے اور ظلمت باطل ہے۔ یہ جو نور ہے یہ ہمیشہ واحد کے صیغے میں آیا ہے اس لیے کہ صحیح جواب ہمیشہ ایک ہوتا ہے اور غلط جواب سینکڑوں ہزاروں ہو سکتے ہیں۔ صحیح جواب دو ہو ہی نہیں سکتے' وہ جمع تو ایک طرف' تثنیہ کے صیغے میں بھی نہیں آ سکتا۔ صحیح نشانہ تو ایک ہوتا ہے اور جب صحیح نشانہ مس کر جائے تو اس کے بعد پھر ہزاروں نشانے ہوتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ نور تو ہر جگہ واحد کے صیغے میں آیا ہے۔

تاریکی میں انسان خود کو بھی نہیں دیکھ سکتا

قرآن نے جہاں بھی تاریکی کا ذکر کیا ہے' تاریکیاں کہا ہے۔ تاریکیوں کی بڑی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ تاریکی کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ انسان خود اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ میں نے کئی بار یہ عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کا مخلص یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آشنا کر دیتا ہے۔ سراب (Mirage) خود فریبی ہو تو اس میں اپنے جذبات سے دھوکا کھاتا ہے اور یہ جہالت کی جو تاریکیاں بتائی ہیں ان میں وہ فراموش ہو جاتا ہے' اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتا اور یہ وہ تاریکیاں ہیں جس کے متعلق کہا کہ وہ موج در موج' تہ در تہ' اس کے اوپر آتی چلی جاتی ہیں۔ مذہب کی دنیا میں یہ تاریکیاں تقلید کی تاریکیاں ہیں۔ تقلید کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اپنا تشخص کھو دیتا ہے۔ بھئی! تم جو یہ بات کہتے ہو کہ یہ صحیح ہے' یہ سچ ہے' کیسے کہتے ہو؟ کہ جی' فلاں صاحب نے فرمایا ہے' فلاں امام کا قول ہے' فلاں مفسر کی کتاب میں لکھا ہے' حضرت صاحب نے یوں ارشاد فرمایا ہے۔ یعنی اپنا آپ درمیان میں ختم ہو جاتا ہے ''میں''[1] رہتا ہی نہیں ہے۔ اس کا مقام ہونا تو ایک طرف رہا'' ''دہن کا ذکر کیا' یہاں تو سر ہی غائب ہے گریباں سے''۔ خود اپنا آپ ہی ختم ہو گیا ہوتا ہے۔ آپ دیکھیے تقریر میں ''میں'' آتا ہی کہیں نہیں ہے بلکہ اس میں اگر یہ کہا جائے کہ اس کے بعد میری یہ رائے ہے تو وہ ملحد اور بے دین ہو جاتا ہے۔ جتنی زیادہ سندیں یہ کوٹ (Quote) کرتا چلا جائے گا' اتنا ہی بڑا عالم کہلائے گا یعنی جتنا جاہل ہے اتنا ہی یہ بڑا جید عالم ہو جائے گا۔ یہ جو قرآن نے تاریکی کی تہ در تہ تاریکی کہا تھا یہ وہ تاریکی ہے جس کی سند ان کے ہاں تواتر و توارث ہوتی ہے۔

---

[1] I am ness

ہمارے ہاں تواتر وتوارث کی سند کا احترام

شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے ہاں یہ جو کسی بات کے سچے ہونے کی سند ہے وہ یہ ہے کہ یہ بات امت کے اندر تواتر سے چلی آ رہی ہے۔ یہ تواتر' تہ در تہ' موج در موج ہوتا ہے اور پھر یہ تواتر جتنا لمبا ہوتا چلا جائے' اتنی ہی اس بات کی سچائی' پختہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ یعنی پہلا جھوٹ اگر پانچ سات دس تہوں کے نیچے آ جائے یا آگے بڑھ جائے تو پھر وہ جھوٹ سچ ہو جاتا ہے۔ مذہب کی دنیا میں یہ جسے تواتر کہتے ہیں' بہت بڑی سند ہے۔ وہ اسلاف میں سے بھی کسی ایک سلف کا قول نہیں بیان کرتے۔ وہ کہتے ہیں اسلاف کا مسلک یہ ہے۔ اس کے اندر ظلمت کی بہت سی تہیں ہونی چاہئیں اسی لیے یہ سلف صالحین کہیں گے' وہ بھی تہ در تہ موج در موج جمع ہے۔ کسی بات کے متعلق ان سے پوچھ لیجیے' کوئی فتویٰ ان سے مانگ لیجیے' آپ دیکھیں گے کہ اس میں ان اسلاف کے اقوال نقل کرتے چلے جائیں گے اور سند یہ ہوگی کہ یہ چیز تواتر سے آئی ہے۔

تواتر کی ایک مثال: مسئلہ وصیت

اب سوال یہ ہے کہ یہ تواتر کہاں تک چلتا ہے؟ سنیے' قرآن کریم کے احکام کو تواتر منسوخ کر دیتا ہے۔ میں یونہی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ میرے ساتھ تو یہ چیز ہوتی چلی آ رہی ہے۔ قرآن کریم میں وصیت کے متعلق واضح حکم ہے کہ ہر شخص اپنے پورے مال میں جس کے لیے وہ چاہے وصیت کر سکتا ہے مگر ہمارے ہاں کی شریعت میں کہا یہ جاتا ہے کہ وہ یہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں کر سکتا ہے' اور وہ بھی اپنے ورثا میں سے کسی کے حق میں نہیں کر سکتا۔ یہ تو قرآن کریم کے صریحاً خلاف بات ہوئی۔ جب میں نے یہ چیز لکھی تو اس کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ مولانا عبدالوہاب صاحب' جواب مرحوم ہو گئے' نے کتابچہ شائع کیا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے قرآن کی یہ آیت ہے' ایک روایت میں وہ آیا ہے' مگر اس کے بعد امت کا تواتر سے اس پر عمل ہے' اس واسطے اس نے قرآن کی اس آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ تواتر کی سند ہے۔ ہر غلط بات جس پہ دو چار صدیاں گزر جائیں' پھر وہ صحیح ہو جاتی ہے' سند ہو جاتی ہے' ایسی بڑی سچائی ہو جاتی ہے کہ قرآن کے حکم بھی منسوخ کر سکتی ہے۔

تقلید کی روشنی انسان کو عقل' فہم' شعور' علم اور تدبر کی دولت سے محروم کر دیتی ہے

آپ ظلمت کو دیکھ رہے ہیں' تہ بہ تہ ایک ہی چیز تھی' پھر جس سے یہ تاریکی چھٹ سکتی تھی' وہ آسمانی روشنی ہے وہ پہنچ جاتی۔ کہا کہ اس کے نیچے انہوں نے خود ہی بادلوں کی تہیں بچھا رکھی ہوتی ہیں' تاکہ وہ ان تک آنے ہی نہ پائے' عقل وفکر کے چراغ گل کر دیئے جاتے ہیں' انسان کے اپنے عقل' فہم' شعور' علم' تدبر کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ یہ چیز تھی جس کی رو سے یہ آسمانی روشنی سے استفادہ کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے بادلوں کی تہیں لگا دی جاتی ہیں' ان کے نیچے آپ ان ظلمت کے اندر رہتے ہیں اور نتیجہ' جیسے میں نے ابھی عرض کیا ہے' یہ ہے کہ

انسان اپنے آپ کو گم کر دیتا ہے' اس کا اپنا تشخص باقی نہیں رہتا' ''میں'' کہیں نہیں آتی' اس میں اپنا تدبر کہیں نہیں آتا' اپنی فکر کہیں نہیں آتی۔ اس سے بڑا اور کوئی نقصان نہیں ہے۔ لہٰذا سب سے بڑی بات جو قرآن نے بتائی وہ یہ ہے کہ **وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ** (59:19) ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو فراموش کیا اور پھر وہ خود فراموشی میں مبتلا ہو گئے۔ یہاں **فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ** آیا ہے یعنی وہ اپنی ذات کے ہی منکر ہو گئے' اپنا آپ یعنی اپنا Self ہی بھول گئے۔ سائیکولوجی میں یہ جو Consciousness (شعور) ہوتا ہے' اس کے متعلق کہا ہے کہ ایک Simple Consciousness (شعور سادہ) ہوتا ہے' یہ حیوانات میں بھی ہوتا ہے' جہاں بھی زندگی ہوتی ہے' یہ وہاں ہوتا ہے لیکن یہ Self Consciousness یعنی شعور خویش صرف انسان کے اندر ممکن ہے۔

اپنی ذات کا منکر ہونا خدا کا منکر ہونا ہے

انسان کا جو امتیازی جوہر ہے وہ شعور خویش ہے' اپنی ذات کا شعور ہے' اپنے آپ کا تشخص ہے۔ یہ جو اپنا Consciousness (شعور) ہوتا ہے' انسان کی انسانیت کی سند ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کو بھلا دینے کا' فراموش کر دینے کا' فطری نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو بھلا دیتا ہے' اس میں خود کو فراموش کر دیتا ہے' اس کا ''میں'' درمیان میں رہتا ہی نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ اس تقلید میں' جس کی سند تو تواتر ہوتی ہے' اس کا ''میں'' درمیان میں باقی نہیں رہتا۔ جب اس کی یہ 'انا' اس کی خودی' اس کی ذات' اس کا اپنا آپ (Self)' باقی نہ رہے تو پھر یہ Simple Consciousness (شعورِ سادہ) کے اوپر رہ گیا۔

''قلادہ'' کا مفہوم

کیا آپ کو پتہ ہے کہ تقلید کا لفظ کہاں سے نکلا ہے؟ یہ ''قلادہ'' سے ہے۔ یہ وہ ہے جو گائے بھینس کے گلے میں رسی ڈال کے اور آگے سے اس کو کھینچتا ہے' اسے قلد کہتے ہیں۔ تقلید اس کے گلے میں بندھی ہوئی وہ رسی ہے جس میں یہ ایک جانور کی طرح کھنچے چلا جا رہا ہے۔ اس سے اس کا Self Consciousness (شعور خویش) ختم ہو گیا۔

بنی جہاں را ' خود را نہ بنی
تا چند ناداں' غافل نشینی

اگر خدا کا منکر ہونا کافر ہونا ہے تو اپنی ذات کا منکر ہونا کافر تر ہونا ہے

سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ قرآن انسان کو اس کے Self (خویش) سے آشنا کراتا ہے۔ اسی بنیاد پر اقبالؒ (1877-1938) کہتا

ہے کہ

منکرِ حق نزد ملا کافر است
منکرِ خود نزد من کافر تر است

ملا کے نزدیک تو خدا کا منکر کافر ہے' میرے نزدیک اپنا منکر کافر تر ہے۔ یہ قرآن کی اس آیت کا ترجمہ ہے: **وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ** ❶ (59:19)۔ قرآن نے خدا کے بھلا دینے کو الگ جرم قرار نہیں دیا۔ کہا یہ ہے کہ اس سے ہوتا یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے۔ یہ ہے جو جرم ہوتا ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کا تو سارا پیام ہی اسی چیز پر ہے۔ جسے Self (خویش) کہتے ہیں اس نے جسے خودی کہا ہے:

شاخِ نہال سدرۂ خار وخس چمن نہ شو

تو سدرہ کی شاخ ہے' سدرہ کے درخت کی شاخ ہے' اتنی بلندیوں پہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ باغ کا خار وخس کیوں بن جاتا ہے؟ کہا کہ

منکر او اگر شدی منکر خویشتن مشو

ذاتِ خدا کا انکار بھی اگر تم نے کر دیا ہے' تو اپنا انکار نہ کرنا۔ اپنا انکار کرے گا تو اس کا اقرار تو ایک طرف رہا' اپنے اقرار سے بھی چلا جائے گا۔ اپنا اقرار کرے گا تو امکان اس چیز کا ہے کہ اس کا اقرار کرے۔

دنیا و آخرت کا سارا دارومدار ذات انسانی پر ایمان لانا ہے

ساری بات اپنے اقرار سے آگے چلتی ہے۔ میں ایمان لایا: میں نے خدا کو مانا' میں نے یہ کچھ کیا۔ اور اگر میں (Self) ہی درمیان میں نہ رہی تو کس نے خدا کو مانا' کس نے اقرار کیا' کس نے یہ کام کیا۔ وہ تو ''میں'' ہی نہیں ہے۔ یہ ''میں'' (Self) بہت بڑی چیز ہے۔ وہ یہودی فلاسفر ہے لیکن اس کا یہ جو ایک ٹکڑا ہے' وہ بہت کام کا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

One who Can not say I, Cannot say thou

جو ''میں نہیں کہہ سکتا وہ تو بھی نہیں کہہ سکتا''۔ جہالت تہ در تہ جہالت ہوتی ہے' تقلید سے پیدا ہوتی ہے۔ تقلید کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی ذات کو ختم کر دیتا ہے۔ شریعت والوں کے ہاں تو بہرحال یہ تقلید اتنے ہی تک رہی۔ کم از کم یہ تو کہنے والا رہا کہ میں فلاں امام کے قول

---

❶ (تم اس حقیقت کو یاد رکھو کہ مقصودِ حیات صرف انسان کی طبعی زندگی کی پرورش نہیں' اس کی ذات کا ارتقاء اور بالیدگی بھی مقصود ہے' بلکہ بنیادی مقصد یہی ہے۔ طبعی زندگی تو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ مقصد قوانینِ خداوندی کے اتباع ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا) تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا' جنہوں نے قوانینِ خداوندی کو پس پشت ڈال دیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود ان کی اپنی ذات ہی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی (اور ان کی زندگی' حیوانی سطح کی' زندگی بن کر رہ گئی۔ وہ ''میں'' کو بھلا بیٹھے اور ان کا منتہائے مقصود ''میرا'' رہ گیا)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1299 تا 1300)

کو مانتا ہوں۔ چلیے اپنا قول نہ رہا اپنا تدبر اپنا شعور اپنا ایمان نہ رہا کسی کی بات تو رہی لیکن اہل طریقت آگے بڑھے تو وہ تو لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے۔ انہوں نے نفس کو ہی ختم کرا دیا۔ کہنے لگے کہ خودی خدا نال ویرا۔ [1] وہ خودی کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ کہا کہ اسے ختم ہی کر دیا جائے۔ ان کے ہاں سب سے بڑا مقام فنا کا مقام ہے۔ اس کے برعکس سارا قرآن انسان کی بقا ہی کے لیے چل رہا ہے۔

قرآن کی ساری تعلیم صرف اور صرف ذات انسانی کا ہی تعارف ہے

قرآن کا سارا پروگرام انسان کے تمام اعمال صالحہ اس لیے ہیں کہ انسان اپنی موت کے ساتھ کہیں یہ نہ سمجھ لے کہ ''میں'' ختم ہو رہا ہوں اسے تو باقی رہنا ہے جبکہ اس کے برعکس اہلِ طریقت کہتے ہیں کہ اس کی انتہائی منزل فنا ہو جانا ہے عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔ کیا بات ہے عشرت قطرہ کی! یعنی وہ قطرہ ہی باقی نہ رہا تو وہ عشرت کس کی ہے۔ آپ نے غور فرمایا عزیزان من! کہ قرآن بات تمثیل کی کرتا ہے وہ **کظلمٰت** کہتا ہے۔ پہلے **کسراب** (24:39) کہا تھا کہ سراب (Mirage) کی مثال ہے لیکن وہ اس مثال کے اندر کتنی کتنی بڑی اہم فلسفے کی باتیں کر جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ جو ظلمٰت ہے اس کا واحد ظلمت قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ اس کی بنیاد اور مادہ (Root) ظلم یعنی ''ظ ل م'' ہے۔ اگرچہ ظلم ایک الگ موضوع ہے لیکن بات چونکہ اس کے مادے سے آ گئی ہے میں عرض کر دوں کہ مادے کے اعتبار سے ظلم کے معنی ہیں کہ ''جس چیز کو جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ رکھی جائے''۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اتنی جامع ہمہ گیر Definition (تعریف) ہے کہ اس کے بعد کچھ مزید کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

عربوں کے ہاں مادے کے اعتبار سے معنی کے تعین کی ایک مثال

عزیزان من! معلوم نہیں کہ یہ عرب بدو کیسے کہاں ان حقائق تک پہنچے تھے! ظلم کی تعریف (Definition) کرتے ہیں کہ ''جہاں کوئی شے ہونی چاہیے وہ وہاں نہ ہو''۔ ایک تو یہ ہے کہ ایک چیز کو بلند مقام پہ ہونا چاہیے اسے اگر نیچے گرا دیجیے تو یہ ظلم تو ہم آپ سب سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے اس کو پست درجے پہ لے آئے اس کا جو صحیح مقام ہے اس سے چھین کر اسے نیچے لے آئے۔ وہ کہتے تھے کہ جس طرح نیچے اسی طرح اس کو اونچا کر دینا بھی تو ظلم ہے۔ اور سنیے کہ وہ کیا کرتے تھے۔ میں بہرحال ہر بار یہی کہتا ہوں کہ کبھی فرصت ہو گی کبھی نصاب (Curriculum) آئے گا تو میں بتاؤں گا کہ ان عربوں کے ہاں کے یہ مادے (Roots) کے اعتبار سے جو انہوں نے معنی لیے ہوئے ہیں وہ انہیں کس کس طرح استعمال کرتے تھے۔ ہمارے ہاں تو ظالم وہ ہے جو پھاڑ کھاتا ہے۔ ٹھیک ہے یہ ظلم ہے۔ وہ کہتے تھے کہ **من استرعی الذئب فقد ظلم** جس نے بھیڑیے کے متعلق یہ سمجھ لیا کہ یہ ریوڑ کا رکھوالا بنے گا وہ بھی ظالم ہے کیونکہ اس نے

---

[1] خودی خدا کے ساتھ دشمنی ہے مخاصمت ہے۔

پھاڑ کھانے والے کو رکھوالا سمجھ لیا۔ اُف! وہ تو ظالم ہے ہی جو چیر پھاڑ کھانے والا ہے لیکن جس نے اسے رکھوالا سمجھ لیا' وہ اسے بھی ظالم کہتے تھے کہ جو اس کا مقام تھا تم نے اس کو وہاں نہیں رکھا: درندے کو ریوڑ کا رکھوالا بنا دیا' تجھ سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے۔ ❶ دیکھتے ہیں یہ زبان! اور دیکھتے ہیں وہ لوگ کہ جو اس زبان کو یہاں تک لائے! اور پھر دیکھتے ہیں کہ قرآن نے اس زبان کا انتخاب کیوں کیا! اس چیز کے لیے کہاں تک ان کی نگاہ گئی ہوئی تھی! کہیں آپ کو اس کی عام مثال ملتی ہے کہ بھیڑیئے کو ریوڑ کا رکھوالا بنا دینے والا بھی ظالم ہے' اس کو رکھوالا سمجھ لینے والا بھی ظالم ہے۔ کسی اور زبان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

ہر قدم پر ایک نیا خدا اور ہر قدم پر ایک نیا بندھن

قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ نورِ خداوندی سے انکار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ظلمت کی تہوں میں رہتا ہے جہاں تہ در تہ اور موج در موج تاریکیاں ہی تاریکیاں ہوتی ہیں۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر

میری فکر ہر وقت' ہر دم' ایک نیا خدا تراش لیتی ہے

رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

کوئی کہیں ایک بندھن ٹوٹ جاتا ہے تو ایک اور بندھن ہوتا ہے جسے وہ ڈال دیتا ہے اور کہا ہے کہ وہ جو ٹوٹی ہوئی زنجیر کے ٹکڑے ہوتے ہیں' عقیدت سے انہیں چن کے پھر سے زنجیر بنا کے وہ اسے اپنے گلے میں ڈال دیتا ہے۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا ملحد' بے دین' ظالم' فاسق و فاجر' وہ ہے جو ان کی پہنائی ہوئی زنجیروں کو صحیح طرح توڑنے کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ یہی زنجیریں ذرا سی پرانی ہو جاتی ہیں تو پھر تقدس کا ہالہ اوڑھ لیتی ہیں۔ پرانی چیزیں مقدس بن جاتی ہیں۔ یہ ہے ظلمت جس کے اندر پھر یہ لوگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ آپ' عزیزانِ من! آسمانی ہدایت کو دیکھ لیجیے کہ کہاں سے انسان کو اٹھا کر کہاں تک لے جاتی ہے۔

دنیائے مغرب شدتِ جذبات کی گرویدہ ہے تو مشرق تقلید کا غلام ہے

قرآن کو چھڑانے کے بعد اب دنیا دو ہی ٹکڑوں کے اندر بٹ چکی ہے۔ ایک وہی جو شدتِ جذبات سے سراب کو چشمہ سمجھے ہوئے ہیں' یہ پوری مغرب کی دنیا اس طرف چلی جا رہی ہے اور دوسرے وہ جو ظلمت کی تاریکیوں کے اندر' سمندر کی گہرائیوں میں' پڑے ہوئے

---

❶ عربوں میں ایک مثل ہے کہ من استرعی الذئب فقد ظلم۔ جس نے بھیڑیئے سے توقع کی کہ وہ گلہ کی نگہبانی کرے گا' اس نے ظلم کیا یعنی بھیڑیئے کو اس کے صحیح مقام پر نہیں رکھا۔ (پرویزؒ: لغات القرآن' ص۔1110)

ہیں اور آسمانی روشنی کے سامنے تقلید کی گھٹا ٹوپ اندھیروں کی چادریں تان رکھی ہیں کہ ذرا سی کہیں سے ایک کرن بھی ان تک نہ آنے پائے۔ ساری دنیا ان دو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مذہب پرست دنیا میں' کوئی بھی مذہب کیوں نہ ہو' خواہ اس کا نام آپ اسلام رکھ لیں' اسلام تو مذہب نہیں ہے یہ تو دین ہے' مذہب پرست ساری دنیا ان ظلمت میں رہتی ہے۔ دوسرا ٹکڑا جسے آپ سیکولرازم والا کہتے ہیں وہ سراپا سراب ہے اور اسی لیے اس نے کہا جو میں نے کہا تھا کہ آخری ٹکڑا آخر میں پیش کرونگا' کہ **وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ** (24:40) اگر وہ آسمانی روشنی میسر نہیں آتی تو پھر روشنی کہیں بھی نہیں مل سکتی۔ دیکھ لیجیے' ساری دنیا آپ کے سامنے ہے' بزعم خویش خدا کے ماننے والے بھی ہیں اور خدا کے منکر بھی' مگر کہیں بھی وہ روشنی نہیں ہے۔

نورِ خداوندی کے متعلق قرآن کا فرمان

آگے چلیے' قرآن کہتا ہے کہ **اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (24:35)۔ ارض انسانوں کی دنیا ہے اور سماوات خارجی زندگی۔ پہلے اس نے انسانوں کی دنیا کو لیا اور بتایا کہ جو اس نور یعنی قرآن کریم سے استفادہ کر کے اس کی روشنی میں اپنا سفر طے کرتے ہیں وہ کس قدر محفوظ اور مامون طریقے پر منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں' جو اس روشنی سے فائدہ نہیں اٹھاتے وہ یا تو اپنے جذبات کی شدت کے اندر سراب کو پانی سمجھے ہوئے ہوتے ہیں یا وہ جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے حیوانات کی سطح کے اوپر زندگی بسر کرتے ہیں' انسانی سطح انہیں نصیب ہی نہیں ہوتی۔ یہ تھی انسانوں کی دنیا۔ اس نے تو نور السموٰت بھی کہا ہے۔ یعنی خارجی دنیا کے اندر خدا کا نور' خدا کی ہدایت' اس کی راہنمائی۔ یہ راہ نمائی براہ راست ہر شے کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی ہوئی ہے کیونکہ یہاں ہدایت دینے کا انسانی دنیا کی طرح کا طریق اختیار نہیں کیا گیا۔ انسانی دنیا میں تو کسی ایک رسول یا کسی ایک نبی کو وحی کے ذریعے سے ہی یہ ہدایت دی جاتی تھی اور وہ نبی فریضہ رسالت کی بنا پر اسے آگے انسانوں تک پہنچاتا تھا اور پھر انسانوں کو اس کا اختیار دیدیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس کے مطابق زندگی بسر کریں' چاہیں اس سے انکار کر دیں۔ قرآن نے اس کے نتائج بتائے ہیں کہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے یہ خوشگوار نتائج نکلیں گے' اس کے انکار سے یہ تباہیاں آئیں گی لیکن خارجی کائنات میں اس نے یہ کہا ہے کہ نہ تو یہ نور اس طرح سے آتا ہے جس طرح انسانی زندگی میں آتا ہے۔ یہاں تو کسی ایک فرد کے ذریعے سے باقی افراد تک پہنچتا تھا مگر خارجی کائنات کی ہر نوع کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا ہے جسے Instinct (جبلت) کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ''جبلت'' کیا جاتا ہے: جسے نہ بدلنے والی چیز کہا جاتا ہے جبل کی طرح۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ خارجی کائنات میں کسی کو صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں بنایا کہ اس کا جی چاہے تو اس کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔ یہ نہیں ہے۔

ارض کے نور کے بعد سماوات کے نور کی حقیقت اور تسبیح کا مفہوم

اب یہ سماوات کے نور میں اور ارض کے نور میں بنیادی فرق آ گیا۔ ارض کا جو نور تھا' پہلے اس کے متعلق قرآن نے یہ کچھ کہا۔ اب سماوات کے نور کی طرف آیا۔ کہا کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (24:41) انسان کے علاوہ جو باقی اشیائے کائنات ہیں' وہ ارض کی بلندیوں میں ہوں' ان کرّوں کے اندر ہوں' کرّہ ارض کے اندر ہوں' ان کے اندر نور کی کیفیت کیا ہے؟ اس کے متعلق کہا کہ يُسَبِّحُ لَهٗ (24:41)۔ میں نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں کے جو ترجمے ہیں' ان میں ظلمت کی بڑی بڑی تہیں آ جاتی ہیں: ترجمہ' پھر تفسیر' اس کے بعد حاشیے۔ یہ تمام تہ در تہ' موج در موج' ظلمت ہوتا ہے' اصل حقیقت تک وہ پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ یہاں سَبَّحَ کہا ہے۔ اس سے تسبیح کی طرف نگاہ گئی۔ جونہی تسبیح کہا' منکے پھیرنے والی بات آ گئی: وہ ایک لفظ کو گن گن کے دہرایا گیا' سو بار دہرایا' پھر وہ ہزار دانے کی بھی تسبیح ہوتی ہے' ہم نے دس ہزار دانے کی تسبیح بھی دیکھی ہے' اتنا بڑا ڈھیر لگا ہوا ہوتا ہے جیسے سانپ بیٹھا ہوا ہو۔ گنو کہ اتنی دفعہ اللہ اللہ کہا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ سب سے زیادہ تو یہ جو مانگنے والا فقیر ہوتا ہے وہ کہتا رہتا ہے کہ ''دے اللہ کے نام پہ' اللہ بھلا کرے گا''۔ صبح سے شام تک اللہ اللہ کہتا چلا جاتا ہے اور بھیک مانگتا چلا جاتا ہے۔ اگر اس لفظ اللہ کو دہرانے سے ہی یہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے تو اس سے بڑا تو اللہ کا نام دہرانے والا کوئی اور ہے ہی نہیں مگر وہ ہے کہ ''ٹکر منگ کے کھاندا۔ اے سارے تسبیح پھیرن والیاں دا ایہوای حال ہوندا اے۔ ❶

عزیزانِ من! پوچھو ان زبان دانوں سے کہ تم نے یہ لفظ تسبیح کن معنوں میں استعمال کیا ہے؟ انہوں نے یہ کہا تھا کہ یہ جتنی توانائی کسی کے اندر ہوتی ہے' وہ اسے پوری کی پوری صرف کر کے کسی مقصد کے حصول میں سرگرداں رہنے کے لیے ''س ب ح'' کا لفظ بولتے تھے' گھوڑے کی وہ پوری توانائی' وہ چال' جس میں وہ دونوں پاؤں پورے پھیلا کے آگے پھینکتا ہے' اسے وہ تسبیح کہتے تھے۔ وہ تیراک جس میں وہ پورا ہاتھ بازو' یوں پھیلا کر' تیرتا ہے' پورے بازو کے ساتھ تیرتا ہے' وہ اسے تسبیح کہتے تھے۔ تیراکی کی دوسری قسم بھی ہے جس میں وہ یہ نہیں کرتا تو اس کے لیے ان کے ہاں یہ لفظ نہیں آتا۔ ان کے ہاں تو ایک ایک چیز کے لیے سو سو الفاظ ہوتے ہیں۔ یہ جس میں وہ پورا ہاتھ پھیلا کر پانی کو کاٹے' وہ تھی تسبیح۔ جس میں وہ گھوڑا جو اپنی دونوں ٹانگیں آگے پھیلا کے بھاگے' وہ تھی تسبیح۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ خارجی کائنات کی ہر شے اس پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہے۔ یہاں لَهٗ بڑا عجیب لفظ آیا ہے: خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سَبَّحَ آیا ہے۔ یعنی ہر شے اس پروگرام کی تکمیل کے لیے پوری پوری توانائیاں صرف کر رہی ہیں۔ ایک لفظ میں وہ کیا بات کہہ جاتا ہے'

---

❶ روٹی مانگ کر کھاتا ہے۔ ان تمام تسبیح پھیرنے والوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! کہا کہ ذرا ان پرندوں کو دیکھو۔ آپ ویسے ہی کسی پرندے کو چھوڑ کر دیکھیے۔ یوں کیجیے کہ اس کے پر باندھ کر چھوڑ دیجیے۔ وہ فضا میں ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ نیچے گر جائے گا۔ وہ ہوا سے بھاری ہوتا ہے' لیکن اس کے بعد پر پھیلائے ہوئے اس کو دیکھئے' سارا سارا دن وہ اس ہوا میں اڑتا رہتا ہے۔ اس کے اندر وہ راہنمائی ودیعت کر کے رکھ دی ہے اور اسی بنا پر خارجی کائنات کی ہر شے اپنی اپنی منزل کو پہچانتی ہے جبکہ اس فضا کے اندر جہاں کسی سڑک کے نشان کا ہونا تو ایک طرف رہا' کوئی رخ ہی نہیں ہوتا' کوئی سمت ہی نہیں ہوتی' وہ فضا کے اندر میلوں نکل جاتا ہے۔ لیکن کبھی کوئی پرندہ اس کے بعد شام کو واپسی کے وقت اپنے گھونسلے کو نہیں بھولتا۔ وہ اس کی کونسی راہنمائی ہے جو اسے وہاں لے جاتی ہے؟ یہ ہے وہ نورِ خداوندی' جس کی وجہ سے وہ کبھی غلط راستے پہ نہیں چلتا' صحیح راستے کے اوپر پھر وہاں آ جاتا ہے۔

اقبالؒ کی نظر میں مقامِ مومن اور مقامِ امتِ مسلمہ

اقبالؒ (1877-1938ء) نے خدا کی راہنمائی میں چلنے والی جو امت مسلمہ تھی' اس کے متعلق کہا تھا کہ

پرد در وسعت گردوں یگانہ

یہ آسمان کی خلا میں' فضا میں' پہنائیوں میں' یگانہ (Unique) اڑتی ہے۔

مومنِ بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او برنتابد ہمسرے

یعنی وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:139) مومن تو ہر بلندی پر اڑنے والے سے زیادہ بلند مقام پر ہوتا ہے۔ یہ تو ایک طرف رہا' اگر کوئی اس سے آگے بڑھ جائے' تو اس کی غیرت اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اس کے ساتھ ہو' اس کا ہمدوش ہو جائے۔ اسی لیے کہا کہ

پرد در وسعت گردوں یگانہ
نگاہِ او بہ شاخِ آشیانہ

لیکن اپنے آشیاں کو نہیں بھولتا۔ اس کی نگاہ سینکڑوں میلوں کے فاصلے سے بھی اس آشیانے کے اوپر رہتی ہے۔ یہ تو انسان کا بچہ ہے جو اپنے گھر کے باہر رو رہا ہوتا ہے اور پکارے جا رہا ہوتا ہے کہ ابا جی' میری امی یعنی وہ اپنے گھر کا راستہ بھی نہیں جانتا۔ بچے کی بات پہ تو آپ ہنستے ہیں لیکن ہمیں اپنا گھر ساری عمر کبھی یاد ہی نہیں آتا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ان کے ہاں کیوں ہے کہ وہ کبھی نہیں بھولتے؟ کہا کہ یہ اس لیے ہے کہ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ (24:41) ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی صلوٰۃ کو اور اپنی اپنی تسبیح کو جانتا ہے۔ اب ہم صلوٰۃ کو اور تسبیح کو دیکھتے ہیں کہ صلوٰۃ اور تسبیح کے یہ الفاظ کہاں آ رہے ہیں۔ صلوٰۃ کے معنی ہوتے ہیں: ''فرائض منصبی' قانون کا اتباع''۔ اور

تسبیح کے معنی ہوتے ہیں: پوری توانائی سے تگ وتاز کرنا۔ اس طرح اس آیت کے معنی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ میرا فریضہ منصبی کیا ہے اور اس فریضہ کے حاصل کرنے کے لیے مجھے کس طرح تگ وتاز کرنا ہے' سرگرداں رہنا ہے' میرا وہ دائرہ عمل کونسا ہے؟ ان میں سے ہر ایک اسے جانتا ہے۔ وہ اپنی صلوٰۃ کو بھی جانتا ہے اور اپنی تسبیح کو بھی جانتا ہے۔

عرب یا عراق میں تسبیح کے استعمال کی کیفیت

اب اگر اس صلوٰۃ کا مفہوم صرف یہ نماز لے لیجیے تو اتنی سی بات ہوگئی جو مسجد کی چار دیواری میں آپ ادا کرتے ہیں اور اس کے بعد آپ کی زندگی کا اتنا لمبا چوڑا دائرہ ہے' اس کے اندر پھر آپ کی یہ صلوٰۃ نہیں آتی۔ تسبیح تو اس سے بھی زیادہ سمٹ جاتی ہے کہ کسی گوشے میں بیٹھ کر تسبیح کرتے ہیں لیکن سنا یہ ہے کہ وہاں عرب کے اندر یا شاید عراق کے اندر ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ تسبیح کسی گوشے میں بیٹھ کر نہیں کرتے۔ وہ تو یوں ہے کہ جیسے چھڑی ہاتھ میں ہوتی ہے' اس طرح تسبیح ہاتھ میں ہوتی ہے' جھوٹ بولے جائیں گے' فریب دیئے چلے جائیں گے لیکن تسبیح پہ کھٹا کھٹ ہوتا چلا جائے گا۔ یہ آٹو میٹک (Automatic) ہے جیسے کہ اس میں سیل لگا رکھا ہوتا ہے۔ تسبیح اور مسجد کی چار دیواری کے اندر صلوٰۃ کی کچھ رکعتیں ہوئیں اور پھر مذہب کی دنیا میں ہمارے ہاں لوگ آئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اہل قرآن [1] ہیں۔ ساری تگ وتاز کا ماحصل کیا ہے؟ یہ کہ نماز تین وقت کی ہے' پانچ وقت کی نہیں ہے۔ بس یہ اہلِ قرآن ہوگئے' نمازوں کا وقت بتانے کے لیے' صلوٰۃ کا مفہوم بتانے کے لیے نہیں۔ مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے کہ حرکات وسکنات' جو محسوس اور مرئی ہوتی ہیں' بس وہاں تک نگاہ جاتی ہے' مفہوم اور مقصد کی طرف نگاہ نہیں اٹھتی۔ ان سے پوچھیے تو سہی کہ یہ **كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ** (24:41) ان میں سے ہر پرندہ' خارج کی ہر شے' اپنی صلوٰۃ جانتی ہے' اوکنیاں رکعتاں پڑھدے نیں ساری زندگی۔ [2] میں نے کہا ہے کہ پوچھیے ہی نہیں' میں تو خون کے آنسو روتا ہوں جب یہ چیز دیکھتا ہوں کہ خدا خدا کر کے کوئی اٹھے' جنہوں نے کہا کہ ہم صرف قرآنِ خالص کو مانتے ہیں۔ ان قرآنِ خالص کو ماننے والوں کی ساری عمر اس بحث کے اندر گزر گئی کہ نمازیں پانچ نہیں' تین ہیں' دو رکعتیں ہیں' ایک رکعت میں ایک ہی سجدہ ہے۔ اسی بحث میں ساری عمر گزر گئی۔ ''او پنج پڑھن نال جو کچھ او جیہڑا اے' تن پڑھن نال کی سنور گیا اے تہاڈا۔ او بہدے نالوں دو زیادہ ای پڑھدے سن نا' گھٹ تے نہیں سی پڑھدے۔ چلو او جیہڑیاں دو نیں' تسی اناں نوں تے چھڈو۔ تن تے باقی رہیاں۔ کہنے لگے: جی' نہیں۔ پنج پڑھن نال مسلمان نہیں رہندا۔ [3]

---

[1] یہاں اہلِ قرآن فرقہ کی طرف اشارہ ہے۔

[2] یہ ساری عمر کتنی رکعتیں پڑھتے ہیں۔

[3] پانچ نمازیں پڑھنے سے جو کچھ' جیسا بھی ہے' وہ تو ہے ہی' تین نمازیں پڑھنے سے آپ کا کیا کچھ سنور گیا! وہ تو اس سے دو زیادہ ہی پڑھتے ہیں' کم تو نہیں پڑھتے۔ چلو وہ جو دو پڑھتے ہیں' انہیں تو چھوڑیئے' تین تو باقی رہیں۔ کہنے لگے کہ جی نہیں۔ پانچ پڑھنے سے مسلمان نہیں رہتے۔

قرآن کی طرف آنے والوں کا فریضہ اور ہمارے مذہبی عقائد

قرآن کی طرف آنے والے کے لیے ضرورت تھی کہ وہ بتاتا کہ نماز اور صلوٰۃ میں فرق کیا ہے؟ صلوٰۃ کا نتیجہ کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ صلوٰۃ فحشا اور منکر سے روک دیتی ہے۔ یہ بتانا چاہیے تھا کہ وہ کونسی صلوٰۃ ہے جو قرآن کی رو سے برائیوں سے' فحشا سے' بے حیائیوں سے' منکرات سے' روک دیتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پانچ پڑھو تو پھر برائیاں ورائیاں عام ہو جاتی ہیں' تین پڑھو تو پھر ان سے یہ روک دیتی ہے۔ مذہب میں یہ بحثیں چل نکلتی ہیں کہ یہ تسبیح نہ پڑھو' یہ تسبیح پڑھو' اور یوں الحمد نہ پڑھو' یوں پڑھو' بس اس طرح سے یہ ہوتا چلا جاتا ہے' یہ دو رکعتیں ہیں ایک سجدہ ہے' اس میں یہ پڑھنا چاہیے' سجدے اتنے ہیں۔ اس صلوٰۃ کا ماحصل بھی وہی ہے جو اُس صلوٰۃ کا ہے: وہی دیرینہ بیماری' وہی نامحکمی دل کی۔ کیا ان چیزوں سے اصلاح ہوتی ہے؟ یہ تو پھر مذہب ہی کا ایک ٹکڑا ہو گیا۔ یہاں کہا ہے کہ **كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ** ❶ (24:41) اور اس کے بعد کہا کہ **وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ** (24:41) اور خدا یہ چیز جانتا ہے' اس کی نگاہ میں ہے' اس کے علم میں ہے کہ کس نے کیا کرنا ہے۔ اسی مرغی کے نیچے' جیسا میں مثال سے کہا کرتا ہوں' بطخ کے اور مرغی کے مخلوط انڈے رکھ دیجیے' اپنے وقت پر ان دونوں انڈوں سے چوزے نکلیں گے' مرغی کا چوزہ پانی کی طرف سے بھاگ کر' خشکی کی طرف' ماں کی طرف آئے گا' بطخ کا چوزہ انڈے سے نکلتے ہی خشکی سے دوڑ کر پانی کے اندر جائے گا۔ ان کے سارے بچے ابتدا سے' پیدائش کے ساتھ سے ہی' نور خداوندی کا اتباع کرتے ہیں۔ یہی وہ روشنی ہے جس سے اشیائے کائنات اپنی اپنی منزلوں اور ان تک لے جانے والے راستوں' سے واقف ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ **وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ** (24:42)۔ خارجی کائنات ہو یا انسانوں کی زندگی ہو' اس میں قانون تو خدا ہی کا ہے۔ خارجی کائنات میں تو خدا کے سوا کسی دوسرے کے قانون کا اتباع نہیں ہوتا' البتہ انسان یہ کچھ کرتا ہے لیکن اس سلسلہ میں خدا کا فرمان ہے کہ یہ کر کے دیکھ لے' ہر طرف سے ناکامیوں' نامرادیوں' تباہیوں' ہلاکتوں کے بعد' اس نے اِدھر ہی آنا ہوگا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ پھر قرآن ان حقائق کو سمجھانے کی خاطر خارجی کائنات کی مثال دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے اس نے پرندوں کی یا حیوانات کی مثال دی تھی۔

---

❶ کائنات کی ہر شے' اپنے اپنے فریضہ زندگی (صلوٰۃ) کو بھی جانتی ہے' اور اپنے سعی و عمل کے دائرے (تسبیح) کو بھی پہچانتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کا فریضہ حیات کیا ہے اور اسے اس نے کس طرح سرانجام دینا ہے' چنانچہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہر وقت سرگرم عمل رہتی ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔806)

خارجی کائنات میں واٹر سپلائی کی مثال

اگلی آیت میں فرمایا کہ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُزۡجِیۡ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیۡنَہٗ ثُمَّ یَجۡعَلُہٗ رُکَامًا فَتَرَی الۡوَدۡقَ یَخۡرُجُ مِنۡ خِلٰلِہٖ ۚ وَ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ جِبَالٍ فِیۡہَا مِنۡ بَرَدٍ (24:43) ذرا دیکھو تو سہی کہ یہ ہمارا نظامِ واٹر سپلائی کیا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ جعلنا من المآء کل شیء حی (21:30)۔ زندگی کا مدار پانی پر ہے۔ اب اس نے یہ کائنات بنائی' کرّہ ارض پر تمام جاندار پیدا کیے' اسی میں انسان بھی ہیں لیکن اس کے لیے جو پانی یہاں رکھا ہے وہ تو سمندر کا ہے' جس کا اگر کوئی اچھا بھلا انسان گونٹ بھی پی لے تو اس کی موت واقع ہو جائے یا بیماری تو ضرور آ جائے' لہٰذا پانی تو یہ تھا۔ اب زندگی عطا کی ہے لیکن پانی اس قسم کا ہے۔ دوسرے انتظام کو چھوڑ دیجیے۔ اس نے کہا تھا کہ ہم صرف خالق ہی نہیں ہیں کہ بنا کے چھوڑ دیا' بلکہ ہم تو رازق بھی ہیں' جس سامان پہ زندگی کے تمام سہارے ہیں وہ سامان بھی ہم دیتے ہیں۔ پہلا سامان جو ذریعہ زندگی ہے وہ پانی کا ہے۔ کہا کہ دیکھو! اس کا انتظام ہم نے کیا کر رکھا ہے؟ اسی سمندر کا کھاری پانی ہے' وجہ ہلاکت ہے۔ ہمارے سورج کی کرنیں ہیں جن میں تمہارا کچھ دخل نہیں ہے۔ ہمارا نظام دیکھیے' ہمارے سورج کی کرنیں جو Distilled Water ہے یعنی اس میں سے کشید کیا ہوا پانی ہے' وہ ڈول بھر کے اوپر لے جاتے ہیں۔ پانی تو ہوا سے بھاری ہوتا ہے' وہ تو اوپر جا ہی نہیں سکتا۔ زورِ دروں سے فوارے کو اوپر لے جایئے۔ جب بھی وہاں سے نیچے کا زور ختم ہو گا وہ پانی نیچے آ گرے گا۔ تو اگر یہ پانی کی شکل میں اوپر جائے تو وہ تو ٹھہر ہی نہیں سکتا تھا۔ کہا کہ یہ اس شکل میں جاتا ہے جو ہوا سے بھی ہلکا ہوتا ہے۔ اوپر جاتا ہے تو الگ الگ حصے ہوتے ہیں' پھر آہست آہستہ ہم ان کو چلاتے ہیں' تو وہ ساتھ ملتا ہے تو اور زیادہ گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد آگے جاتا ہے تو اس مقام پہ جس پہ وہ فطرت کا قانون ہوتا ہے' وہاں ٹھنڈک اتنی ہوتی ہے' کچھ وہ پہلے بھاری ہو چکتا ہے۔ یہ جو چیز اس نے کہی ہے وہ یہ ہے: یُؤَلِّفُ بَیۡنَہٗ (24:43)۔ یہ ایک دوسرے کے اندر مدغم ہو جانا ہے۔

جماعت مومنین کی یہ صفت بتائی تھی کہ اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ (3:103) جماعت مومنین کے افراد کے دل آپس میں ایسے ملے ہوئے ہوتے ہیں جیسے بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے میں ملا ہوا۔ وہاں یہ پانی بھاری ہو جاتا ہے۔ ایک خاص ٹمپریچر پر پانی بھاپ بنتا ہے پھر یہ خاص ٹمپریچر پر ٹھنڈا ہو جاتا ہے' ایسا ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ پھر وہ بھاپ پانی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہوا سے بھاری ہوتا ہے' وہ نیچے اترتا ہے۔ کہا کہ یہ تو وہ ہو گیا کہ ایک دم سے وہ بارش ہو گئی۔ وہ اوپر سے اتر گیا' وہ بادل پھر اس وقت ختم ہو گئے تو پھر اس کے پانی کی ضرورت ہے۔

یہ مستقل واٹر سپلائی کیا ہے؟ کہا کہ اس کے بعد اسی میں سے ہم ایک حصہ جو باقی ہوتا ہے پہاڑیوں کی چوٹیوں کے اوپر برف کی شکل میں رکھ دیتے ہیں۔ یہ Permanent overhead water tank ہے' جب سردیاں ختم ہو جاتی ہیں' گرمیاں آ جاتی ہیں' پانی کی زیادہ

ضرورت ہوتی ہے‘ وہی ہمارا سورج جو سمندر سے اس طرح سے اڑا کے لے جاتا ہے‘ وہ اس پہاڑیوں کی چوٹیوں کے پانی کو پگھلا کر تمہارے ہاں آگے لے آتا ہے‘ اور ایسا صاف اور شفاف پانی تو کہیں ملتا ہی نہیں ہے۔ یہ Distilled water (کشید شدہ پانی) کی ایک بوتل اتنی سی وہ ہوتی ہے۔ کیندے نیں پتہ نہیں کنے پیسیاں دی دیندے نیں۔ ❶ تمہارے گھر کے سامنے سے یہ Distilled water (کشید شدہ پانی) چلا آ رہا ہے جسے اس نے سلسبیل کہا ہے‘ راستہ چلتا جاتا ہے‘ آواز دیتا جاتا ہے کہ جس کو ضرورت ہے آ جاؤ‘ بھر لو‘ اپنا ڈول بھی لے آؤ‘ اپنی دیگچی لے آؤ‘ بھئی! کیا بات ہے‘ خود پوچھتا جاتا ہے! بہناں کوئی پانی دی لوڑ تے نہیں ہیگی۔ ❷ اور یہ سبیل چلتا جاتا ہے پھر اس میں سے وہ جو زائد ہوتا ہے‘ نہاتے ہو۔ دھوتے ہو‘ پانی ضائع کر دیتے ہو‘ وہ کہتا ہے کہ ضائع کرنے والی بات نہیں ہے۔ وہ فلٹریشن (تقطیر) کے ذریعے سے دوسرا عمل ہوتا ہے: ایک کشید کا ہوتا ہے‘ ایک فلٹریشن کا ہوتا ہے۔ فلٹریشن کے ذریعے سے اس کو زمین کے نیچے لے جاتے ہیں۔ تم تو اس کو پھینک دیتے ہو۔ اسی تہاڈے لئی سانبھ لیندے آں۔ ❸ پھر وہ وہاں جمع کر دیتا ہے‘ وہ اوپر کی تمام کثافتوں اور غلاظتوں سے محفوظ رہتا ہے‘ ٹھنڈا رہتا ہے‘ جب جی چاہے‘ تمہیں صرف کچھ کھودنا پڑتا ہے پھر اس میں نکالتے چلے جائیے۔

کہتا ہے کہ نہ سمندر کا پانی انکار کرتا ہے کہ میں اوپر نہیں جانا چاہتا‘ نہ وہ جو کرنیں لے جاتی ہیں وہ ان کو اپنے ہی لیے سنبھال لیتی ہیں کہ اسی دوسرے نوں کیوں دیئے اپنے گھر کیوں نہ رکھ لیے Personal property بنا کے ❹۔ وہ کرنیں (Rays) جمع کر کے نہیں رکھتیں بلکہ آگے چلا دیتی ہیں‘ پھر وہ ہر ایک کے لیے برس پڑتی ہیں اور جو زائد پانی برف کی شکل میں ہوتا ہے‘ اسے سنبھال کر پہاڑوں کی چوٹیوں‘ پر سب کے لیے رکھ لیا جاتا ہے اور پھر یہاں سے جس وقت جس کا جی چاہے نکالے: **فَيُصِيبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ** (24:43)۔ اب یہاں یہ صورت ہے کہ تم میں سے جو چاہے اس سے یوں فائدہ اٹھالے‘ جو چاہے روگردانی کر لے۔ کیا بات ہے!

بادلوں میں چمکنے والی بجلی کی توانائیوں کی افادیت

آگے کہا کہ **يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ** (24:43)۔ انہی بادلوں سے وہ بجلی چمکتی ہے۔ تم تو یہی سمجھتے ہو کہ یہ آنکھوں کو اچک کر لے جانے والی ہے۔ یہ غلطی کرتے ہو‘ تمہیں پتہ نہیں کہ اس کے اندر کتنی توانائیاں محفوظ ہیں۔ آج تو وہ توانائیاں ہیں‘ جنہیں انسان مسخر کر رہا ہے۔ یہ جو Electricity (بجلی) ہے‘ اس کا تو پوچھو نہیں‘ اس نے دنیا میں انقلاب کا ایک طوفان برپا کر دیا ہے‘

---

❶ کہتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ وہ کتنے کی دیتے ہیں۔

❷ اے بہن! کیا آپ کو پانی کی ضرورت تو نہیں ہے؟

❸ ہم تمہارے لیے سنبھال لیتے ہیں۔

❹ ہم دوسرے کو کیوں دیں؟ کیوں نہ اپنی ذاتی جائیداد بنا کر اپنے ہی گھر میں رکھ لیں؟

دنیا کے اندر اس کی اوریجن (Origin: منبع) تو وہ تھی جس سے نگاہوں میں خیرگی پیدا ہوتی ہے۔ کہا کہ اور آگے بڑھیے: **يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ** [1] (24:44)۔ دن کو الٹتے ہیں تو رات آجاتی ہے' رات کو یوں الٹ دیتے ہیں تو دن کی نمود ہو جاتی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ کرہ ارض کی گردش سے' رات اور دن کے اختلاف کا نام' انقلاب یا تقلیب یا الٹ دینا رکھا ہے یعنی یہ زمین کے یوں الٹنے سے ہی ہے آپ کو دن اور رات کا اختلاف نظر آ رہا ہے اور الٹنا ایسا ہے کہ ''اوپر والوں کو'' ''یا نیچے والوں کو'' پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس وقت یہ انقلاب آ گیا۔ ذہنی انقلاب ایسے ہی آیا کرتا ہے۔ اس کے برعکس جو آتا ہے وہ فساد ہوتا ہے' آتا کچھ نہیں ہے' دہائی اینچ ای پاندار ہندا اے۔ [2]

قرآن نے اختلافِ لیل ونہار کو آیات اللہ کہا ہے

عزیزان من! **يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ** (24:44) قرآن کریم نے اس اختلافِ لیل ونہار کو ''من آیات اللہ'' کہا ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ میں پھر عرض کرونگا میں اس وقت کیا سمجھاوں یہ ٹائم یا جسے آپ وقت کہتے ہیں' جسے زمان کہتے ہیں' یہ بہت بڑی چیز [3] ہے۔ ہم تو اس سے سمجھ ہی نہیں سکتے لیکن یہ وقت ماپنے (Measurement) کا پیمانہ ہوتا ہے۔ مثلاً آج جمعہ ہو گیا' جی! پچیس تاریخ ہو گئی۔ یہ کیسے ہو گیا' کل رات جمعرات تھی؟ ہم نے کہا تھا!! پھر رات درمیان میں آ گئی' اس کے بعد پھر اگلی صبح ہوئی۔ جسے ہم کہتے ہیں اگلی ' یہ صبح درمیان میں رات آئی ہے تو اگلی صبح ہے۔ رات نہ آئے تو اگلی صبح ہی نہ آئے' دوسرا دن ہی نہ چڑھے' تاریخ ہی نہ بدلے' نہ ہی آپ دنوں کا نام رکھ سکیں۔ اس اختلافِ لیل ونہار نے کتنا آسان کر دیا! میں نے کہا کہ یہ ذرا مشکل مسئلہ ہے۔ اگر آپ ذہن پہ زور دیدیں اور سوچیں کہ اگر درمیان میں دن اور رات نہ ہو تو ہماری کیفیت کیا ہو؟ سارا کاروبار ہی رک جائے' آپ کے ہاں دنوں کی یہ گنتی بھی نہ رہے۔ آپ اس گردشِ لیل ونہار کا برگسان [4] سے پوچھیے کہ اُس نے درمیان میں جو یہ چیز کہہ دی ہے' وہ کیا ہے؟ یہ ٹائم (زمانہ) ہے۔ یہ

---

[1] خدا کا قانون دن اور رات کو گردش دیتا رہتا ہے (کہ ایک کے بعد دوسرا آجاتا ہے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن)

[2] یہ یونہی دہائی مچاتا رہتا ہے۔

[3] اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھئے پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' 2006۔

[4] Bergson,Henri (1859-1941) is a French Philosopher. The central item in Bergson`s philosophy is the opposition between the life-force and material world. He also assigned an important role to intuition,as opposed to the rational intelligence, in man`s perception of reality. Among his best-known works are Time and Free Will (1889), Creative Evolution (1907), and The Creative Mind (1934) (Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader`s Digest Association Limited P.156).

فلسفے کا مسئلہ ہے۔ ایک ہوتا ہے Duration Next Time یعنی وقت کہ جس کے اندر یہ Duration (دورانیہ) نہیں ہوتا مثلاً ایک گھنٹہ ہو گیا' دو گھنٹے ہو گئے' دن ہو گیا' رات ہو گئی۔ یہ وہ چیز ہے۔ مثلاً آپ رات کو سوتے ہیں' صبح اٹھتے ہیں۔ آپ کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے اندر کتنا وقت ہو گیا ہے یا غشی کے عالم میں تو چھ چھ مہینے بھی گزر جاتے ہیں۔ جب آدمی نیند سے اٹھتا ہے' غشی سے ہوش میں آتا ہے' تو اسے اس کا کچھ احساس نہیں ہوتا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ یعنی وقت گزر گیا ہوتا ہے' Duration (دورانیہ) محسوس نہیں ہوتا۔ یہ برگسان کی اصطلاح ہے کہ دن اور رات کے اختلاف نے اس Duration Next Time کے گز (Yard) پہ گرہوں کے نشان لگا دیئے ہیں جس سے وقت ماپا (Measure) جاتا ہے اور وقت کا جو ماپنا ہے اسے وہ Serial Time کہتے ہیں: مثلاً جیسے ایک لائن کے اوپر لگائے ہوئے نشان۔ کہا کہ وقت کے گز کے اوپر جو یہ نشان لگے ہیں' اس گنتی کے اوپر یہ سارا حساب کتاب کا' انسان کی تمدنی دنیا کا' دارومدار ہے۔ آپ غور کیجیے اگر درمیان میں کہیں دنوں کی' تاریخوں کی' وقت کی' مہینوں کی' سال کی' گنتی نہ آئے تو کوئی کام ہی نہیں چل سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ اس میں یہ اربابِ نظر ہی ہیں جو حقیقت میں اس چیز کو Appreciate (پسند) کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ جو خدا نے دن اور رات کو آیات اللہ کہا ہے' یہ بڑی چیز ہے۔ یہ اختلافِ لیل ونہار ہے' جس سے یہ جو Duration Next Time ہے' وہ Serial Time بن جاتا ہے۔ ارے! ہم کیا سمجھیں گے کہ وہ کیا کہہ گیا ہے! یہ ہے۔ **یقلب اللہ الیل والنھار**. اب سوال یہ ہے کہ یہ کا ہے کے لیے ہے۔ کہا کہ **اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً لِّاُولِی الۡاَبۡصَارِ** (24:44)۔ یہ فی ذاتہ کوئی بات نہیں ہے کہ یہ دن آ گیا' یہ رات آ گئی' اس کے بعد پھر اور دن آ گیا۔ عبرت کہتے ہیں کسی ایک محسوس شے کے اوپر کھڑے ہو کر بڑی حقیقت تک پہنچ جانا۔ یہ تو ان کو عبور کرنا ہے۔ یہ عبرت کا لفظ وہیں سے ہے۔ **اَلۡمِعۡبَرُ** پل کو کہتے ہیں۔

حقیقت تک پہنچنے کے لیے آیات اللہ ایک پل کا کام دیتی ہیں

کیا ہوتا ہے؟ راستہ چلتے ہوئے دریا آ جاتا ہے' آپ اِدھر کھڑے ہوئے اُدھر جا ہی نہیں سکتے۔ اب درمیان میں اس کے اوپر پل بنا دیا جاتا ہے کہ جس سے آپ یہاں سے وہاں پہنچ جائیں جہاں آپ نے پہنچنا ہے۔ آپ ادھر سے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ دیکھیے یہ عربی زبان ہے' اس سے انہوں نے یہ عبرت کا لفظ نکالا' جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک محسوس واقعہ جو آپ کے سامنے آئے' اس پہ غور کر کے اس حقیقت تک پہنچ جایئے جس کے لیے وہ واقعہ آیا ہے۔ اسے عبرت کہتے ہیں یعنی درمیان میں پل آ جائے کہ یہ جو چیزیں ہم بیان کر جاتے ہیں کہ دن اور رات کی گردش بھی خدا کی آیات میں سے ہے' یہ عبرت کی بات ہے' یہ بجائے خویش کوئی مقصود بالذات چیز نہیں ہے' اس پہ تم غور کرو گے تو ایک بڑی حقیقت تک پہنچو گے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس پر کون پہنچے گا؟ خود ہی کہا کہ **لِاُولِی الۡاَبۡصَارِ** (24:44) جو آنکھیں کھلی رکھے گا وہی دن اور رات کا اختلاف پہچانتا ہے۔ کیا بات ہے ابصار کی! یہاں اندھے کو کیا پتہ ہے کہ دن کب چڑھا اور رات

کب آ گئی؟ اسی لیے کہا کہ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ (24:44) ان آفاقی قوانین میں ارباب نظر کے لیے ایسا سامانِ بصیرت موجود ہے جس سے وہ خارجی کائنات سے آگے بڑھ کر خود انسانی معاشرہ کی طرف آسکتے ہیں۔

علم وشعور کی یہ ساری شعائیں ''Dark Age'' (دورتاریک) کی ہی رہینِ کرم ہیں

قرآن نے جو رات اور دن کی مثال دی ہے' عزیزان من! اس محسوس مثال میں بھی غور وفکر کا بڑا سامان ہے لیکن جو آنکھیں بند کیے ہوئے ہو اس کو فرق نظر نہیں آ سکتا چہ جائیکہ اس محسوس مثال سے کوئی سبق حاصل کرے۔ یہ سب کچھ حقیقت تک پہنچنے کے لیے ہی وہ کہتا ہے لیکن جو عقل وفکر کی آنکھیں بند کرتا ہے اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی۔ یہ عبرت ہے۔ عبرت کا لفظ ہے۔ اگر وہ پل کے اسی کنارے پہ کھڑا رہے تو ساری عمر اگلے کنارے پہ نہیں پہنچ سکتا۔ عبرت یہ کام کرتی ہے کہ انسان راستے کے موانع (Barriers) کو عبور کر لیتا ہے۔ اس میں عبرت ہے۔ یہی لاولی الابصار (24:44) ہے اور کہا کہ یہی وہ پانی ہے جس سے وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّن مَّآءٍ (24:45) اللہ نے اپنے قانون کے مطابق' ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا چودہ سو سال پیشتر اس زمانے کو ہی آج کے زمانے کے مقابلے میں ''Dark Age'' (دورِ تاریک) کہتے ہیں؟ اس میں وہ خطہ عرب ہی ایسا ہے جس میں لکھنے پڑھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ Education (تعلیم) تو بڑی چیز ہے۔ Literacy جسے آپ لکھنا پڑھنا کہتے ہیں' نوشت وخواند کہتے ہیں' اس زمانے میں مکے کا اتنا بڑا شہر تھا' جو مرکزی مقام تھا' اس میں بھی ظہورِ اسلام سے پہلے سترہ آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہ ہے اس قوم میں وہ چیز کہ زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی۔ اٹھارویں یا انیسویں صدی میں جا کے انسان یہاں پہنچا ہے۔

زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے

آپ اگر یہ کہتے ہیں کہ جب ڈارون [1] سے تحقیق ہوئی ہے کہ بھئی! زندگی کیسے Start (شروع) ہوئی ہے تو وہاں سے یہ بات پہنچی

---

[1] Darwin, Charles Robert (1809-82) is a British naturalist who revolutionised biological theory by putting forward his theory of evolution based on natural selection. His views, formed after his comprehensive observations of fossils and the diverse plant and animal life during his voyage (1831-36) round South America and the Pacific as naturalist on H.M.S.Bealge, were published in "On The Origin of Species." His Conclusions conflicted with received Christian opinion on the creation of the world, and caused much controversy, especially where, as in his "The Descent of Man (1871)," evolutionary theories were applied to human origins. (Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader`s Digest Associtaion Limited, P.397).

ہے کہ پانی سے اس کی ابتدا ہوئی۔ جب یہ مٹی پانی میں ملتی ہے یعنی آپس میں کوئی شے ایسے ملتی ہے جس میں لائف (زندگی) نہیں ہوتی، وہ شے جب پانی سے ملتی ہے تو طین لازب بنتی ہے یعنی چپ چپی مٹی بنتی ہے۔ اس پر جب حرارت پڑتی ہے تو اس میں سے جو ایک جرثومہ نکلتا ہے، وہ لائف (زندگی) کی ابتدا ہوتی ہے۔ قرآن چودہ سو سال پہلے کہہ رہا ہے کہ ہر ذی حیات کی ابتدا، زندگی کی ابتدا، پانی سے ہوئی ہے۔ آج بھی آپ کو معلوم ہے کہ یہ چاند پہ جاتے ہیں، مریخ پہ جاتے ہیں، وہاں سے جو مٹی کھود کر لاتے ہیں، اور چیزوں کے علاوہ دیکھتے یہ ہیں کہ وہاں زندگی ہے، کوئی شے زندہ ہے، اس کے لیے وہ کیا دیکھتے ہیں، کیا ٹیسٹ کرتے ہیں؟ یہ کہ اگر اس مٹی میں نمی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ وہاں زندگی ہو سکتی ہے، نمی نہیں ہے تو کہتے ہیں کہ چھوڑ دیجیے وہاں زندگی نہیں ہے۔ قرآن چودہ سو سال پہلے کہتا ہے کہ زندگی کی ابتدا تو ہم نے پانی سے کی۔ دآبۃ ہر ذی حیات چلنے والا ہے۔ دآبۃ میں سب آ جاتے ہیں۔ پھر آگے یہ کہا کہ **فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ** (24:45)۔ اور دیکھو پھر اس کے بعد زندگی کی ابتدا ایک جرثومہ حیات سے ہوئی جو بظاہر Naked Eye [1] (خالی آنکھ) سے نظر بھی نہیں آتا، مائیکروسکوپ کے نیچے رکھ کر دیکھنا پڑتا ہے۔ کہا کہ یہاں سے اس کی ابتدا ہوتی ہے، بالکل ایک جیسے وہ جرثومے ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ آگے دیکھیے شاخ در شاخ زندگی ہوئی تو اسی میں سے دو پنجوں والے، رینگ کر چلنے والے، اڑنے والے، چوپائے، دو دو پاؤں والے، یہ سارے اسی ایک جرثومے سے نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ کہا کہ یہ ہے اس کا قانون۔ یہ کچھ یوں بن رہے ہیں کہ ان میں کوئی بھی کفر اختیار نہیں کرتا، یہ سب مومن ہوتے ہیں۔ آگے کہا کہ **يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ** [2] (24:45) یہ خدا کا قانونِ مشیت ہے جس کے مطابق یہ تخلیق ہوتی چلی آتی ہے لیکن وہ پھر یہ نہیں ہے کہ یونہی علی الرغم کہہ دیتے ہیں تو یہ ہو جاتا ہے۔ یہاں مایشآء کہنے کے بعد کہا کہ ٹھیک ہے، ہم کہتے ہیں یہ یوں بن جائے، اور وہ یوں بن جائے، چل بھئی! نہیں، یہ بات یوں نہیں ہے کہ ہم یوں کرتے ہیں تو دو ٹانگوں والا ہو جاتا ہے اور یوں کرتے ہیں تو چار والا ہو جاتا ہے۔ نہیں، نہیں، مایشآء سے یہ نہ سمجھ لینا کہ یونہی علی الرغم کہہ دیتے ہیں تو یہ ہو جاتا ہے۔

قرآن فکر انسانی کے لیے ایک روشن چراغ ہے

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (24:45) ہم نے ہر شے کے پیمانے اور قاعدے مقرر کیے ہوئے ہیں اور ان سب پر اسی کا کنٹرول ہے۔ اور پھر یہ سب کچھ کہنے کے بعد کہا کہ **لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ** (24:46) دیکھو! کس قسم کے روشن دلائل اور روشن قوانین ہم نے دیئے ہیں۔ یہ وہ کتاب نور ہے جو خود روشن ہے، اور روشن کرنے والی ہے، خود واضح ہے اور ہر چیز کو واضح کرنے والی ہے

---

[1] اربابِ نظر و فکر کے لیے یہ کتاب پر از معلومات ہے:

Morris, Desmond (1969). The Naked Ape. N.Y: Mcgraw-Hill Book Company.

[2] اللہ اپنے قانونِ تخلیق کے مطابق، جو چاہتا ہے پیدا کرتا رہتا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن)

جس کو ہم نے نازل کیا ہے۔ نور کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ نور خود روشن ہوتا ہے' وہ خارج سے کسی روشنی کا محتاج نہیں ہوتا۔ کبھی جلتے ہوئے بلب کے لیے یہ نہیں کہا کہ ''اندروں موم بتی لے آؤ''۔ دیکھیں بلب کتھے ہیگا[1]۔'' ایک لفظ کے اندر یہ ہے کہ قرآن کیا بات رکھ جاتا ہے! مبین کے اندر یہ ہے کہ خود روشن ہے اور جو خود روشن ہے ہر شے کو روشن کرتا ہے۔ یہ ہے جو ہم نے آیات بھیجیں اور کہا تھا کہ ہدایت دیتے ہیں: وَ اللّٰہُ یَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (24:46)۔

ہمارے ہاں کے غلط تراجم کا ماحصل

اب اس کے بعد پھر اس آیت یعنی (24:46) کا وہی ترجمہ ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیدیتا ہے یعنی اس نے روشنی تو پھیلا رکھی ہے' آیاتِ مبیّنٰت ہیں' واضح روشن روشن کرنے والی ہیں' یہ سب کچھ بھی ہے' انسان کو آنکھیں بھی دیدی ہیں' اور اس کے بعد پھر یہ کہا ہے کہ جسے ہم سیدھے راستے پہ چلاتے ہیں وہی چل سکتا ہے۔ ''تے آسارا سیاپا کا دے لئی کیتا اے[2]''۔ یعنی اگر آخر میں بات یہی ہونی تھی کہ وہی سیدھے راستے پہ چل سکتا ہے جسے ہم چلائیں تو یہ کیفیت تو اندھے کے متعلق ہوتی ہے' اس کی آنکھیں تو نہیں ہوتیں' باہر کی روشنی اسے کوئی کام نہیں دیتی' اسے آپ چلائیں گے تو وہ چلے گا' آپ نہیں چلائیں گے وہ صحیح راستے پر نہیں چلے گا۔ جب پیدا ہی سارے اندھے کیے تو پھر روشنی کاہے کے لیے پیدا کر دی؟ آپ غور کیجیے! اندھے کے لیے تو روشنی کی ضرورت ہی نہیں۔ بیکار شے ہے' وہ خود نہیں چل سکتا' روشنی میں اسے کوئی دوسرا چلاتا ہے اور اگر یہی بات ہے کہ پھر جسے ہم کہتے ہیں' اس کو صحیح راستے کے اوپر ہم چلاتے ہیں تو اس کے لیے روشنی کی ضرورت کیا ہے؟ کہا کہ یہ سارا کچھ ہم نے دیدیا' پیدا کر دیا۔ اب اس میں سے جو چاہے صحیح راستے کے اوپر چلے' جو چاہے غلط راستے کے اوپر چلے۔ کہتا ہے کہ پھر صحیح راستے پہ چلنا اور بات ہے۔ بات راستے کے اوپر چلنے کی ہے۔ اگر کیفیت یہ ہو کہ چورا ہے پر کھڑے ہو کر آپ کہیں کہ یہ راستہ ٹھیک شہر کی طرف ہی جاتا ہے اور ہم اقرار کرتے ہیں کہ یہ صحیح راستہ ہے جو ادھر جاتا ہے اور اس کے بعد جب چلے تو گلبرک کی سڑک کے اوپر چل نکلیں' تو کہتا ہے کہ بتاؤ اسے یہ صراط مستقیم کیا فائدہ دے گا۔

اب وہ ہماری طرف آ گیا۔ کہا کہ وَ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالرَّسُوۡلِ وَ اَطَعۡنَا (24:47)۔ یہاں یقولون آیا ہے' یعنی اپنی زبان سے یہ کہے جائیں گے کہ خدا پہ بھی ایمان لائے' رسول پہ بھی ایمان لائے' اور واقعی ہم اس کی اطاعت بھی کرتے ہیں یعنی یقولون وہ کہے جاتے ہیں اور اس کے بعد ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیۡقٌ مِّنۡھُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ (24:47) پھر انہی میں کا وہ گروہ بھی تم دیکھو کہ وہ اعراض برتتا ہے' روگردانی کرتا ہے۔ یہاں یتولّٰی ہے۔ اس میں کفر نہیں ہے۔ وہ زبان سے یہ کچھ کہتا چلا جاتا ہے مگر کسی دوسرے راستے کے اوپر

---

[1] اندر سے موم بتی لے آیئے۔ دیکھیں کہ بلب کہاں ہے۔

[2] تو یہ ساری مصیبت کاہے کو پیدا کی ہے؟

چلتا جارہا ہے۔ کہے چلا جارہا ہے کہ ''ہم اس کے صراط مستقیم پر ہیں' ہمارا ایمان ہے کہ سیدھا راستہ اس کا ہی بتایا ہوا ہے۔ ایمان ہے ہمارا ہم زبان سے کہے چلے جارہے ہیں۔'' تسبیح پھیرداتر یا جاندا پیا ہیگا [1]۔'' اس کے اعمال میں تیولیٰ ہے یعنی وہ اعراض برتتا ہے' گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ عجیب چیز ہے' یہ کفر سے الگ چیز ہے' کہتا چلا جاتا ہے کہ ایمان لایا۔ وہ کہتا ہے کہ وَ مَآ اُولٰٓئِکَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ (24:47)' یہ مومن نہیں ہے۔ مومن صرف کہن والا نہیں ہوندا۔ مومن تے کرن والا ہوندا اے [2]۔ اسی لیے یہاں وہ کہتا ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (61:2) جو کرتے نہیں ہو' کہتے کیوں ہو۔ پھر کہتے ہیں کہ نہیں جی' اگر کہیں نہیں تو کیا پھر کافر بن جائیں؟ لاحول ولاقوۃ۔ جی ہاں کیندے اس واسطے آں الحمدللہ نہ کہیے تے اسی مسلمان کس طرح رہیے [3] مگر قرآن کہتا ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ [4] (61:2)۔ اس نے کہا کہ آپ کو پتہ نہیں ہے لما کیوں کہتے ہو؟ کہتے ہیں کہ اس لیے کہتے ہیں کہ وَ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ ؕ وَ مَآ اُولٰٓئِکَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ [5] (24:47)۔ ہم نے کہا کہ تیولیٰ یعنی روگردانی کرتے ہیں' اعراض کرتے ہیں' گریز کی راہیں نکالتے ہیں۔ وہ ایک سیدھا متوازن راستہ ہے۔ یہ ایک بھی جو بیچ میں سے یوں پگڈنڈی نکل جاتی ہے' یہ تولیٰ ہوتا ہے۔ کہا کہ اس کا ٹیسٹ کیا ہے؟ جواب میں کہا کہ ٹیسٹ صاف ہے۔

قرآنی احکام پر عمل پیرائی مومن ہونے کا ثبوت ہے

ایمان کا ٹیسٹ یہ ہے کہ وَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ (24:48) تمہارے جتنے بھی اپنے اختلافی' متنازعہ فیہ معاملات ہوں' ان میں تم خدا کی اس کتاب سے فیصلہ کراؤ۔ لیحکم یہ ہے ایمان۔ یہ لفظ گننے کے لیے نہیں دیئے' یہ الفاظ زبان سے دہرانے کے لیے نہیں دیئے۔ یہ ہے کفر اور ایمان کا امتیاز۔ اور وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44)۔ زبان سے کہتے چلے جایئے: خدا پہ ایمان' رسول پہ ایمان' کتاب پہ ایمان ہے۔ اگر اس کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں ہوتی' اس کے مطابق فیصلے نہیں ہوتے' تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ کہا کہ یہ ہے ٹیسٹ۔ یعنی خدا اور رسول کی طرف کا ہے کے لیے ان کو بلایا جاتا ہے؟ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ (24:48) اپنے معاملات کے فیصلے کرانے کے لیے وَاِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ مُّعْرِضُوْنَ (24:48) ان

---

[1] تسبیح پھیرتا چلا جارہا ہے۔

[2] صرف کہنے والا مومن نہیں ہوتا۔ کرنے والا مومن ہوتا ہے۔

[3] جی ہاں' یہ اس لیے کہتے ہیں کہ اگر الحمداللہ نہ کہیں تو مسلمان کس طرح رہیں۔

[4] جو کرتے نہیں ہو کہتے کیوں ہو؟

[5] (یہ متوازن اور سیدھی راہ صرف ان لوگوں کو مل سکتی ہے جو ان قوانین کی صداقت پر دل سے یقین رکھیں اور پھر ان کے مطابق عمل کریں۔ لیکن) بعض لوگ (منافقین) ایسے بھی ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں' اور ان کی اطاعت بھی کرتے ہیں' لیکن اس کے بعد' ان کا ایک گروہ اس اطاعت سے روگردانی اختیار کر لیتا ہے۔ یہ درحقیقت مومن ہیں ہی نہیں۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ)

میں کا ایک گروہ ہے جس کے افراد اس میں اعراض برتتے ہیں' اس میں گریز کی راہیں نکالتے ہیں۔

عدالتوں میں گریز کے مختلف طریق

عزیزانِ من! گریز کی راہیں عدالتوں میں جا کے دیکھیے۔ پہلے تو یہ ہوا کرتا تھا کہ بھئی! ''فیصلہ شریعت دے مطابق چاہندے ہوئیا رواج دے مطابق؟ جی' ساڈے تے رواج دے مطابق کیندے ہیگے نیں' ساڈے بزرگاں توں اوہی تریا اوندا پیا ہیگا جناب!❶'' چلیے جی یہ بات ہوئی۔ اب اس کے بعد ذرا سی جھجک پیدا ہوئی تو انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں ہے شریعت کے مطابق بھی کہہ دیجیے۔ یہ بھی قرآن کے مطابق نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ فقہ حنفی کے اندر جو درج ہے جسے آپ رواج کہتے ہیں' یہ حکم شریعت کا ایک جزو گنا جاتا ہے۔ رواج کے مطابق فیصلہ' فقہ حنفی کی رو سے شریعت کے مطابق فیصلہ ہوتا ہے۔ کہا کہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں جی' لاحول ولا' کوئی بات ہے' ہم بھاگے ہوئے ہیں خدا اور رسول سے' اس کی کتاب سے' ہم اس کے مطابق چاہتے ہیں لیکن قرآن تو انسان کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑ لیتا ہے کہ پوچھو نہیں تے رب تے کتھے جان ای نہیں دیندا❷ **وَ اِنۡ یَّکُنۡ لَّہُمُ الۡحَقُّ یَاۡتُوۡۤا اِلَیۡہِ مُذۡعِنِیۡنَ** (24:49)۔ لیکن اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا' تو وہ اس کی اطاعت کے لیے لپک کر آتے ہیں۔

دلوں کا روگ اور اس کا علاج

عزیزانِ من! اگر یہ دیکھیں کہ قرآن کے مطابق فیصلہ کرانے میں ہمارا فائدہ ہے تو بھاگے ہوئے جاتے ہیں کہ جی! قرآن دے مطابق فیصلہ ہون ڈیا ہے۔❸ کہا کہ یہ روش کیا ہے؟ اگر کسی فیصلے میں قرآن کی رو سے نقصان ہو رہا ہے تو شریعت آ جائے گی' رواج آ جائے گا' اور اگر کہیں شریعت میں نقصان ہوگا تو کہیں گے کہ ہم ایماندار ہیں' قرآن کریم کے مطابق فیصلہ کے لیے کہیں گے کیونکہ اس میں انہیں فائدہ نظر آئے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ **فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ** (24:50) ان کے دل میں روگ ہے۔ مومنین کے لیے ان کی یہ روش بڑی تعجب انگیز ہے۔ ان کے دل میں رہ رہ کر یہ سوالات پیدا ہوں گے کہ بالآخر ان لوگوں کو ہو کیا گیا ہے؟ کیا یہ کسی نفسیاتی عارضہ میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے ان میں اس قدر تلون پیدا ہو گیا ہے۔ کیا دل میں روگ ہے؟ کیا یہ صورت ہے؟ اگر نہیں تو کیا؟ **اَمِ ارۡتَابُوۡۤا** (24:50) یا انہیں اس بات میں شک ہے کہ ہمارے ساتھ یہ جو کہتا ہے کہ یہ حق ہے' اس کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ کیا اس میں انہیں شک پیدا ہو گیا؟ **اَمۡ یَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّحِیۡفَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ وَ رَسُوۡلُہٗ** (24:50) یا انہیں یہ شبہ و خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر خدا اور رسول کی طرف

---

❶ فیصلہ شریعت کے مطابق چاہتے ہو یا رواج کے مطابق؟ جی' ہمارے ہاں تو رواج کے مطابق کہتے ہیں' ہمارے تو بزرگوں کے ہاں سے یہی آتا چلا آ رہا ہے۔

❷ رب تو کہیں اور جانے ہی نہیں دیتا۔

❸ جی' فیصلہ قرآن کریم کے مطابق ہو رہا ہے۔

اسلامی نظام کی طرف جائیں گے' اگر قرآن کے مطابق یہ فیصلہ ہوگا تو ہمارے ساتھ بے انصافی کریں گے۔ کیا یہ چیز ہے؟ کہا کہ نہیں' ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ بَلْ اُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (24:50) یہاں دیکھیں کہ ظٰلمون کا لفظ آ رہا ہے۔ بات ساری یہ ہے کہ جس مقام پہ کسی شے کو ہونا چاہیئے' یہ وہاں نہیں رہا۔ جس مقام پہ خدا کو ہونا چاہیے وہ وہاں نہیں رکھا گیا۔ بس انہوں نے ان چیزوں کے مقام بدل دیئے ہوئے ہیں۔ رواج نے شریعت کی جگہ لی' شریعت نے پھر خود کتاب اللہ کی جگہ لے لی۔ کتاب اللہ تلاوت کے لیے اور ثواب کے لیے رہ گیا۔ یہ قصہ ہوا۔ دین کی جگہ مذہب نے لے لی۔ یہ بس جگہیں بدلی ہوئی ہیں۔ انہوں نے جس مقام پہ کسی شے کو ہونا چاہیے تھا' اسے اس مقام پہ نہیں رکھا۔ چیزیں تو ساری ان کے ہاں ہیں' نام بھی ان کا لیتے ہیں' بس مقام بدل دیا ہے' جگہ بدل دی ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ قرآن Constitutuion of the Islamic Republic of Pakistan (آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان) ہوتا[1]' یہ قرآن اب الفاظ دہرا دینے کے لیے رہ گیا ہے۔ اس کا مقام بدلا ہے۔ زبان سے' قرآن کے اوپر ایمان کا جو لفظ ہے' وہ ان لوگوں نے نہیں بدلا۔ ان کی کیفیت یہ ہے۔

مومن کا کردار اور اس کا عمل

قرآن کہتا ہے کہ آؤ' ان کے مقابلے میں بتائیں کہ مومن کون ہیں؟ اوپر تو یہ تھا کہ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ (24:47) زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے مگر فیصلہ کسی اور جگہ سے کراتے ہیں۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ (24:51) مومن وہ ہے کہ جب ان کو بلایا جاتا ہے کہ آؤ' اس نظام کی طرف کہ تمہارے معاملات میں یہ فیصلہ کرے تو ان یَقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (24:51) وہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ فیصلہ سنا ہے' ہم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں' ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ مومن یہ ہے کہ سنتا ہے' اطاعت کرتا ہے۔ اس کے برعکس آج ہم وہ ہیں جو ساری رات پورا قرآن سنتے ہیں اور اپنے اختلافی معاملات کے فیصلے اور مقامات سے کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ سمعنا سنتے ہیں۔ کا ہے کے لیے؟ اطعنا ہم اطاعت کرتے ہیں۔ کہا کہ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (24:51) کھیتیاں ان کی پروان چڑھتی ہیں جو کچھ کرتے ہیں۔ زراعت کے قانون تو گھر میں بیٹھا ہوا دہرائے چلا جا رہا ہے لیکن فصل تو اس کی پکتی ہے جو قانونِ زراعت سے واقف ہے پھر اس کے مطابق کھیتی بوتا ہے۔ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَخْشَ اللّٰهَ وَ يَتَّقْهِ

---

[1] اس آئین کے لیے دیکھیے

Prof Dr. Manzoor-ul- Haque (Complied) (2002). Quranic Constitution in an Islamic State: Basis of Legislation & Out line of the Constitution. Lahore: Idara Tolu-e-Islam (Regd).

فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ (24:51-52) ہاں جو اس نظام خداوندی کی اطاعت کرتا ہے' جو قرآن کی رو سے قائم ہوتا ہے اور پھر حفاظت اور احتیاط برتتا ہے کہ میرا کوئی قدم اس سے اِدھر اُدھر نہ ہونے پاتے تو یہ تقویٰ کہلاتا ہے۔ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ (24:52)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ Achieve (فوز) کرتے ہیں۔

نجات نہیں بلکہ فوز ہے

میں نے پہلے کہا تھا کہ قرآن کی رو سے جو دین کی انتہائی منزل ہے وہ نجات (Salvation) نہیں ہے۔ نجات (Salvation) تو پہلے کسی عذاب میں گرفتار ہونے سے چھٹکارے کا نام ہوتا ہے۔ مومن تو پھنستا ہی نہیں ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے فائزون کا لفظ کہا ہے۔ اسی سے فوز کا لفظ آتا ہے۔ فوز کے معنی ہوتا ہے: Some Thing To Achieve یعنی کچھ حاصل کیا جائے۔ نجات میں حاصل نہیں کیا جاتا۔ چھ مہینے کی قید ہو' اس چھ مہینے کے بعد' یا اس سے پہلے ہی اگر کوئی Proclamation (اعلامیہ) ہو جائے' وہاں سے نجات حاصل ہو' چھٹکارا حاصل ہو جائے' پھر اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بیمار ہو جائے: یعنی صبح صحت والا انسان تھا' درمیان میں بخار ہوا' شام کو بخار اتر گیا' تو زیادہ سے زیادہ جیسا صبح تھا' ویسا کچھ پھر ہو گیا' شام کو کچھ Achieve (حاصل) نہیں کیا اس نے۔ عزیزان من! میں کیا عرض کروں' قرآن کا ایک ایک لفظ' ایک Concept یا تصور دیتا ہے۔ قرآن کی رو سے نجات کا تصور نہیں ہے' فوز کا' فلاح کا' تصور ہے۔ وہی ہیں جو کچھ Achieve (حاصل) کرتے ہیں۔

عزیزان من! سورۃ النور کی آیت 52 تک ہم آ گئے' اس کے بعد 53 آیت سے آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀ ..... ❀❀❀ ..... ❀❀

نواں باب: سورۃ النور (آیات 53 تا 57)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾

عزیزانِ من! آج دسمبر 1977ء کی 2 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورۃ النور کی آیت 53 سے ہو رہا ہے: (24:53)۔

منافقت کی پہچان

سابقہ آیات میں یہ بتایا جا رہا تھا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جن کے اعمال فریب ہی فریب ہوتے ہیں اور وہ سب رائیگاں جاتے ہیں۔ اس کی وجہ جذبات کی شدت بتائی تھی اور منافقت اس کی پہچان تھی۔ اس آیت میں انہی کا ذکر آگے آ رہا ہے کہ **وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ** (24:53) یہ لوگ قسمیں کھائیں گے اور بڑی زوردار قسمیں کھائیں گے کہ نہیں صاحب! آزما کے دیکھ لیجیے۔ اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم آپ کے ساتھ میدانِ جہاد میں سب سے پہلے جائیں گے، جانیں دیدیں گے، کفن بدوش جائیں گے۔ یہ بہت بڑا یقین دلاتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا کہ **قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا** (24:53) ان سے کہو کہ قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دعویٰ ایمان کی پہچان تو بڑی آسان ہے۔ اور وہ پہچان ہے **طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ** (24:53) اطاعت! باتیں نہیں، الفاظ نہیں، اطاعت ہے۔ میں نے اس سراب (Mirage) والی آیت (24:39) میں بھی عرض کیا تھا کہ قرآن کریم اس کے ساتھ ایک لفظ

اور لاتا ہے تو وہ برائے وزن بیت نہیں ہوتا۔ قرآن کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پہ اٹل، ہمالیہ پہاڑ کی طرح محکم، الحق ہوتا ہے۔ وہ یونہی زائد نہیں ہوتا۔ یہاں طـــاعۃ کہا ہے۔ اطاعت کہا ہے اور اس کے آگے معروفۃ کہا ہے یعنی ایسی اطاعت جو پہچانی جا سکے، جانی جا سکے، نظر آئے کہ اطاعت ہو رہی ہے۔

اطاعت کی شکل میں ثواب تو معروف ہی نہیں ہوتا

اطاعت کا مفہوم اگر یہ لیا جائے کہ اس سے ثواب ہوتا ہے تو وہ معروف نہیں ہوتا یعنی آپ پہچان ہی نہیں سکتے کہ واقعی اس سے ثواب ہو رہا ہے۔ آپ خود بھی اس قسم کا ایک عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ یہ آپ بھی نہیں بتا سکتے۔ پوچھیے کسی سے کہ یہ کیا ہوتا ہے؟ جی، ثواب ہوتا ہے۔ ارے بھئی! بتاؤ یہ ہوتا کیا ہے؟ کہنے لگے: تینوں ثواب داوی پتہ نہیں ہیگا!![1]۔ بات میں اپنی نہیں کہہ رہا۔ میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ ذرا بتاؤ تو یہ ہوتا کیا ہے؟ کہتا ہے: جی ثواب ہوتا ہے اور آگے پھر یہ ان سے پوچھیے تو وہ کہیں گے:

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

یہ تو وہ شراب ہے کہ جو پیئے اسے پتہ چل سکتا ہے کہ نشہ کیا ہوتا ہے، جو پیئے نہیں اس کو نشے کا پتہ کیا ہے یعنی اسے پتہ ہی نہیں چل سکتا۔

لفظ طاعۃ کے ساتھ معروفۃ کا استعمال کیوں؟

اب آپ نے سمجھا کہ طاعۃ کے ساتھ معروفۃ کیوں آیا ہے۔ یہاں وہ اطاعت آتی ہے جو فریب خوردگان مذہب کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگاتی ہے، یہ ایسی اطاعت ہے جو جانی پہچانی جائے، معلوم ہو کہ اطاعت ہو رہی ہے۔ اطاعت اپنے تعارف کے لیے کسی قسم اور سوگند کی[2] محتاج نہیں ہوتی۔ عمل محسوس اپنا تعارف آپ کر دا دیتا ہے۔ ابھی، عزیزان من! آگے آیت آتی ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (24:53) خدا تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ جب اسے پتہ ہے کہ تم کیا کرتے ہو انہیں بھی پتہ ہونا چاہیے، تمہیں خود بھی پتہ ہونا چاہیے کہ اطاعت ہوتی کیا ہے، اطاعت کر کیسے رہے ہیں، اطاعت ہو بھی رہی ہے یا نہیں ہو رہی؟ یہ ہے طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ (24:53) جو عملِ محسوس سے اپنا تعارف آپ ہے۔ اسے اپنے تعارف کے لیے کسی قسم کی ضرورت نہیں۔ اگلی ہی آیت میں کہا کہ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (24:54)۔ ان سے کہو کہ تم اطاعت کرو، قسمیں کھا کھا کر اعتماد پیدا کرنے کے بجائے عملاً اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کر کے دکھاؤ۔

---

[1] تجھے ثواب کا بھی پتہ نہیں ہے، حیرت ہے۔

[2] سوگند (فارسی، اسم، مونث) قسم، قول، عہد۔

اطاعت کے نتیجہ کی محسوس شکل ضروری ہے

آپ کو معلوم ہے کہ قرآن میں جہاں بھی ''اللہ اور رسول کی اطاعت'' کا ذکر آتا ہے تو اس سے مراد اس نظام کی اطاعت ہے' اس دین کی اطاعت ہے' جسے خدا انسانوں کی طرف بھیجتا ہے اور جسے اس کا رسول سب سے پہلے متشکل کرتا ہے۔ اسے دینِ خداوندی یا نظامِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ یاد رکھیے کہ دین کوئی اصول خود نہیں بناتا' دین خدا ہی دیتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ تصریح ہے۔ دین اللہ ہے یعنی اللہ کا دیا ہوا دین ہوتا ہے' رسول تو اس دین کو لوگوں تک پہنچاتا ہے اور پھر عملاً اسے متشکل کرتا ہے۔ وہ دین دینِ خداوندی ہی رہتا ہے۔ یاد رکھیے! دین کی نسبت خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف نہیں کی جاسکتی' جیسے قرآن خدا کی کتاب ہے' رسول کی کتاب نہیں ہے۔ اسی طرح دین خدا کا عطا کردہ ایک نہج زندگی ہے' رسول اسے انسانوں تک پہنچاتا ہے' دین اللہ ہی ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ یہ دین محمد ﷺ نہیں' دین عیسیٰ علیہ السلام نہیں' دین موسیٰ علیہ السلام نہیں۔

دین ہر رسول کو خدا کی طرف سے ملتا تھا' رسول اسے پہنچاتا تھا' اور اس پر عمل کرتا تھا' تو اطاعتِ خدا اور رسول کے معنی ہیں ''خدا کا دین جسے عملی شکل میں اس کے رسول نے سب سے پہلے متشکل کیا اور پھر یہ سلسلہ آگے چلا''۔ ابھی آیت آتی ہے کہ **فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ** (24:54) اگر تم گریز کی راہیں نکالو' اعراض برتو' اطاعت نہ کرو' تو کہا کہ اس کے بعد اس کی ذمہ داری رسول پہ نہیں ہے۔ رسول پہ ذمہ داری ہے تو اس بات کی ہے کہ **وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ** (24:54) وہ تم تک احکام خداوندی واضح طور پر پہنچا دے۔

کسی کو صحیح راستے پر چلانا رسول ﷺ کے اختیار میں نہیں

رسولِ خدا کے ذمے تو پہنچا دینا ہے' تمہیں بات کا بتا دینا ہے کہ یہ راستہ کدھر جاتا ہے۔ اس راستے کا اختیار کرنا یا نہ کرنا' تمہارے اپنے بس کی بات ہے' رسول پہ اس کی ذمہ داری نہیں آتی۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق تو قرآن نے دوسرے مقام پہ کہا کہ اے رسول ﷺ! جسے تم بہت زیادہ محبوب سمجھتے ہو اس کے لیے بھی یہ تمہارے اختیار میں نہیں کہ تم ضرور اس کو ہدایت کے راستے پہ چلا دو۔ تم ہدایت دے سکتے ہو' راستہ بتا سکتے ہو' کسی کو اس راستے پر چلا نہیں سکتے۔ راستے پر چلنا یا نہ چلنا اس کے اپنے اختیار کی بات ہے جیسے مثال کے طور پر میں کہا کرتا ہوں کہ چوراہے پہ کھڑے ہو کر آپ جب کسی سے پوچھیں کہ لاہور کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے' وہ بتائے گا کہ یہ راستہ لاہور کی طرف جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ کا جی چاہے چلیں یا نہ چلیں۔ لاہور تو آپ جب پہنچیں گے کہ اس راستے کے اوپر چلیں۔ محض راستے کے معلوم ہو جانے سے تو آپ منزل تک نہیں پہنچ سکتے اور یہ جو راستے کا بتانے والا ہے اس پہ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ تمہیں بتائے بھی اور پھر وہاں پہنچائے بھی۔ یہ کہا کہ اگر تم اس کے بعد گریز کی راہیں نکالو گے' نہیں چلو گے' تو جو تمہاری ذمہ داری ہے' وہ تمہاری ہے' رسول

کی ذمہ داری تو پوری ہوگئی۔ اس لیے یہ کہا کہ وَ اِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا (24:54) اگر تم اس کی بات مانو گے تو منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے اور وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (24:54) رسول کے ذمہ واضح طور پہ پہنچا دینا ہے تاکہ کچھ الجھاؤ نہ رہے۔ یہ اس طرح راستہ بتاتا ہے کہ اس بتائے ہوئے کے اوپر آپ چلتے جائیں تو ٹھیک منزل تک پہنچ جائیں یہ ہوا بَلٰغُ الْمُبِیْنُ۔ اب وہاں کہا تھا "طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ" یعنی پہچانی جانے والی چیز کہ واقعی اطاعت ہو رہی ہے تو یہ تو اس کے نتیجے سے پہچانا جائے گا۔

قرآنی آیت استخلاف کا مفہوم دین کی صداقت پر یقینِ محکم ہے

اب آتی ہے' عزیزانِ من! وہ آیت کہ جس کے متعلق میں پہلے ہی عرض کر دوں کہ اگر آپ اسے اچھی طرح قرآن کریم کی روشنی میں سمجھ لیں تو دین پورے کا پورا سمجھ میں آجائے گا۔ یہ اتنی بڑی جامع غور طلب آیت ہے۔ غور طلب قرآن کی تمام آیات ہیں مگر بعض آیات ایسی ہیں جن کے اندر مقاصد کو ارتکاز و مرتکز (Concentrate and Crystalize) کر کے' تھوڑے سے الفاظ میں ایک جگہ بیان کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے یہ ایک آیت ہے جسے آیہ استخلاف کہتے ہیں۔ یہ اٹھارہ نومبر 1977 کو جو ہم نے یہاں جشن قرآنِ عظیم منایا تھا' اس میں ضمناً یہ آیت آئی تھی۔ آج ہمارے اس درس کے تسلسل میں یہ ہمارے سامنے آگئی ہے' اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اسے ذرا واضح طور پر بیان کرنا ضروری ہے' اور بڑے غور سے اس کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اتنی بنیادی آیت ہے کہ اس سے دین کا سارا مقصود و مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے کہ "دین ہے کیا؟ اور وہ کیسے معروف ہوتا ہے' پہچانا جاتا ہے کہ ہاں دین پر عمل ہو رہا ہے' اطاعت ہو رہی ہے' اس طرح سے بات معروف بنتی ہے"؟ اور وہ آیت یوں شروع ہوتی ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (24:55) اے نوعِ انسان! تم میں سے جو لوگ قرآن کی صداقت پر یقین رکھیں' تو پہلی شرط تو یہ ہے کہ جس سے آپ پوچھیں' یا چورا ہے پہ جو Sign (نشان) لگا ہوا ہو' آپ یہ یقین رکھیں کہ یہ واقعی ٹھیک ہے' سچا ہے' صحیح ہے' اگر آپ اس کی صداقت پہ یقین نہیں رکھتے تو اس کے بتائے ہوئے راستے کے اوپر آپ چل ہی نہیں سکتے: کیا پتہ ہے میاں! کوئی ٹھگ ہی نہ ہو' مجھے ادھر راستہ بتا رہا ہے اور آگے جا کر پتہ نہیں کیا کچھ ہو جائے۔ اس راستے پہ دل کے اطمینان کے ساتھ چلنے کے لیے شرط اول یہ ہے کہ آپ اس کی صداقت پر یقین رکھیں کہ یہ ٹھیک کہتا ہے۔ یہ جو Sign Post (نشان راہ) لگا ہوا ہے' یہ سچا Sign Post (نشان راہ) ہے' یہ مجھے گمراہ نہیں کرے گا۔ اسے ایمان کہتے ہیں۔

دین کے صادق ہونے کی پہچان

اس یقین کے بعد کہا کہ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (24:55)۔ یہ قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کا ترجمہ اعمالِ صالحہ کیا جاتا ہے۔ میں بھی اس وقت اس کی تشریح میں نہیں جاتا' اس لیے کہ قرآن نے بتایا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس طرح سے معروف بنتا ہے کہ اس

کے جو نتائج ہیں، وہ دیکھے جائیں گے کہ آیا وہ نکل رہے ہیں یا نہیں۔ اسی طرح سے یہ معروف بنتا ہے، اسی طرح اس کی پہچان ہو سکتی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر کا دعویٰ ہے کہ یہ جو دوائی ہے اس سے آپ دیکھو گے کہ چھ گھنٹے کے بعد بخار اتر جائے گا۔ اب کیسے پتہ چلے کہ اس نے ٹھیک کہا ہے یا نہیں۔ دوائی دینے کے بعد آپ دیکھیں کہ چھ گھنٹے کے بعد بخار اتر جائے گا تو اس نے ٹھیک کہا تھا ورنہ غلط کہا تھا۔ دعوے کی پہچان، پرکھ، ثبوت، اس کے نتائج سے ہوتا ہے۔ اسی کو قانون کہتے ہیں۔ قرآن نے جہاں اللہ کا وعدہ کہا ہے مثلاً **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** (24:55)۔ تو اس سے مراد خدا کا قانون ہے اور قانون کے متعلق اس نے یہ کہہ دیا کہ **وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا** (33:62) اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ تو وعدہ کے معنی ہیں خدا کا غیر متبدل قانون اور قانون کی صحت کی پہچان ہوتی ہے وہ نتیجہ جو کہا جائے کہ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوگا، یہ بیج بوؤ گے تو گیہوں کا اتنا بڑا اجھاڑ ہوگا۔ اور وہ جو میں قانون کی Definition (تعریف) میں الفاظ کہا کرتا ہوں وہ بڑے جامع ہیں: If, Then, Always یعنی اگر یہ کچھ ہوگا، Then تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا اور اگلی بات اس کی ہوتی ہے کہ Always ہمیشہ ایسا ہوگا۔ حکم وقتی چیز ہوتی ہے، قانون ابدی ہوتا ہے۔ اسی لیے ان Scientists (سائنسدانوں) نے یہ جو تین لفظوں میں Definition (تعریف) کی ہے، یہ بڑی جامع ہے۔ قرآن یہی کہتا ہے کہ اگر یہ کرو گے: امنوا منکم وعملوا الصلحت (24:55)۔ اگر یہ کرو گے تو پھر یہ ہوگا تو یہ بڑی بات ہے۔ اس بات کی پہچان ہوگئی کہ ایمان و عمل صالح کس وقت ایمان ایمان اور عمل صالح صالح بنے گا، کب بنے گا: If یہ Then ہے، پھر یہ ہوگا اور اگلی چیز یہ ہے کہ Always ہوگا یعنی جب بھی یہ کرو گے یہ ہوگا۔ پہچان ہوگئی۔ پھر اعمال صالحہ کچھ اور ہو گئے، اس کے نتائج کچھ نکلنے ہی نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ If,Then,Always, یہ ہے قرآن کا فارمولا۔ یہ **طاعة معروف**، جو اس نے کہا تھا ''پہچانی جائے'' یوں پہچانی جائے گی کہ اگر یہ کرو گے تو یہ ہوگا اور اگر یہ کرو گے تو ثواب ہوگا وہ تو پہچانا ہی نہیں جاتا۔

اعمالِ صالحہ کا عملی ثبوت کرّہ ارض پر دین کی حکومت

میں نے عرض کیا ہے کہ **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (24:55)۔ یہ بڑی بنیادی آیت ہے۔ اس لیے مجھے اسے بار بار دہرانا ہوگا۔ خدا کا وعدہ ہے اور اس نے کہا ہے کہ خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا۔ اس کے معنی بھی یہ ہیں کہ قانون کی Definition (تعریف) ہی یہ ہے کہ If اگر ایسا ہو تو Then ایسا یقیناً ہوگا اور Always ہمیشہ ہوگا۔ وہ قانون بنتا ہی اس وقت ہے جب اس کا نتیجہ اس کے دعوے کی صداقت کی شہادت بن جائے۔ یعنی اگر یہ ایسا کرو گے تو کیا ہوگا؟ یہ ہے عزیزان من! پہچان والی بات کہ یہ ہے جو ہوگا۔ اب کہا کہ **لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ** (24:55) ہم انہیں زمین میں، ملک میں، اسی کرّہ ارض، پر یہیں اقتدار دیدیں گے، حکومت و مملکت دیدیں گے، اختیارات دیدیں گے۔ آپ نے دیکھا کہ استخلاف کیسی معروف بات ہوئی۔

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے کا طریقہ تصریف آیات ہے۔ مختلف مقامات پر دیکھنا چاہیے کہ اس لفظ کے معنی و مفہوم کیا آتے ہیں اور سیاق و سباق کے حوالے سے یہاں کون سے معنی فٹ بیٹھتے ہیں۔ اب یہاں یہ جو خلیفہ کا لفظ ہے' اس لفظ سے استخلاف آیا ہے' خلف بھی اسی سے آیا ہے' عربی زبان میں بھی اس کے معنی ''خلافت'' ہوتے ہیں۔ جسے آپ بھی خلافت کہتے ہیں۔ اس کے عام معنی جانشینی کے ہوتے ہیں۔ یہ مملکت کی جانشینی' سلطنت کی جانشینی' حکومت کی جانشینی ہوتی ہے یعنی اس کے ساتھ اقتدار اور مملکت لازمی چیز ہے۔ ابھی میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ایمان اور عملِ صالح کا نتیجہ' قرآن کی رو سے' خدا کے اٹل غیر متبدل قانون کی رو سے' استخلاف فی الارض ہوگا۔

حکومت اور حکومت میں فرق

حکومت اور مملکت تو دھاندلی سے بھی مل سکتی ہے۔ یہ چنگیز خان ❶ نے بھی حاصل کی تھی' فرعون ❷ نے بھی حاصل کی تھی' نمرود ❸ نے بھی حاصل کی تھی۔ دنیا کے بڑے بڑے ڈکٹیٹر (آمر) حاصل کرتے ہیں' آج بھی قوت کے زور پہ حاصل ہوتی ہے اور اس دور میں تو ہوتی ہی قوت کے زور پہ یا دھاندلی سے یا دھوکے سے یا فریب سے ہے۔ اس کے بغیر کوئی استخلاف فی الارض نہیں ملتا ہے۔ مگر یہ جو استخلاف فی الارض ہے' یہ ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ بتایا ہے۔

اب قرآن کی رو سے ایک فرق تو یہ ہوا کہ ایک استخلاف فی الارض ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ ہے اور دوسرا استخلاف فی الارض دھاندلی سے ہے' فریب سے ہے' وراثت سے ہے۔ یہ استخلاف ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس طرح دو قسم کی مملکتیں

---

❶ چنگیز خاں کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص۔ 301 (فٹ نوٹ 2)۔

❷ فرعون کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 119-122 نیز فٹ نوٹ نمبر 1 (ص۔ 119)۔

❸ نمرود بابل اور نینوا (عراق) کا بادشاہ تھا۔ زمانہ قریب 2100/2200 ق م ہے۔ ڈاکٹر شبیر احمد صاحب کے بقول 1800 ق م کے لگ بھگ ہے۔ (حوالہ Quran as it explains itself, 2003, P.172) اس کا دارالحکومت ار (ur) تھا۔ ارکا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں حکومت کرتا تھا' اس کے پہلے بانی کا نام ''ارنمو'' تھا جس نے 2300 ق م کے لگ بھگ ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ اس کی مملکت کی حدیں مشرق میں ''سوسہ'' سے لے کر مغرب میں ''لبنان'' تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی سے اس خاندان کو ''نمو'' کا نام ملا' جو عربی زبان میں جا کر ''نمرود'' ہو گیا۔ یہ تفاصیل سر لیونارڈ وولے (Sir Leonard Wooly) کی کتاب Abraham,London 1935 سے ماخوذ ہیں۔ جس نمرود کی مڈ بھیڑ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی اس کا نام نمرود شداد ہے اور جس نے 599 ق م کے قریب بنی اسرائیل کے ہیکل کی اینٹ سے اینٹ بجادی وہ نمرود بخت نصر تھا۔ حوالہ کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004 ص۔ 72۔ نیز ڈاکٹر شبیر احمد: قرآن اپنے ہی آئینے میں (انگریزی)' 2003' ص۔ 194۔

ہوگئیں یعنی مملکت حاصل ہونے کا جو طریق ہے اس کی رو سے دو قسم کی مملکتیں ہوگئیں۔ اسی لیے ہمارے ہاں کی اصطلاح میں یہ جو قرآن کی رو سے ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجے میں مملکت ملتی ہے اسے خلافت کہا جاتا تھا کیونکہ یہ استخلاف کی وجہ سے تھی اور وہ جو دوسرے طریق سے مملکت حاصل ہوتی تھی اسے ملوکیت کہا جاتا تھا۔

ملوکیت کی تعریف

ہمارے ہاں خلافت اور ملوکیت دو اصطلاحات ہوئیں۔ ملوکیت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ بادشاہ کا بیٹا بادشاہ ہو تو پھر وہ ملوکیت ہوتی ہے۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ جب بھی سلطنت' قوت کے زور پہ شمشیر کے بل بوتے پہ' دھوکے سے' وراثت سے' حاصل کی جائے یعنی وہ ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ نہ ہو' تو وہ ملوکیت ہے خواہ اس کی شکل کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ پہلے زمانے میں عام طور پر اس کی شکل ملوکیت ہوتی تھی' بادشاہت ہوتی تھی' آج کے زمانے میں وہ بادشاہتیں تو ختم ہوگئی ہیں اور باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں' مگر یہ شکل بدل گئی ہے۔ ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجے میں استخلاف یا خلافت یا اقتدار یا مملکت آج کے دور میں کہیں نہیں۔ آج کے دور کے اندر اسے آپ امریکا اور یورپ کی جمہوریت کہہ لیجیے' رشیا اور چین کی ڈکٹیٹرشپ کہہ لیجیے' اس ملوکیت کا کچھ بھی نام رکھ لیجیے۔ آج اس کو سیکولرازم کہتے ہیں۔ آج بھی آپ کے ہاں وہی دو اصطلاحات ہونی چاہیں: خلافت اور ملوکیت۔ خلافت وہ مملکت ہے جو ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہے اور ملوکیت وہ مملکت جو اس کے سوا یا اس کے خلاف کسی اور طریقے سے حاصل کی جائے۔ خدا کا وعدہ یہ ہے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔

خود مسلمانوں کی حکومتوں کی کیفیت

غیر مسلموں کو چھوڑ دیجیے خود مسلمانوں کی آبادی میں' مسلمانوں کے ملک کے اندر بھی' اگر یہ استخلاف فی الارض یا خلافت حاصل نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان مسلمانوں کا نہ ایمان' ایمان ہے' نہ عمل' عمل صالح ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں تو اس نتیجے سے پہچانی جائیں گے۔ لہٰذا پہلی شق تو اس میں یہ ہوگئی کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہے وہ کسی غیر کا محکوم ہے یا وہ خود صاحب اقتدار نہیں ہے یا اس کی اپنی مملکت نہیں ہے' تو اس کا ایمان نہ ایمان ہے اور عمل نہ عمل صالح ہے بلکہ یہ خود فریبی ہے' فریب دہی ہے۔

برطانیہ کی غلامی میں مسلمانوں کے ہاں ''آزادی'' کا تصور

ہم غیر منقسم پاک و ہند میں برطانیہ کی غلامی میں رہتے تھے۔ انہوں نے ہمیں نماز روزہ حج زکوٰۃ اعتقاد عبادات وغیرہ کی آزادی دے رکھی تھی اور ہمیں کہا یہ جاتا تھا کہ صاحب! ہمیں اسلام پر چلنے کی آزادی حاصل ہے اور نماز روزہ حج زکوۃ وغیرہ عبادات جو اعمال صالحہ ہیں' کے بعد اور کیا چاہیے: صاحب! وہ مملکت' سلطنت دنیاداروں کے دھندے ہیں۔ ہمیں اس عقیدے میں پختہ کیا گیا کہ غیر

مسلموں کی' کفار کی' محکومیت کے اندر بھی اسلامی زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ خدا کا یہ کیا ہوا وعدہ ہے۔ اس کا وعدہ تو سچا ہے' خدا کبھی وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا' ہم تو اس خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنے سے تو ایمان ہی خدا پہ اٹھ جاتا ہے۔ وعدہ تو وہ سچا ہے تو بات یہی ہوئی کہ قانون میں کہا کہ اگر یہ کرو تو پھر اگر وہ نہیں ہو رہا یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ تو اپنی مملکت اپنی آزاد حکومت اگر حاصل نہیں ہو رہی' مملکت حکومت کفار کی ہے' غیر مسلموں کی ہے یا اپنی بھی ہے تو بھی ملوکیت کی ہے تو اس مملکت کے اندر نہ ایمان ایمان ہے نہ اعمال اعمال صالحہ ہے۔ بات سمجھ میں آئی۔ یہ تو ہمیں نتیجے سے پہچاننا ہے۔ اسی لیے اس نے طاعۃ معروفۃ کہا تھا۔ محض اپنے آپ کو اطمینان دلانا نہیں' استخلاف فی الارض تو ایسی محسوس شے ہے جو ساری دنیا دیکھتی ہے' ہم ہی اس کو نہیں دیکھتے۔ پہلی چیز تو آپ ہماری اس تاریخ میں دیکھیے' میں کسی لمبی چوڑی تاریخ میں نہیں جانا چاہتا۔ آپ یہ دیکھیے کہ یہ ابھی جو ہمارا پچھلا دور گزرا ہے' اس میں ہم انگریز کی غلامی کے اندر' کفار کی اطاعت کیے ہوئے تھے' ان کی مملکت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہمیں اطمینان دلایا جا رہا تھا کہ یہ اسلام ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے ہمیں آزادی دی ہوئی تھی کہ جب جی چاہے ہم اسلام کو بیان کریں' جب جی چاہے اللہ کو پکاریں' کوئی نہیں روکتا۔ کیا اعمال صالحہ سے یہ ایمان ہو گیا؟ کہنے لگے کہ ہاں' ہم اس حکومت میں نماز پڑھتے ہیں' نفل پڑھتے ہیں' تسبیحاں پھیرتے ہیں' ذکر اذکار کرتے ہیں' میلاد کی محفلیں کرتے ہیں' عرس کرتے ہیں' یہ اعمال صالحہ ہیں۔ اب آگے گلے میں اٹک گئی یہ استخلاف والی بات کہ صاحب! یہ کیا ہوا؟ کہ یہ اصل میں خلافت روحانی ہے۔ بس چل بھئی! معاملہ ختم ہوا۔ یہ ہے فریب در فریب!

ملوکیت کے بعد روحانیت کی خلافت کا فریب

کہا کہ یہ روحانی خلافت ہے جی۔ اس کا جواب دیا کہ بھئی! وہ تو فی الارض بھی ساتھ کہا گیا ہے۔ کہا کہ ٹھیک ہے جی! یہ اسی دنیا میں روحانی خلافت ہے۔ اب وہ خلافت جو استخلاف قرآنی کی رو سے ایسی بلند و بالا تھی' وہ ایک مقدس اصطلاح تھی' اب وہ سمٹ کے وہی صلوۃ کی طرح غیر محسوس سی روحانی رہ گئی۔ یہ جتنے تصوف کے طریقے آتے ہیں ان میں آپ کو پتہ ہے کہ حضرت صاحب کے خلیفہ ہیں اور کتنے ہی دوسرے خلیفے ہیں' تین خانوادوں کی خلافت تو اس گدائے میکدہ قرآنی [1] کو بھی حاصل ہے۔ یہ بھی خلیفہ تھا اور نائی (حجام) بھی خلیفہ تھے۔ ''ہن تے اونائی نہیں ہوندے۔ ہن تے ہیئر ڈریسر ہوندے نیں۔ [2] ان ہیئر ڈریسر سے ان کی خلافت چھن گئی۔ آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے ہاں نائی کو خلیفہ کہتے تھے۔ آپ دیکھیے کہ لفظ کتنی بلندیوں کی اصطلاحات ہیں۔ جب یہ اصطلاحات آہستہ آہستہ گرنی شروع ہوتی ہیں تو یاد رکھیے یہ اصطلاحیں نہیں گرتیں' اصطلاحوں کو استعمال کرنے والے گرتے ہیں۔ کہاں ایمان و اعمال صالحہ کا نتیجہ خلافت تھا' کہاں

---

[1] یہ اشارہ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف ہے۔

[2] اب تو وہ حجام نہیں ہوتے۔ اب تو ہیئر ڈریسر (Hair Dresser) ہوتے ہیں۔

پھر یہ خلافت؟ پھر یہ جو لفظ خلیفہ تھا وہ کہاں؟ اور کہاں خلیفۃ الرسول؟ معارف رکھیے گا' میں یہ نہیں کہتا' ہے نائی یا حجام! یہ کتنی اہانت کی بات ہے۔ آپ صرف یہ دیکھیے کہ یہ اصطلاحیں کہاں آتی ہیں' پھر اس لفظ کا استعمال کہاں ہونے لگا' کہ جی یہ روحانی خلافت ہے لیکن قرآن تو کہیں نکلنے نہیں دیتا' فریب کار کے لیے اتنا سارا راستہ بھی نہیں چھوڑتا کہ شاید یہ فریب دے سکتے کہ جی! یہ روحانی خلافت ہے۔ اس نے کہا کہ ہم انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے۔ یہ اسی طرح کی ہوگی **كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ** (24:55) جس طرح کی سلطنت' حکومت اور سلطنت اس سے پہلی اقوام کو ہم نے دی۔ تاریخ اس چیز کی شاہد ہے۔ اس طرح وہ جو غیر متبدل اصول تھے' وہ اس کی صداقت کے ثبوت بن گئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کس طرح پہلی اقوام کو بطور ثبوت پیش کرتا ہے۔ یہ وہ اقوام تھیں جن کو اسی ایمان و اعمال صالحہ کے نتیجے میں استخلاف فی الارض ملا تھا۔

قرآن کی راہنمائی کے لیے قوموں کا تاریخی ذکر

یوں تو پوری تاریخ آپ کو بتائے گی لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ تصریف آیات کی رو سے سمجھا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ اس عنوان یعنی خلافت کو خلیفہ کے تابع قرآن میں دیکھیں گے کہ کس طرح سے یہ لفظ کہاں کہاں استعمال ہوا ہے' کن اقوام کے متعلق اس نے کیا کیا کہا ہے۔ میں یہاں پورے ریفرنسز (حوالہ جات) تو نہیں دے سکتا' وقت تھوڑا ہے' بنی اسرائیل کی داستان تو ہمارے سامنے ہے۔ وہ پوری داستان ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل فرعون کی مملکت میں' محکومی کی زندگی بسر کرتے تھے' پھر کیسے ٹکراؤ ہوا' ٹکراؤ کے بعد پھر انہیں اپنی آزاد مملکت [1] ملی۔ اس کے متعلق صرف قرآن سے پوچھیے' ہمارے ہاں کے لٹریچر سے نہیں۔ دنیا کی تاریخیں اس کی گواہ ہیں کہ بنی اسرائیل نے تو ہزار برس تک اس شان و شوکت سے وہ حکومت کی ہے۔ سطوتِ سلیمان یا شوکتِ داؤدی ساری دنیا میں مشہور ہے۔ آج تک یہی فلسطین کا بیت المقدس کا جو علاقہ ہے اس پر یہودیوں کی اپنی حکومت تاریخ کی شہادت ہے۔ یہ دیکھیے کہ قرآن کیا کہتا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو وادی سینا میں لے آئے' وہاں ان کی تعلیم و تربیت شروع کی۔ صدیوں کی غلام قوم ہے ان کو سپاہیانہ زندگی کی ٹریننگ دی جا رہی ہے' وہ قدم قدم پہ روٹھ کے بیٹھ جاتے تھے۔ وہ بات یہاں سے شروع ہوئی ہے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتے تھے کہ **قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا** (7:129) اے موسیٰ! جب تو ہم میں نہیں تھا تو بھی ہم عذاب میں تھے۔ تو آیا ہے تو بھی ہم عذاب میں ہیں۔ اب وہ اس کو عذاب سمجھتے تھے۔ یہ ایمان اور اعمال صالحہ کی جن منزلوں سے انہیں گزار رہے تھے وہ ان کو بھی مشقتیں سمجھ رہے تھے۔ قال (7:129) موسیٰ نے جواب دیا کہ **عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ**

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان طورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005 نیز مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2004۔

عَدُوَّكُمْ (7:129) ذرا انتظار کرو، تم دیکھو گے کہ خدا کس طرح تمہارے دشمن کو ہلاک کرتا ہے۔ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ (7:129) اور اس کے بعد کیسے تمہیں استخلاف فی الارض عطا کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کیسے وضاحت ہوگئی۔ اب یہ تو بنی اسرائیل کی خلافتِ روحانی نہیں تھی۔ تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے، دنیا کے سامنے موجود ہے کہ قومِ فرعون کی تباہی ہوئی، اس کے بعد ان کی مملکت کا ایک حصہ بنی اسرائیل کے زیرنگیں آیا اور وہاں ان کی مملکت صدیوں تک قائم رہی۔ قرآن اسے استخلاف فی الارض کہہ کر پکارتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام اور قومِ بنی اسرائیل کا تذکرہ

اب آگے بڑھیے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہی آل تھی جو وہاں سے چلے تو اس میں یہ سارے آتے ہیں۔ یہودی بھی اس میں آتے ہیں اور پھر یہ عرب بھی اس میں آتے ہیں۔ یہ ساری آل ابراہیمی علیہ السلام ہے جس کے متعلق کہا کہ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (4:54) آل ابراہیم علیہ السلام کو ہم نے کتاب وحکمت عطا کی تھی وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (4:54) اور اس کے ساتھ ایک عظیم مملکت بھی۔

دنیائے تصوف کی خلافت، عالم بالا میں ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی

یہاں (4:54) میں ملک کا لفظ آ گیا۔ ''اور انہیں ہم نے بڑا عظیم ملک دیا''۔ اب استخلاف کے معنی اور واضح ہو گئے کہ ملک عظیم دیا مگر وہ کہتے ہیں کہ یہ روحانیت میں بھی ہوتا ہے، پر ہوتا وہ عالم بالا میں ہے۔ ان سے کہا کہ یہاں یہ فی الارض کہا ہوا ہے۔ کہا کہ پھر جو ہماری خلافت ہے، وہ تمہاری آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتی۔ اس کے دیکھنے کے لیے آنکھیں بھی اور ہونی چاہیں۔ تاریخی شہادات ہمارے سامنے ہیں۔ آپ استخلاف بنی اسرائیل کا، آل ابراہیم کا، تاریخ سے پوچھیے۔ یہی جو خلافت بنی اسرائیل ہے، اسی میں حضرت داؤد علیہ السلام آتے ہیں۔ ان کے متعلق فرمایا کہ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ [1] (38:26)۔ یہاں لفظ خلیفہ آ گیا کہ اے داؤد! ہم نے تمہیں ملک میں، زمین میں، مملکت میں، خلافت عطا کی ہے، خلیفہ بنایا ہے اس لیے فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (38:26) لوگوں کے معاملات حق کے ساتھ تصفیہ کیا کرو، حق کے ساتھ حکومت قائم کرو۔ یہاں خلافت اور خلیفہ کے معنی تاریخ کی رو سے واضح ہو گئے۔

---

[1] اے داؤد علیہ السلام! ہم نے تمہیں ملک میں حکومت عطا کی۔ (پرویز: مفہوم القرآن، طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، ص۔1057)

قرآنی لفظ خلیفہ کے بارے میں ہماری سوچ کی پستی

حضرت داؤد علیہ السلام کی سلطنت تو تاریخ میں درخشندہ الفاظ میں لکھی ہوئی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ اس کا مقصد لوگوں کے معاملات میں فیصلے کرنے کا تھا۔ حکومت کا کام یہ ہوتا ہے۔ یہاں **فاحکم** لفظ ہے' حق کے ساتھ حکومت قائم کرو۔ یہاں ہمارے سامنے خلیفہ کے معنی آ گئے حق کے ساتھ۔ اسی کے لیے ایک لفظ تمکن بھی ہے۔ تمکن کے معنی ویسے ہوتے ہیں کسی چیز کا Establish (ثبت) کرنا' جسے ہم کہتے ہیں' جھنڈے گاڑ دیئے اس نے تقویت پکڑ لی' متمکن ہو گئے۔ یہی جو اسرائیل کا استخلاف تھا اس کی وضاحت سورۃ القصص کی پہلی پانچ آیات کے الفاظ میں کی۔ پہلی پانچ آیات میں کہا گیا ہے کہ فرعون اس محکوم قوم کے ساتھ کیا کیا کرتا تھا' اسے تو چھوڑیئے' بات لمبی ہو جائے گی۔ اس کے بعد یہ ہے کہ ہم نے پھر چاہا کہ اس قوم کو جسے ملوکیت نے دبا رکھا تھا' زندگی عطا کر دیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہو گی؟ اس کے لیے کہا کہ **وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ** (28:6) تا کہ ہم انہیں متمکن کر دیں' تمکن عطا کر دیں' اقتدار عطا کر دیں' ملک کے اندر مملکت عطا کر دیں۔ **وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ** (28:6) اور جس انجام سے یہ فرعون اور اس کی قوم ڈرتی ہے' وہ اپنی آنکھوں سے اس تباہی کو دیکھ لے' اور اس طرح بنی اسرائیل کو تمکن حاصل ہو جائے۔ تو گویا اس ایک لفظ تمکن کے معنی' استخلاف کے معنی' خلیفہ کے یہ سارے معنی' ہمارے سامنے واضح ہو گئے۔ اس کے بعد' عزیزان من! کوئی اور مطلب لینے کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ یہ خلافت روحانی ہے' یہ مملکت و سلطنت یا دنیا و اقتدار اور حکومت نہیں ہے۔ روحانیت کا لفظ ہی قرآن میں نہیں آیا۔ پہلی چیز تو قرآن نے یہ بتائی۔

اب آیا جماعت مومنین کا کہ ان کے متعلق کیا کہا ہے؟ یہاں تو کہا ہے کہ **لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ** [1] (24:55)۔ تو یہاں کہا تھا کہ جو بھی ایمان و اعمال صالحہ والی ٹھیک روش پہ چلے گا' اسے ہم یہ دیں گے۔ تو ہماری تاریخ میں ہمارا صدر اول ہے' جس میں یہ کیفیت ہوئی۔ ان کا ایمان تھا' ان کے اعمال اعمال صالحہ تھے۔ ان کے متعلق کہا کہ ہم استخلاف فی الارض دیں گے۔ پھر کہا کہ جب وہ اس ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ پہ کاربند ہوئے تو **وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ** (33:27) ہم نے تمہیں تمہارے دشمنوں کے ملک عطا کر دیئے ان کے شہر دے دیئے' ان کی دولت دے دی۔ **وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا** (33:27) اور ان کے ماوراء ان زمینوں کی مملکت بھی' جہاں ابھی تمہارے قدم بھی نہیں پہنچے تھے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو دشمن کی زمین ہے' کفار اور مشرکین کی ارض ہے' وہ انہیں دی جا رہی ہے' تو کیا ان سے وہ روحانیت سلب کر کے انہیں دی جا رہی ہے؟ وہ تو ارض کہتا ہے' دیار کہتا ہے' اموال کہتا ہے' اور وہ

---

[1] ہم انہیں زمین میں مملکت عطا کریں گے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔810)

ارض بھی جن پر ابھی تمہارے پاؤں بھی نہیں پہنچے۔ ان سارے علاقوں میں ایران کی مملکت ہے' بازنطینی ایمپائیر کے سارے علاقے ہیں' جہاں عربوں کے پاؤں بھی کبھی وہاں تک نہیں پہنچے تھے' وہ انہیں اپنی سرحد پار آنے نہیں دیا کرتے تھے۔ یہاں کہا جا رہا ہے کہ وہ زمینیں بھی تمہاری مملکت ہونگی یعنی تمہارے قبضے میں آ جائیں گی۔ یہ ایمان و اعمال صالحہ کا نتیجہ ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ تصریف آیات سے کیسے بات واضح ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کیا کوئی دوسرے معانی اس استخلاف فی الارض کے ہو سکتے ہیں؟ نہیں' یہاں وہ ارض کہتا ہے' دیار کہتا ہے' اموال کہتا ہے۔ اور وہ سب جو دشمنوں کے ہیں ان کے متعلق کہہ رہا ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے' ہمیں کہا جا رہا ہے: یہاں کہا ہے کہ وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ (33:27) تمہیں وراثت دیدی جائے گی' تمہیں ملکیت دید یجائے گی' تم ان کی زمینوں کے وارث ہو جائے گے اور پھر (39:75) میں کہا کہ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ (39:74) وہ پکار اٹھیں گے: الحمدللہ۔ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ جماعت مومنین کی طرف سے یہ کہا ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی میں اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ (39:74) ہمیں ان زمینوں کا مالک بنا دیا اور آگے سنیے' عزیزان من! نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ (39:74) یہ وہ جنت ہے جو ہمیں اس نے عطا کی ہے کہ جس میں یہاں سے وہاں تک ہمارے اختیارات ہیں۔ ہاں وہ جو مرنے کے بعد کی جنت ہے' اس پہ ہمارا ایمان ہے۔ وہ تو یہاں اس کو جنت کہہ رہا ہے اور اس جنت کی خصوصیت یہ ہے کہ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ (39:74) اور ہمیں ارض کا وارث بنا دیا۔ یہ تو وہ چیز ہے جو مملکت ہے جو زمین پہ ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ (39:74) یہاں یہ جہاں تک مملکت ہے' وہاں تک ہمارے اختیارات ہیں۔

ہاں' یہ کیسے ملی؟ اس کے متعلق کہا کہ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (39:74) اعمال صالحہ والوں کا کیسا عمدہ نتیجہ ہے' کیسا عمدہ صلہ ہے' کیسا عمدہ بدلہ ہے جو وہ دے رہا ہے! وہ اس کو جنت کہہ رہا ہے' محسوس اور مرئی چیزیں ہیں' یہ تو اسی زندگی کے اندر ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ ہو گئی۔ یہ استخلاف فی الارض ہے جو مملکت ملتی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تو اس دنیا کی مملکت' سلطنت اور حکومت ہے۔ پہلی قوموں نے بھی جب یہ کچھ کیا تو ان کو بھی یہ ملا۔ قرآن نے جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ تم نے یہ کیا تو تمہیں یہ دیا۔ وہ اس جنت کے حصول کے بعد سجدہ شکرانہ ادا کر رہے ہیں۔ اس کے وعدے برحق ہیں کہ جب بھی تم یہ کچھ کرو گے تو یہ کچھ مل جائے گا۔

اس مملکت کی غایت' اس کا مقصد' اور اس کی منزل

اب اگلی بات ہوئی کہ یہ اسلامی مملکت' جو دی گئی ہے یا ملی ہے' کی غایت اور مقصد کیا ہے؟ یعنی یہ کہ یہ مملکت مقصود بالذات نہیں ہے' محض حکومت یا سلطنت مقصود بالذات نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک آیت سے یہ تمام دین سمجھ میں آ جاتا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ کے نتیجے میں لازمی طور پر اپنی حکومت قائم ہو گی' تو گویا اپنی حکومت کے بغیر آگے بات چلتی نہیں ہے۔ یہ حکومت کا ہے

کے لیے ہے؟ سنیے عزیزان من! اسی زیر درس آیت میں کہا کہ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (24:55) تاکہ وہ دین جو خدا نے ان کے لیے تجویز فرمایا ہے' اس دین کو تمکن حاصل ہو جائے۔ بات یہ آ گئی کہ دین کو تمکنت حاصل ہی نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ استخلاف فی الارض نہ ہو۔ اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین متمکن ہی نہیں ہو سکتا' اسلام قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ کہا ہے کہ اس دین کا وَ لَيُمَكِّنَنَّ (24:55) تمکن ہو جائے' دین کی تو سیدھی بات ہے کہ اگر یہ استخلاف فی الارض یعنی اپنی آزاد مملکت نہیں ہے تو دین کا تمکن نہیں ہو سکتا۔

صدیوں سے دینِ خداوندی کو خود ساختہ مذہب کی صورت دی گئی ہے

عزیزان من! ہمارے ہاں جو اصطلاحات ہیں' ان سے دین کا لفظ ہی چلا گیا ہے۔ اس کی جگہ آپ کے ہاں مذہب کا لفظ آ گیا۔ مذہب کی دنیا میں تو ہر حکومت میں' ہر مملکت میں' ہر قوم کا مذہب ہے۔ مثلاً اس مذہب میں ہندو اپنے ہاں پوجا پاٹ بھگتی سے یا کچھ رسوم ادا کرتے ہیں' عیسائی اپنی Worship (پرستش) سے' یہودی اپنے طریق' پر آپ اپنی مساجد میں نماز پڑھیے' روزے رکھیے' حج پہ چلے جائیے زکوۃ خیرات دیتے چلے جائیے' اللہ اللہ کیجیے' ذکر کیجیے' یہ سب کچھ کرتے رہیے۔ وہ سب کچھ جو بھی ہے' یہ مذہب ہے۔ دین کے تمکن کے لیے تو وہ استخلاف فی الارض شرط قرار دے رہا ہے اپنی وہ مملکت جو ایمان و اعمال صالحہ کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ دیکھ رہے ہیں کیا کڑی سے کڑی ملتی چلی جا رہی ہے تاکہ اس دین کا تمکن ہو جائے۔ یہ اس زمانے میں کہا گیا ہے۔ میں بار بار اس زمانے میں کہہ رہا ہوں' دور کی بات تو چھوڑ دیجیے' یہی جو ہندوستان میں' تحریک پاکستان میں' کشمکش ہو رہی تھی یہ مرد مومن جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی گہرائیوں میں اترنے کی فراست فرقانی عطا کر دی تھی یعنی اقبالؒ (1877-1938)' اس نے یہ بات پہلی دفعہ ہزار سال کے بعد کہی تھی کہ بابا! جس دین پہ تم اپنے آپ کو کہہ رہے ہو' یہ مذہب ہے' یہ دین نہیں ہے' یہ اسلام نہیں ہے' اس کے لیے اولین شرط اپنی آزاد مملکت ہے۔

اقبالؒ کی فراست فرقانی اور ہماری سوچ

پوچھتے ہیں کہ صاحب! مطالبہ پاکستان کا جذبہ محرکہ کیا تھا پھر سنیے کہ اب بھانت بھانت کی بولیاں آپ کے ٹی وی اور ریڈیو پہ بولی جاتی ہیں یا ان سیمینارز میں اور مذاکروں میں ہوتی ہیں۔ پچھلا ایک پورا سال قائداعظم کا سال تھا' یہ (1977ء) اقبالؒ کا سال ہے۔ اس میں یہی موضوع رکھا کہ مطالبہ پاکستان کا جذبہ محرکہ کیا تھا۔ بنیادی طور پر تان یہاں آ کر ٹوٹتی ہے کہ صاحب! مسلمانوں نے بڑی کوشش کی کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کے رہا جائے' ہندو اتنا تنگ نظر واقع ہوا تھا کہ یہ ممکن ہی نہ رہا اور انہوں نے پھر تنگ آ کے یہ بات کہی کہ اچھا

بھئی! اگر یہ نہیں ہے تو ہم علیحدہ ہو جاتے ہیں:

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئین وفا بدلا

یہ جذبہ محرکہ بتایا جاتا ہے۔ کچھ اور آگے بڑھتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! وہاں مسلمانوں کے لیے معیشت کے دروازے بند ہو گئے تھے، سرمایہ داری نہیں ہو سکتی تھی، اپنی ملز نہیں لگ سکتی تھیں۔ یعنی وہ سارے کا سارا یہ قصہ تھا۔ وہ اس لیے کہ یہاں کچھ خاندانوں کو مل لگانے کی اجازت مل جائے۔ اقبالؒ (1938-1877) کے نزدیک مطالبہ پاکستان کا جذبہ محرکہ ہی کچھ اور تھا۔ اس نے کہا تھا کہ بابا، اسلام کے مطابق زندگی بسر ہی نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ اپنی آزاد مملکت نہ ہو۔ یہ ہے جذبہ محرکہ۔ اس کے مقابل میں تم یہ حضرات جن کو نیشنلسٹ علماء کہا جاتا ہے، جمعیت علماءِ ہند والے کہا جاتا ہے، یہ علمائے دیوبند کی ساری اکثریت کہتی تھی کہ یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اس مغرب کی مادہ پرستی سے متاثر ہو، جو دنیاوی حکومت کو لا رہے ہو۔ مذہب کے معاملے میں جو آج کل طلوع اسلام ❶ میں کچھ مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں یہ بڑی Discussion (بحث وتمحیص) دی گئی ہے۔ وہ جو ایک شعر میں اقبالؒ (1938-1877) نے بات سمٹا کے کہی ہے، وہ اسی کو بات سمٹا کے کہنی آتی تھی کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

سجدے کی اجازت کے ملنے میں اور اسلام کے ہونے میں ایک بنیادی فرق ہے

سجدے کی اجازت اور اسلام کی آزادی میں بڑا فرق ہے۔ یہ تھی ساری کشمکش۔ اپنی آزاد مملکت کے بغیر اسلام پہ عمل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ دیکھیے قرآن کہتا ہے کہ دین کے تمکن کے لیے یہ استخلاف فی الارض ضروری ہو گیا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ کہتے تھے کہ ہمیں نمازوں کی اجازت ہے، روزے کی اجازت ہے۔ قرآن کسی کو بھاگنے نہیں دیتا۔ (22:41) کے اوپر سے بات چلی آ رہی ہے کہ بالآخر میدان جنگ میں نکل آنے والے مومنین کی، اعمال صالحہ کی آخری کڑی، بلکہ ایمان کی شہادت کا عملی ثبوت۔ اسی لیے اس کو شہید کہتے ہیں کہ وہ جان دے کر اپنے ایمان کی شہادت دیتا ہے۔ یہ اپنے ایمان کی سچے ہونے کی آخری کڑی میدان جنگ میں آ گئی اور وہاں یہ کہا کہ **اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ** (22:41) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں مملکت حاصل ہو گی، تمکن فی الارض حاصل ہو گا، پھر دیکھیے

---

❶ یعنی 1977ء کے سال میں، خصوصی طور پر اکتوبر، نومبر کا مجلّہ طلوعِ اسلام مراد ہے۔

یہ فی الارض ہے یعنی جب انہیں تمکن حاصل ہوگا' یہ ابھی زمین پہ تمکن کی بات ہورہی تھی: مَكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (22:41) جب انہیں ارض میں تمکن حاصل ہوگا' جب ان کی حکومت قائم ہوگی' تو یہ کیا کریں گے؟ سنیے عزیزان من! وہ جو کہتے تھے کہ غیروں کی مملکت میں یہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ کیا ہوسکتا تھا: کہتے تھے نماز روزہ ہوسکتا ہے۔ مگر یہاں ہے اگر انہیں زمین میں مملکت عطا ہوگئی تو اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ (22:41) یہ پھر اقامت صلوٰۃ کریں گے' ایتائے زکوٰۃ کریں گے مگر شرط یہ ہے کہ اگر انہیں مملکت حاصل ہوگئی تو پوچھیے' عزیزان من! قرآن حکیم سے۔ قرآن تو اس تمکن فی الارض کے بغیر اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہی کو نہیں سمجھتا کہ یہ ہوسکتا ہے۔

تمکن فی الارض کے بغیر صلوٰۃ قائم ہی نہیں ہوسکتی

آپ تمکن فی الارض کے بغیر نماز تو پڑھ سکتے ہیں' آپ صلوٰۃ کو قائم نہیں کر سکتے۔ یہ تو ایک نظام کا نام ہے۔ آپ زکوٰۃ کو خیرات کے مفہوم میں لے کر دوسری مملکت کے اندر دوسروں کی محکومیت کے اندر غریبوں میں چند پیسے تو بانٹ سکتے ہیں' زکوٰۃ کا نظام نہیں قائم کر سکتے۔ یہ تو تمام افرادِ انسانیہ کو سامانِ نشوونما دینے کا نظام ہے جسے ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ خیرات اس سے الگ چیز ہے۔ نظامِ صلوٰۃ یہ ہے کہ ہر فرد قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے ازخود چلا جائے اور پورے افرادِ مملکت کو ایتائے زکوٰۃ کے نظام کے تحت نشوونما کا سامان بہم پہنچتا رہے اور کہا کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ (22:41) انہیں جب تمکن حاصل ہوگا تو پھر یہ اقامتِ صلوٰۃ کر سکیں گے ایتائے زکوٰۃ کر سکیں گے۔

قرآن کے نزدیک امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ اور ہمارا عمل

مولوی صاحبان سے اگلی چیز آپ نے یہ سنی ہوگی کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر ہمارا فریضہ ہے۔ یہ کس طرح ادا کرتے ہیں؟ جی! ہم لوگ وعظ کرتے ہیں۔ وعظ کی اجازت تو وہاں غیر منقسم پاک وہند میں 1947ء سے پہلے بھی تھی۔ وہاں مناظروں کی بھی بڑی اجازت تھی۔ بہت زور شور سے وہاں یہ کچھ ہوتا تھا۔ سنیے! یہ ہے ان لوگوں کی یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ قرآن کہتا ہے کہ جب حکومت قائم ہوگی وہاں یہ ہوگا: اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (22:41)۔ امر کے تو معنی ہی ''حکم دینا'' ہوتے ہیں۔ کہا کہ وہ معروف کا حکم دیں گے۔ حکماً معروف کو رائج کریں گے۔ معروف ہر وہ روش' ہر وہ بات' جسے نظامِ حکومتِ خداوندی یا قرآن Recognize (منظور) کرے کہ یہ صحیح بات ہے' وہ معروف ہے۔ جسے یہ کہے کہ یہ صحیح نہیں ہے' وہ منکر ہے۔ نھوا یعنی اسے قانوناً روکیں۔ یہ نہیں ہے کہ وعظ کہیں گے' منتیں کریں گے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک ہی بات ہے اور آگے ہے کہ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22:41) اگر انہیں تمکن فی الارض عطا ہوگیا تو تمام امور آخرالامر اللہ کے قانون کے مطابق طے

ہونگے۔غور فرمایا' عزیزان من! اس آیت میں بھی آگے چل کر دیکھیے کہ کیا بات آتی ہے یعنی یہ چیز ہمارے سامنے آگئی کہ ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔استخلاف فی الارض کی غرض وغایت کے لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ تمکن دین' اقامت صلوٰۃ 'ایتائے زکوٰۃ' امر بالمعروف' نہی عن المنکر کے لیے ہے۔اگر یہ کچھ ہو گیا' پھر تو وہ سب ٹھیک ہو گیا ورنہ یہی کہا جائے گا کہ

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اس نظام خداوندی میں خوف' امن سے بدل جائے گا

اب دیکھیے کہ میرے اور تیرے دکھ کی دوا اس پورے نظام سے کس طرح ہوتی ہے؟ آپ زیر درس آیت پہ آ جایئے۔کہا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (24:55) ان کا خوف امن سے بدل جائے گا۔عزیزان من! اس سے بڑی نعمت دنیا میں کوئی نہیں ہوسکتی کہ خوف امن سے بدل جائے۔سوال یہ ہے کہ یہ کس چیز کا نتیجہ ہے؟ آپ کو پتہ ہے کہ ایمان اور امن کا تو مادہ ایک ہی ہے: ''ام ن''۔ایمان واعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ امن ہونا چاہیے۔قرآن کہتا ہے کہ خوف کی جگہ امن مل جائے گا۔یعنی اگر یہ چیز نہیں ہے تو خوف ہے۔پوچھو نہیں' کتنا بڑا خوف ہوتا ہے! خوف کی تو شقیں ہی نہیں گنائی جاسکتیں۔انسانیت' شخصیت' انفرادیت (Humanity,Individuality,Personality) ہر چیز کچلی گئی ہوتی ہے۔اس میں تو يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ (28:4) ابنائے قوم ذبح کر دیئے جاتے ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ خوف ایسا ہے کہ چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے مگر موت آئے گی نہیں۔اوئی اوئی کرتا ہوا آدمی کہیں وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (2:167) ڈر کے بھاگ جاتا ہے اور قرآن کہتا ہے کہ وہ کبھی یہاں سے بھاگ بھی نہیں سکیں گے۔یہاں کہا ہے کہ اس نظام کے قیام سے ان کا خوف امن سے بدل جائے گا' ہر فرد کا خوف امن سے بدل جائے گا' ہر فرد مامون ہو: نہ حزن ہو' نہ خوف۔یہ نتیجہ ہوگا ایمان اور اعمال صالحہ کا۔یہ استخلاف فی الارض ہوگا۔اب سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کا ہے کے لیے ہوگا؟ کہا کہ اس لیے تا کہ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (24:55) یہ ہمارے اور صرف ہمارے قوانین کی اطاعت کریں اور ان پر کسی قسم کا جبر یا دباؤ نہ ہو کہ وہ اس کے ساتھ کسی اور کی بھی اطاعت کریں اور اس طرح شرک کے مرتکب ہوں۔

مذہب کی دنیا میں قرآن کا ترجمہ

عزیزان من! یہ آیت مذہب میں آئے گی تو آخری بات ہوگی لیکن آپ پہلے اس کا ترجمہ سن لیجیے۔کہا کہ یہ اس لیے ہے کہ وہ صرف میری پرستش (Worship) کریں' اس میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ارے اس کے لیے استخلاف فی الارض کی شرط ہے۔کیا اس میں تمکن فی الارض پرستش کے لیے ہوگا؟ انگریز کی حکومت میں اتنی آزادی تھی جو ہمیں ان تمام رسومات ادا کرنے کی اجازت تھی۔مذہب کے ارکان نماز' روزہ' حج' زکوۃ وغیرہ چھوٹی جماعتوں میں سکھائے جاتے تھے' پڑھائے جاتے تھے۔

بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹہ
سنکھوں کی صدا گونجتی ہے روز برادر

جن کی حکومت ہے ان کو تو وہ ساتویں دن اجازت ملتی ہے' مگر سنکھ والوں کو وہ اجازت صبح شام ہوتی ہے' انہیں کوئی بھی پنج واری دن اچ اللہ اکبر اللہ اکبر دی اجازت ہندی آ۔ ❶

کبریائی کا قرآنی مفہوم اور عبادت

عزیزانِ من! انہیں نہ یہ معلوم ہے کہ اس اکبر کے معنی کیا ہیں' اس کا مفہوم کیا ہے' نہ یہ پتہ ہے کہ کبریائی کس کو کہتے ہیں لیکن خوش ہیں کہ وہ پرستش (Worship) کی اجازت فرماتے تھے۔ وہاں انگریز کی حکومت میں یہ ہمارے نیشنلسٹ علماء کہتے تھے کہ ہمیں یہاں نماز روزہ حج زکوٰۃ کی پوری اجازت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تمکن فی الارض' استخلاف فی الارض ہے۔ پہلے یہ تمکن ہے' اس کے بعد یہ کیفیت ہوگی کہ تم یعبدوننی عبودیت اختیار کرو گے۔ اس آیت میں یہ لفظ عبدیت آ گیا جس سے آپ کے ہاں عبات کی اصطلاح مشہور ہوگئی اور اس کے معنی پرستش (Worship) ہو گئے۔ عبدیت کے جو معنی میں نے لیے ہیں' وہ فقط عبد سے ہیں۔ عبد تو اب بھی ہمارے ہاں غلام کو کہتے ہیں' اس کے معنی ہی محکومیت کے ہیں اور اس پہ پھر وہی بات تصریف آیات کی آ گئی کہ ہم قرآن کریم سے دیکھیں کہ ہم خدا کی کس قسم کی عبودیت اختیار کریں۔ قرآن میں خدا کہتا ہے کہ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا (24:55) کسی اور کا قانون اس کے اندر شامل نہ کرو' خالصتاً' خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ عبادت کے معنی محکومیت کے ہیں' عبد کہتے ہی محکوم کو ہیں۔ خدا کی محکومیت صرف اپنی مملکت میں ہوسکتی ہے۔ آگے بات یہ چلی کہ صاحب! خدا تو عرش پہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی حکومت' اس کی محکومیت' کس طرح سے ہوگی؟ قرآن اس کا بھی جواب بتاتا ہے۔ یہ کتابِ مفصل ہے۔ عزیزان من! جو بات آپ کے ذہن میں پیدا ہوگی کہ یہ کیسے ہوگا' اس کا جواب اس کے اندر ہے۔ پہلے تو یہ سن لیجیے کہ عبادت کے معنی' محکومیت کے ہیں' آپ سورۃ الکہف دیکھیے۔ اس میں ہے کہ لَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ❷ (18:110)۔ یہ عبادت کا لفظ آ گیا۔ کہا ہے کہ یہاں خدا کی عبادت میں لایشرک یعنی کسی کو بھی شریک مت کرو۔ یہی ہے وہ جہاں کہا ہے کہ شرک نہیں ہوگا' اس میں شریک نہیں کیا جائے گا۔ یہاں لفظ عبات ہے اور اسی سورۃ میں ہے کہ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِهٖٓ اَحَدًا ❸ (18:26)۔ اب اس آیت میں عبادت کی جگہ ''حکم'' کا لفظ آ گیا یعنی خدا اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ہی سورۃ کی دو آیتوں میں

---

❶ انہیں بھی دن میں پانچ بار اللہ اکبر (اذان اور نماز کی) اجازت ہوتی ہے۔
❷ اطاعت اور محکومیت صرف اپنے نشو ونما دینے والے کے قوانین کی کرو۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔684)
❸ تم اس کے قانون کے ساتھ' کسی اور کے قانون کو شریک مت کرو۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔664)

عبادت کا قرآن نے یہ ترجمہ دیدیا ہے۔ اب سورۃ یوسف میں آیئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے قید خانے کے ساتھی کو کہتے ہیں کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) یادرکھو! حکومت نہ فرعون کی ہے نہ نمرود کی۔ حکومت صرف خدا کی ہے خدا کے سوا کسی کی نہیں ہے۔ حکم سے حکومت کا لفظ آیا ہے۔ ابھی یہ آیت پوری نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ امر کا لفظ آیا ہے۔ اسی لیے اس کے بعد حکم دیا ہے کہ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (12:40) اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اسی ایک سانس میں ایک فقرے میں یہ حکم کا مفہوم آ گیا اور اس کے بعد ہے کہ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (12:40) یہ ہے دینِ قیم محکم دین قائم رہنے والا دین Established (ثبت شدہ) الدین یہ ہے۔ یہ ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (12:40)۔ اب بات صاف ہوگئی۔ ساری دنیا میں پوچھتے پھر رہے ہیں کہ صاحب! نظام مصطفیٰ ﷺ کا مطلب کیا ہے کہ جی نظام مصطفیٰ کا مطلب نظام مصطفیٰ ﷺ ہے۔

صرف خدا کی حکومت، صرف خدا کا نظام

عزیزان من! وہ دیکھیے یہ دو فقرے کہہ کے قرآن کہتا ہے کہ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (12:40) صرف خدا کی حکومت دینِ قیم ہے۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ خدا تو بقول ان کے عرش پہ ہے، بہرحال غیر مرئی ہے، غیر محسوس ہے، سامنے نہیں آتا، ہم اس کی آواز نہیں سنتے۔ جس کی آواز ہم نہ سن سکیں، جو سامنے نہ ہو اس کی حکومت کیسی! اس کی حکومت کے لیے تو ضروری ہے کہ کوئی محسوس چیز ہو۔ سنیئے عزیزان من! قرآن کریم چودہ سو سال پہلے کیا بات کہہ گیا ہے۔ دنیا ڈیڑھ ہزار سال کے بعد آہستہ آہستہ وہاں آئی ہے۔ پہلے تو قرآن کی بات سنیے کہ پھر خدا کی حکومت کیسے ہو۔ ہم تو اس کی بات نہیں سن سکتے، وہ سامنے نہیں آتا۔ کہتا ہے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن میں کہا کہ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا (6:114) کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حکم تسلیم کرلوں، اچھا! کیا تم یہ چاہتے ہو حالانکہ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (6:45) اس نے تمہارے پاس ضابطہ قانون اپنی طرف سے بھیج دیا ہے تو اس کے بعد میں خدا کے سوا کسی اور کی حکومت کیسے قبول کرلوں۔ مطلب کا پتہ لگ گیا کہ خدا کی محکومیت اس کی کتاب کی محکومیت کی رو سے کی جائے گی۔

ہزار سال بعد انسانی سوچ میں تبدیلی کے کچھ آثار

میں نے کہا تھا کہ ڈیڑھ ہزار یا ہزار سال کے بعد انسان وہاں آیا ہے یعنی چودہ سو سال پہلے دیئے گئے اصول کو آج، اس زمانے میں، محکومیت یا حکم، فرمانبرداری، کی شکل میں محسوس کیا۔ پہلے بادشاہ یعنی حکم دینے والا سامنے ہوتا تھا۔ انسان آہستہ آہستہ صدیوں کے تجربات کے بعد Rule of the Law (قانون کی حکمرانی) پر آیا کہ نہیں محکومیت قانون کی ہوتی ہے، کسی محسوس اتھارٹی کی نہیں کی جاتی۔ آج دنیا میں یہ دور دورہ ہے کہ قانون کی حکومت ہو۔ اب بھی ہمارے ہاں یہ جمہوری نظام میں سہی کہ پارلیمان میں کچھ لوگ بیٹھتے ہیں، ہم جو

اطاعت کرتے ہیں وہ قوانین کی اطاعت کرتے ہیں' ان میں سے کسی کے حکم کی اطاعت نہیں کرتے' قانون کی اطاعت کرتے ہیں۔ قرآن نے چودہ سو سال پہلے یہ کہا کہ تم پوچھتے ہو کہ خدا کی حکومت یا خدا کی محکومیت کیسے اختیار کریں تو کہا کہ سنو' اس نے تو ایک مفصل ضابطہ قانون بھیج دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ **فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ** (5:48) اب اے رسول! تو اس کتاب خداوندی کے مطابق حکومت قائم کر۔ کڑی سے کڑی ملتی چلی جا رہی ہے' عزیزان من! خود رسول اللہ ﷺ سے یہ فرمایا جا رہا ہے: آپ ﷺ بھی اپنی حکومت نہیں قائم کرنے آئے تھے' خدا کی حکومت کو Establish (قائم) کرنے کے لیے آئے' دینِ خداوندی کو متمکن کرنے کے لیے آئے۔ یہ کس طرح سے ہوتا تھا' اس کے لیے کہا کہ **فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ** (5:48) جو خدا نے نازل کیا ہے یعنی قرآن' اس کے مطابق حکومت قائم کرو۔

کفر کیا ہے؟ کافر کسے کہتے ہیں؟ اور مومن کی پہچان کیا ہے؟

اس کے بعد ایک کلیہ بیان کر دیا: تم پوچھتے ہو کہ کفر کسے کہتے ہیں' ایمان کیا ہوتا ہے' ان میں حدِ فاصل کیا ہے؟ سنیے عزیزان من! چار الفاظ میں بتا دیا کہ **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ** (5:44) جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' انہی کو تو کافر کہا جاتا ہے۔ پہلی چیز جو رسول ﷺ اللہ سے فرمایا گیا تھا' وہ یہ تھی کہ **فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ** (5:48) تو اے رسول! اس کتابِ خداوندی کے مطابق حکومت قائم کر۔ یہ بڑے اہم حوالے ہیں' عزیزان من! آپ دیکھتے ہیں کہ کڑی در کڑی ملتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ یہ ہے دین کے تمکن کا اصول۔ اس سے کیا چیز ہوئی؟ یہ کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے' اس زمین پر سلطنت' حکومت' آزادی' مملکت' اختیار و اقتدار ہے۔ یہ شرط اول کا لازمی نتیجہ ہے' یہ ایمان و اعمالِ صالحہ کی شرطِ اول ہے' یہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لیے ہر وقت اپنے ایمان اور اعمال صالحہ کو پرکھ کر دیکھو کہ کیا اس کا لازمی نتیجہ یہی آیا ہے۔ یہ نتیجہ دھاندلی' وراثت' دھوکا کا تو نہیں۔ ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ مملکت کا قیام ہے۔

تمکنِ دین کے معنی ہیں: خوف کو امن میں بدلنے کا طریق

اس مملکت کا' اس تمکنِ دین کا نتیجہ کیا ہے' غایت کیا ہے' غرض کیا ہے؟ تمکن دین کے معنی کیا ہیں؟ خوف کو امن سے بدلنے کا طریق کیا ہو سکتا ہے؟ وہ یہ ہے کہ محکومیت صرف خدا کی اختیار کرو۔ یہ کیسے اختیار کی جائے؟ وہ یہ ہے کہ اس کی کتاب کے مطابق قائم کرو۔ اے تے اس شخص [1] نے تت کڈ کے رکھ [2] دتا کہ

---

[1] اس سے مراد مفکر قرآن ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938) ہیں۔

[2] اس شخص نے اس کا عطر نکال کر رکھ دیا ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن ❶

مسلمان کی زندگی بسر کرنا چاہتے تو طریقہ یہ ہے کہ خدا کی کتاب یعنی قرآن کریم کے مطابق زندگی بسر کرو اور یہ انفرادی نہیں ہوسکتی' اجتماعی ہے' غیر کی محکومیت میں نہیں ہوسکتی' اپنی آزاد مملکت میں یعنی استخلاف فی الارض میں ممکن ہے' اسی سے تمکن حاصل ہوسکتا ہے۔ ہم نے یہ کہہ دیا ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا لیکن اسے اچھی طرح سن رکھو کہ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک یہ قوم ہمارے قوانین پر عمل پیرا رہے گی۔ **وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ** (24:55) اور جو یہ سب کچھ دیکھ لینے' سن لینے' کے بعد بھی رسول کے ہاتھوں قائم ہونے والی اس مملکت سے انکار کرے' کفر کی راہ اختیار کرے تو وہ اس شاہراہ حیات کو چھوڑ کر جو اپنے صحیح منزل کی طرف لیے جا رہی تھی اور راہوں کی طرف نکل جائے گا۔

فاسق کا قرآنی مفہوم

عزیزان من! (24:55) میں ایک لفظ ''فاسق'' آیا ہے۔ ہمارے ہاں تو ''فاسق'' کو کافر سے بھی بہت نیچے لے آتے ہیں۔ فاسق اور فاجر روز بولتے ہیں۔ کفر کا فتویٰ ہر فرقے پر لگا ہوا ہے۔ آپ کے ہاں جتنے فرقے ہیں ان میں سے ہر فرقے پہ دوسرے فرقے نے کفر کا فتویٰ لگایا ہوا ہے حتیٰ کہ یہ جو متحدہ طور پہ اب نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں' ان میں سے ہر فرقے کے اوپر دوسرے فرقے نے کفر کا فتویٰ لگایا ہوا ہے۔ یہ سارے ''کافر'' مل کر نظامِ مصطفیٰ ﷺ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ اللہ' میں تو کفر کے فتوے کا کسی کو حق نہیں دیتا۔ میں تو کسی کو بھی یہ نہیں کہہ سکتا' یہ ایک فیصلے کا معاملہ ہے۔ کفر کے معنی ہیں کہ وہ ہماری مملکت کا Citizen (شہری) نہیں ہوسکتا۔ یہ ہے معنی کفر کے۔ یہ فیصلہ تو مملکت کر سکتی ہے۔ میں تو نہیں کر سکتا' مولوی فتح اللہ تو نہیں کر سکتا' مملکت کرے گی۔ وہ اس کو Define (متعین) کرے گی کہ اس مملکت کی Citizenship (شہریت) کی Qualification (اہلیت) کیا ہے۔ جسے وہ کہے گی کہ یہ Citizen (شہری) نہیں ہوسکتا مملکت کی اصطلاح میں اسے کافر کہا جائے گا۔ اس مملکت کے قوانین کو جو نہ ماننے والا ہے وہ یہ کچھ کرے تو **فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ** (24:55) وہ فاسق ہوگیا۔

یہ فسق ❷ کیا چیز ہے' کاہے کے لیے یہ سارا کچھ ہے؟ عزیزان من! قرآن کریم نے ایک لفظ کے اندر پھر ساری بات کر دی کہ ہم

---

❶ تمہارے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار ہے ہی نہیں کہ تم اپنی فردوس گم گشتہ کو بازگر حاصل کرنے کے لیے قرآن کریم ہی کی بارگاہ عالیہ پر دستک دو۔

❷ فسق کے معنی ''دائرہ حق سے باہر نکل جانا'' کے ہیں۔ فسقت الرطبۃ عن قشرہا۔ گدری کھجور اپنے چھلکے سے باہر نکل گئی۔ کھجور کے پھل کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے' جس کے اندر وہ پھل نشوونما پاتا اور پختگی تک پہنچتا ہے۔ یہی صورت ہر پھل کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ چھلکا گویا اس پھل کا قالب (Pattern) ہوتا ہے جس کے اندر اس کی صلاحیتوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ پھل ایک طرف سے چھلکے [باقی اگلے صفحے پر]

ایک نظام (System) دے رہے ہیں۔ اسے انگریزی میں Pattern (قالب) کہتے ہیں۔ یہ ایک لفظ ہے۔ وہ مولڈ کرنے والے Pattern یعنی قالب خود بناتے ہیں۔ پہلے وہ ایک قالب بنا لیتے ہیں۔ پھر اس کے اندر لوہا جو چیزیں بھی بنانی ہوں' ڈال کر بناتے ہیں یا مٹی کے مولڈ بھی ڈھالتے ہیں۔ وہ چیزیں اس شکل میں تیار ہو جاتی ہیں جو اس قالب کی ہوتی ہے۔ یہ جس سے چیزیں بنائی جاتی ہیں' پیٹرن (قالب) ہوتا ہے۔

انسان وہ کچھ بن جائے جو کچھ خدا انسان کے لیے چاہتا ہے

مسلمانوں کے لیے یہ Pattern (قالب' نمونہ) قرآنِ کریم کا تیار کردہ ہے۔ قرآن کے اس قالب کے اندر خدا جس قسم کا بنانا چاہتا ہے تو اس قسم کا بن جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سارا کچھ کاہے کے لیے ہے؟ خدا کی حکومت کاہے کے لیے ہے؟ دنیا کی حکومتیں تو حاکموں کے لیے ہوتی ہیں مگر یہ ایک خاص پیٹرن ہمیں ڈھالنے کے لیے ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تو سب کچھ تمہارے لیے ہوگا کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (3:97) اللہ تو تمام کائنات سے مستغنی ہے۔ اس نے اپنی یہ حکومت کاہے کے لیے قائم کرنی ہے' اپنی عبودیت یا عبادت کیوں کرانی ہے' اسے اس چیز کی کیا احتیاج پڑی ہوئی ہے' کیوں وہ زور دے رہا ہے کہ اسے مانو' اونے کوئی الیکشن لڑنا ہیگا یا ووٹاں دی لوڑ پئی ہوئی ہے اونہوں' اک اک دیا منتاں کردا پیا ہیگا؟ ❶ معاذ اللہ معاذ اللہ یہ نہیں ہے۔ وہ مقصد و غایت یہ ہے جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ فِیْهِ ذِكْرُكُمْ (21:10) او' اس میں تو ہم نے تمہارے ہی شرف و مجد کی بات کہی ہے' اپنے لیے تو کچھ نہیں کہا۔ مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا' ❷ نے ایک پیٹرن (قالب) عطا کیا ہے۔ یہاں لفظ ذکر آیا ہے۔ ذکر عربی زبان میں شرف و مجد کو کہتے ہیں۔ جس پیٹرن کے اندر رہتے ہوئے کسی کی نشو و نما ہو جاتی ہو' اس کو پھاڑ کے دوسری طرف نکل جانا فسق ہے۔ یہ لفظ عرب استعمال کرتے تھے۔ کھجوروں کے اوپر خول ہوتا ہے' ہر پھل کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے۔ پھل بعد میں پکتا ہے۔ اس وقت تو وہ چھلکا ہوتا ہے'

[گزشتہ سے پیوستہ]----------

سے باہر نکل جاتا ہے اور اس طرح اپنی پختگی تک نہیں پہنچتا۔ عرب اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے فسقت الرطبۃ عن قشرہا کہتے تھے۔ جاہلیت عرب میں یہ لفظ اسی مفہوم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ انسانوں کے لیے نہیں بولا جاتا تھا (تاج العروس و محیط المحیط)۔ قرآنِ کریم نے اسے انسانوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ (ماخوذ از لغات القرآن: پرویزؒ ص ص 1284-1283)۔

قرآنِ کریم ایک ایسا نظامِ معاشرہ یا زندگی کا قالب عطا کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے افراد کی صلاحیتوں کی صحیح صحیح نشو و نما ہو جاتی ہے۔ جو فرد یا گروہ اس نظام (System) کے قالب سے باہر نکل جائے اُسے فاسق کہتے ہیں۔ لہٰذا ہر شخص جو قانونِ خداوندی کے قالب سے باہر نکل جائے وہ فاسق ہے۔ (پرویزؒ: لغات القرآن (جلد سوم)' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1961ء' ص ص 1284-1283)

❶ کیا اس نے کوئی الیکشن لڑنا ہے یا اسے ووٹوں کی ضرورت آپڑی ہے جو ایک ایک کی منتیں کرتا پھر رہا ہے؟

❷ اقبالؒ کا یہ پورا شعر یوں ہے:

محمدؐ بھی ترا' جبریل بھی' قرآن بھی تیرا مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟ (بال جبریل)

ہم یہی سمجھتے ہیں کہ اسے اتار پھینکنا چاہیے۔ وہ پھل اپنی پختگی تک اس چھلکے کے اندر ہی پک سکتا ہے۔ اگر وہ چھلکا کہیں پھٹ جائے تو وہ پھل پختگی تک پہنچ نہیں سکتا' اسے کیڑا لگ جاتا ہے' سڑ جاندا اے' گل جاندا اے' ساڈے ورگا بن جاندا اے۔ ❶ یہ جو اس کے اوپر چھلکا ہوتا ہے جس کے اندر وہ نشوونما پا کر پختگی تک پہنچتا ہے' اس چھلکے کو توڑ کر نکل جانے کو وہ فسق کہتے ہیں۔ اسی لیے کہا کہ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (24:55) جو اس سے انکار کرے گا وہ اس چھلکے سے' اس پیٹرن' سے نکل گیا جس کے اندر اس کی نشوونما ہونی ہے۔ عزیزان من! قرآن سے یہ استخلاف فی الارض حاصل ہو گیا تھا۔

قرآن صرف دماغی چیز نہیں' اس کی راہنمائی شعور کی طالب ہے

یہ قرآن کوئی نظری (Theoretical) چیز نہیں ہے۔ اسے صرف دماغی چیز نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ اسے اصل میں' شعور کے ذریعے سے' دل کی گہرائیوں کے اندر اترنا چاہیے۔ جب یہ دل کی گہرائیوں میں اترتا ہے تو طبعی زندگی بھی ایک جان ہو جاتی ہے' وہ جان بھی Life (زندگی) ہوتی ہے۔ وہ طبعی صورت تو موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ اس میں جان ہی کچھ اور ہو جاتی ہے' وہ لایموت ہو جاتی ہے' موت سے بھی نہیں مرتی۔ یہ جو باہر کا جہان ہے وہ تو اندر کی جو آپ کی کیفیت ہے' اسی کا پرتو باہر ہوتا ہے۔ وہ جو اس دن بھی میں نے جشن نزول قرآن کے موقع پر کچھ دو چار شعر کہے تھے' وہ بات صاف ہے کہ جیسی اندر کی کیفیت ہوتی ہے' باہر کا جہان اسی کا پرتو ہے:

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی' نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی سبب نشاطِ بہار ہے

یہ تو دل کی شگفتگی ہے اور دوسری طرف وہ جو شاعر ہے' وہ کیا کہتا ہے' صاحب!

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

اس سے کفر اختیار کرنے والو! اپنا دل اداس ہوتا ہے' خوف طاری ہوتا ہے' سارا شہر' ساری دنیا' سائیں سائیں کرتی ہے اور اس سے جو دل کی شگفتگی حاصل ہوتی ہے' وہ سبب نشاط بہار ہو جاتی ہے اور اگر وہ پیٹرن نہ رہے تو پھر یہ پختگی حاصل نہیں ہوتی۔ پھل کسی اور طرف نکل جاتا ہے۔ یہ جو لفظ ''تولیٰ'' آیا تھا تو عربی زبان میں ''تولیٰ'' کے معنی ہوتا ہے: سیدھا راستہ چھوڑ کے یوں نکل جانا' کنی کترا کے یوں نکل جانا۔ یہی فسق ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا کہ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (24:55) یہی تو ہیں جنہیں فاسق کہتے ہیں۔ اب وہ بات آ گئی کہ یہ

---

❶ یہ گل سڑ جاتا ہے' ہماری طرح کا بن جاتا ہے۔

دین کا تمکن' یہ استخلاف فی الارض' یہ خوف کا امن سے بدلنا' یہ عبودیت خداوندی بغیر شرکت غیرے' یہ اس پیٹرن کے اندر رہنا' جن کو یہ کچھ حاصل ہو جائے تو وہ کیا کریں گے؟ اس کے لیے کہا کہ وہ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (24:56) قائم کریں گے۔

مروجہ اسلام' انگریز کی محکومیت اور آسان ترین جنت کا حصول

یہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ اور اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ان شرائط کے بعد کوئی عملاً کرنے کی چیز تھی۔ عزیزان من! اب بقول ان کے کتنا آسان ہو گیا کہ انگریز کی محکومیت میں' ہندو کی جمہوریت کے اندر' یہاں غیر منقسم پاک و ہند میں بیٹھے ہیں' اسلام پہ عمل ہو رہا ہے' مطمئن ہو رہے ہیں کہ صاحب! عمل ہو رہا ہے' اقامت صلوۃ بھی ہو رہی ہے' ایتائے زکوٰۃ بھی ہو رہی ہے۔ بھئی! اقامت صلوۃ کے لیے تو کہتے ہیں کہ نماز پڑھو اور آج اس کے لیے وہ کہتے ہیں کہ صلوٰۃ قائم کرو۔ چلو جی یوں ترجمہ کر لو' لیکن قرآن نے جو پہلے یہ شرطیں دے رکھی ہیں یہ تو پھر ساری ختم ہو گئیں۔ کہتے ہیں کہ کیا کبھی آپ نے کسی واعظ کے وعظ کے اندر بھی سنا ہے کہ وہ سورۃ النور کی آیت کی یوں کڑیاں بیان کر رہا ہو؟ میں نے اس ایک آیت استخلاف فی الارض میں کچھ کہا تھا' عزیزان من! شک ہو تو مجھ سے پھر پوچھیے کہ درمیان میں ایسی کوئی کڑی رہ گئی ہے جس کے بغیر یہ سلسلہ تکمیل تک نہیں پہنچ رہا۔ یہاں پہلے کہا ہے کہ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ [1] (24:56) اور پھر آگے کہا ہے کہ یہ چیز انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ [2] (24:56) ہو۔

دین کی غایت اور مقصودِ زندگی

بقول ان کے اب یہاں پہنچ کر اطاعت ہو رہی ہے اور اس میں پھر وہی بات آ گئی کہ پھر یہ اطاعت یوں ہے کہ گویا رسول حاکم بن گیا' اس کی اطاعت کی گئی تا کہ اس کے جذباتِ حاکمیت کی بھی تسکین ہو۔ کہا کہ نہیں' یہ اس لیے ہے: لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ (24:56) تا کہ تمہاری نشوونما ہو سکے۔ یہ ہوئی غایتِ آخری' عزیزان من! دین کی غایت یہ ہے کہ ایک فرد کی اتنی نشوونما ہو سکے کہ جو کچھ اس کا اس صفحہ ارض کے اوپر آخری مرتبہ بننا مقصود ہے' آخری شکل جو اس نے اختیار کرنی ہے' وہ کر لے' یہ شکل وضع قطع نہیں' اس کی انسانیت نے جو شکل اختیار کرنی ہے وہ کر لے' جس تکمیل تک اس نے پہنچنا ہے' وہاں تک پہنچ جائے اور وہاں تک پہنچنے کے لیے سامان آسائشیں ضروریات تمام مہیا ہوں اور اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ خوف نہ ہو' اس کی جگہ امن ہو۔

---

[1] نظام صلوٰۃ قائم کرو اور اپنے معاشرے کو ان خطوط پر متشکل کرو جن سے نوع انسانی کو زیادہ سے زیادہ سامانِ نشوونما ملتا جائے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔811)

[2] (تم اپنے اجتماعی نظام کے مرکز) رسول کی اطاعت کرو۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔811)

خوف انسان کی تمام صلاحیتوں کو پامال کر دیتا ہے

عزیزان من! خوف میں تو انسان کی کوئی ایک صلاحیت بھی نشوونما نہیں پا سکتی چہ جائیکہ تمام صلاحیتیں نشوونما پا کر اس صفحہ ارض پر، جس آخری حد تک اس نے پہنچنا ہے، پہنچ جائے۔ یہ ہے ''ترحمون''۔ اور پھر آپ کہیں گے کہ یہاں یہ آیا ہے تو میں خود ہی کیوں نہ بیان کر دوں کہ یہ ''ترحمون'' یہاں کیوں آیا۔ اس کی جگہ بیس الفاظ آ سکتے تھے۔ زکوٰۃ تو خود اس نشوونما دینا کے معنی میں آتا ہے۔ سامان نشوونما باہر سے کوئی نہیں دیتا۔ آپ کو اگر کوئی ذرا سی چیز دیتا ہے تو عمر بھر کے لیے آپ کے اوپر احسان دھر دیتا ہے اور آپ ساری عمر ان کے شرمندہ احسان ہو جاتے ہو۔ تو لو، پہلی چیز تو شرمندگی ہو گئی تو کیا شرمندگی اور احسان کے اس تصور سے، انسانیت نشوونما پا سکتی ہے؟ نہیں، قطعاً نہیں۔

عمر بھر کے لیے غلام بے دام

عزیزان من! اس احسان کرنے کے بعد تو ساری عمر کے لیے یوں ہوتا ہے کہ یہ ہے ہی طوطا چشم۔ نہ ہووے تے یاد ہے نا اودن، جس دن آیا سیں روندا ہویا، تے پیسہ کوئی نہیں سی، تے بچے بھکے مر رہے نیں۔ یاد ای نا، ٹھیک ہے نا، اوس دن بچایا سی نا تینوں، تے آج اکھیاں ای بدلدا پیا ہے کہ جی! نہیں، میں ووٹ تہانوں تے نہیں، اونوں دیاں گا جنوں چنگا سمجھدا ہیگاں۔ ٹھیک ہے بھئی! میں ہی ایہو جیا سی۔ ❶ ساری عمر کے لیے اب وہ آپ کا غلامِ بے دام بنا کہ صاحب! آپ نے ایک دفعہ احسان کر دیا، کچھ مدد کی۔ ماں بھی بچے کی نشوونما اس جذبے کے ساتھ کرتی ہے کہ اس کا جی چاہتا ہے کہ میں سارے کا سارا بچے کے اندر انڈیل دوں۔ بچہ کبھی دودھ نہیں پیتا تو جا جا کے حکیم سے دوائیاں پوچھتی ہے، اینوں بھک نہیں لگدی ہیگی۔ ❷ اندازہ لگائیے۔ کہتی ہے کہ وہ کھانے کے لیے تقاضا نہیں کرتا۔ احساس یہ ہے کہ اتنا کیوں نہیں کھاتا۔ ٹونے ٹوانے کراندی پھر دی ہیگی اے۔ اے سکدا جاندا پیا اے، بھک نہیں لگدی۔ ❸ یعنی یہ اس کا جذبہ مرحمت ہے اور پھر میں نے کہا ہے کہ وہ بچہ اس کے جسم کا ایک جزو ہے۔ جس کو وہ دودھ کی شکل کہتی ہے وہ یہاں سے ہی نہیں، قرآن تو پیچھے سے شروع کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہاں تو پھر بھی اس کو یہ کرنے کا احساس ہے، رحم کے اندر تو اس کو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا، آہستہ آہستہ، ایک اور جنین، بن رہا ہے، ایک بچہ بن رہا ہے۔ وہ اسے اپنے جسم کا ایک حصہ بناتی چلی جاتی ہے۔ پیدا ہوتا ہے تو خوشیاں مناتی ہے، جھوم جھوم جاتی ہے کہ او میرے جسم دا اک حصہ ہیگا۔ اوسے ویلے خوشیاں منا رہی ہے۔ ❹ اس قسم کی نشوونما کا جو اس کے اندر کا تقاضا ہوگا،

---

❶ یاد ہے وہ دن جب تو روتے ہوئے آیا تھا کہ کوئی پیسہ نہیں ہے، بچے بھوکے مر رہے ہیں۔ تجھے یاد ہے کہ اس دن ہم ہی نے تجھے بچایا تھا۔ آج آنکھیں پھیر لی ہیں کہ نہیں جی، ووٹ تمہیں نہیں دوں گا، ووٹ اسے دونگا جسے اچھا سمجھوں گا۔ ٹھیک ہے بھئی! میں تھا ہی ایسا۔

❷ اسے بھوک نہیں لگتی۔ ❸ گنڈا تعویذ کراتی پھرتی ہے کہ سوکھتا جاتا ہے، اسے بھوک نہیں لگتی۔

❹ کہ وہ میرے جسم کا حصہ ہے۔ اسی وقت خوشیاں منا رہی ہے۔

پہلے تو اس کا احساس تک نہ ہو' نشو ونما پا کر ایک صحیح الجسم توانا بچہ پیدا ہو جائے تو اس کے بعد خوشیاں منائے پھر اس کے بعد جب تک اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی' اپنے جسم کو انڈیل انڈیل کے اس کے اندر ڈالتی چلی جائے۔ اسے کہتے ہیں ترحمون۔ رِحم یہیں سے تو نکلا ہے' یہ سب اس لیے ہے کہ **لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ** (24:56) وہ جو اس طرح نشو ونما' جہاں سے ہو رہی ہے' اس نظام کی طرف سے' یہ نہیں ہے کہ وہ تم سے احسان رکھے گا' وہ اطاعت لے گا' وہ تو یوں نشو ونما کرے گا جیسا جنین کی نشو ونما رحم مادر میں ہوتی ہے۔ کہا کہ جس طرح ماں بچے کی نشو ونما کرتی ہے اس طریق سے تمہاری نشو ونما ہوگی۔ یہ دین اس طرح سے' اس تمکن کی عملی شکل اختیار کرے گا۔

عزیزان من! آگے ایک ہی آیت میں دو لفظ اور بیان کر دوں' وقت تو ختم ہو گیا ہے۔ وہ الفاظ یہ ہیں: **لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ** (24:57) یہ جو اس نظام سے انکار کرنے والے ہیں' ان کے پاس قوت و اقتدار ہے۔ وہ اپنے ذہن میں یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم اپنی قوت کے بل بوتے پر ان کو شکست دیدیں گے' مغلوب کر دیں گے' عاجز کر دیں گے۔ یہاں کبھی یہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ دعویٰ اس زمانے میں کیا جا رہا ہے جب ابھی مکی زندگی بسر ہو رہی ہے: ان سے کہ دو' اعلان کر دو' انہیں پتہ نہیں ہے کہ ہمارے پاس وہ کیا ذریعہ ہے جس کی رو سے ہم مملکت حاصل کر رہے ہیں۔ وہ ہے ایمان اور اعمال صالحہ:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ان سے کہ دو کہ **لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا** کبھی اس کا گمان بھی نہ کریں کہ یہ تمہیں شکست دیدیں گے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

کفار کی محکومیت اور روحانیت کی ترقی دو متضاد چیزیں ہیں

مومنین کی ایک اور نشانی ہے' عزیزان من! وہ ہے (4:141)۔ سن لیجیے اور پھر ماپتے جائیے۔ کفار کی حکومت کے اندر اسلامی زندگی بسر کرنے والوں سے پوچھیے کہ **وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** (4:141) یہ ہو ہی نہیں سکے گا کہ مومنین پر کبھی کافر غالب آ جائیں' یہ ہو ہی نہیں سکے گا: **لَنْ يَّجْعَلَ** (4:141) خدا بھی یہ نہیں کرے گا کہ مومنین پر کفار کو غالب کر دے۔ یہ کفار کی محکومیت میں زندگی بسر کرتا ہے اور کہتا یہ ہے کہ ہم نے اتنی روحانیت حاصل کی کہ بڑھتے بڑھتے نبی بن گئے ہیں۔ جناب! یہ کفار کی محکومیت میں زندگی بسر کرنا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ مومنین پر کفار غالب ہو جائیں۔ جن کے اوپر کفار غالب آ جائیں' سیدھی سی بات ہے کہ وہ مومنین کی کیٹیگری میں نہیں آ سکتے۔ بات سیدھی ہے۔ مومن کی کیٹگری میں نہیں آ سکتا چہ جائیکہ وہ اولیا اللہ بن جائیں' مجدد بن جائیں۔ ان کو تو چھوڑیئے' قرآن تو یہ کہتا ہے کہ وہ مومنین کی صف میں بھی نہیں آ سکتے اور اسی لیے تو اس نے یہ کہا تھا کہ

پہلے بندے دا پتر تے بن، فیر اللہ دا بنیں۔ ❶ تو تو انسان کی سطح پر بھی نہیں پہنچا، خدا کو تلاش کیوں کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا۔ خدا بھی یہ نہیں کرے گا کہ کبھی مومنین پر کفار کو غالب کر دے۔ اس لیے کہا کہ ان سے کہہ دیجیے کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ اس گمان میں نہ رہیں کہ ہمارے پاس بڑی قوت ہے اور یہ مکی زندگی والی ایک کمزور سی قوم ہے، ان کے پاس کچھ بھی نہیں، کھانے تک کو نہیں، گھروں سے نکال دیا ہے۔ یہ گمان بھی نہ کر لیں کہ ان کے اوپر غالب آ جائیں گے۔ یہ انہیں پتہ نہیں ہے کہ ان کے پاس کونسی قوت ہے وَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (24:57) ان کو بتا دو کہ آخر الامر تمہاری زندگی جہنم کی زندگی ہے، یہ بہت برا ٹھکانہ ہوگا جہاں تم لوٹ کر جاؤ گے۔

عزیزان من! ہم سورۃ النور کی آیت 57 تک آ گئے۔ 58 آیت بعد میں لیں گے۔ میرا یہ خیال ہے کہ آیہ استخلاف کی اس ایک آیت میں، اس نظام کی، الدین کی، ساری کڑیاں اور مومن بننے کی جو شرائط ہیں، محسوس طریقے پر، نچڑ کر، سمٹ کر، آ گئی ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ

❀❀ ..... ❀❀❀ ..... ❀❀

---

❶ پہلے انسان سطح حیات تک پہنچ، پھر خدا کا رفیق بن۔

دسواں باب: سورۃ النور (آیت 58 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۫ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَیْسَ عَلَیْكُمْ وَلَا عَلَیْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَیْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰی بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۵۸﴾ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْیَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۵۹﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ؕ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۶۰﴾ لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُیُوْتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِیْقِكُمْ ؕ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَیِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۲﴾ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۶۳﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ یَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَیْهِ ؕ وَیَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْهِ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۶۴﴾

عزیزانِ من! آج دسمبر 1977ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النور کی آیت 58 سے ہو رہا ہے: (24:58)۔

دین اور سیاست ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس کی پچھلی آیات میں آیۃ استخلاف فی الارض پر بات کی تھی اور اس میں 'جسے آج کی اصطلاح میں سیاست کہتے ہیں' سیاست کے بلند ترین اصول اور مبادیات تک بھی بتا دیئے گئے تھے۔ میں نے آج کی اصطلاح میں اسے سیاست اس لیے کہا ہے کہ اب تو مذہب کو سیاست سے الگ کیا جاتا ہے لیکن قرآنِ کریم جب الدین کہتا ہے تو اسمیں یہ تفریق وتمیز یا ثنویت (Dualism) باقی ہی نہیں رہتی۔ سچ پوچھیے تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اسلام میں دین اور سیاست ایک ہیں۔ جب دین کہا جاتا ہے تو زندگی کا ہر شعبہ اس کے اندر آجاتا ہے' سیاست خود بخود اس کے اندر آجاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو پھر مذہب اور سیاست الگ الگ ہو جاتے ہیں لیکن الدین کے اندر تو سیاست خود بخود آجاتی ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم میں الگ سیاست کا

لفظ نہیں آیا' نہ ہی اس کا تصور آیا ہے۔

سیاست دین کے تمکن کا ایک ذریعہ ہے

قرآن الدین ہی کا تصور دیتا ہے اور اسی لیے آپ نے دیکھا تھا کہ جب وہ استخلاف یعنی اس زمین پر ملک میں اقتدار کہتا ہے تو اس کا مقصد تمکن دین بتاتا ہے یعنی دین کا تمکن۔ آج کی اصطلاح میں تو ہم یہ کہیں گے کہ مملکت یا حکومت سیاست کا شعبہ ہے لیکن وہ یہ بتاتا ہے کہ جب ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں استخلاف حاصل ہوتا ہے یعنی حکومت حاصل ہوتی ہے تو وہ اس لیے ہوتی ہے کہ دین کا تمکن ہو سکے۔ گویا اب ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ آج کی اصطلاح میں سیاست دین کے تمکن کا ذریعہ ہے' مقصود بالذات دین کا تمکن ہے' سیاست نہ ہو تو دین کا تمکن نہیں ہوسکتا اسی لیے قرآن دین اور سیاست کو الگ الگ شعبوں میں نہیں بانٹتا بلکہ الدین کی ایک جامع اصطلاح استعمال کرتا ہے جس میں زندگی کا ہر گوشہ آجاتا ہے اور اب یہ سمجھانے کے لیے کہ اس میں زندگی کا ہر گوشہ آجاتا ہے آپ دیکھیے کہ قرآن کس لطیف پیرائے میں یہ بات بیان کرتا ہے۔

روزمرہ کی زندگی کے معمولات اور قرآنی ہدایات

پچھلی آیت میں تو استخلاف فی الارض زیر درس تھا جس میں مملکت کے قوانین بتائے گئے تھے' حکومت کے آداب و انداز بتائے گئے تھے' مقاصد و منتہٰی بتائے گئے تھے' اتنے عظیم سیاسی امور سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی اور اس سے اگلی ہی آیت میں آپ دیکھیے کہ آج کے روزمرہ کی زندگی کے اصول اور آداب شروع ہو گئے۔ مقصد ہی یہ بتانا تھا کہ قرآنِ کریم زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ اگر پہلی آیت کے اندر سیاستِ مدن کے بلند ترین' عظیم ترین' اصول بیان کیے ہیں تو اس کی اگلی ہی آیت میں روزمرہ کی زندگی کے' عام معمولات کی زندگی کے' آدابِ معاشرت بیان کیے گئے ہیں جس سے مقصد یہ بتانا تھا کہ عظیم ترین سیاسی امور اور روزمرہ کے معمول کے مطابق آدابِ معاشرت سب اس میں شامل ہیں۔ اب بات کی ہے کہ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وَ الَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ** (24:58) اے جماعتِ مومنین! اسے بھی سمجھ لو کہ گھر میں تم رہتے سہتے ہو' گھر میں نوکر چاکر بھی رہتے ہیں' بچے بالے بھی ہوتے ہیں جو ابھی سن بلوغت کو نہیں پہنچے' وہ گھروں میں چلتے پھرتے ہیں' خلوت ضروری ہے اس لیے تین اوقات میں یہ اجازت لے کر تمہارے کمرے میں آئیں۔

گھر کے اندر خلوت (Privacy) کا خیال رکھنا ہوگا

آپ کو یاد ہے' پہلے یہ کہا گیا تھا کہ جب وہ کسی کے گھر میں داخل ہوں تو اجازت لیں۔ اب یہ گھر کے ملازم یا یہ چھوٹے بچے ہیں۔ یہ تو نہیں ہے کہ آپ کے گھروں کے کمروں میں' ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں' جائیں تو ان کو اجازت لینی پڑے۔ وہ تو اہلِ

خانہ کی طرح گھروں کے اندر چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ یہ گھروں کے اندر چلتے پھرتے رہتے ہیں لیکن Privacy (خلوت) بڑی ضروری چیز ہے۔ اس لیے کم از کم تین اوقات ایسے ہیں جن میں اگر انہوں نے جس کمرے میں تم ہو یا گھر کے بڑے ہیں جب یہ ان کمروں میں ان اوقات میں آئیں تو اجازت لیں۔ کہا کہ **مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ** (24:58) نمازِ فجر سے پہلے یعنی تم اٹھ بیٹھے ہو سونہیں رہے عشاء کی نماز کے بعد یا دوپہر کے وقت جب تم کمر ٹیکنے کے لیے لیٹ جاتے ہو۔ کہا کہ ان اوقات میں تم پورے کپڑے پہنے ہوئے نہیں ہوتے۔ تم لوگ گھر کے رہنے والے مرد ہوں یا عورتیں ان اوقات میں پورے کپڑوں میں نہیں ہوتے لہٰذا ان اوقات میں یہ گھر میں کام کاج کرنے والے حتیٰ کہ بچے بھی ان اوقات میں اگر تمہارے کمروں میں آنا چاہیں تو انہیں چاہیے کہ دروازہ کھٹکھٹا لیا کریں اجازت مانگ لیا کریں۔ اب اس سے آپ یہ دیکھیے کہ کہاں استخلاف فی الارض کے وہ اصولِ سیاسی ہیں اور اس کے ساتھ ہی کہاں یہ روزمرہ کی زندگی کے قوانین ہیں۔ آپ بظاہر کہیں گے کہ یہ تو بڑے چھوٹے چھوٹے معاملات ہیں لیکن قرآن کی ہدایت کی جامعیت دیکھیے کہ وہ ان چھوٹے چھوٹے امور کے متعلق بھی ہدایات دیتا ہے۔ دوسری چیز اس سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جو قرآن کی اولیں مخاطب قوم تھی اس کی تمدنی حالت کیا تھی یعنی وہ اس انداز کے تھے جیسے آج کی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ وہ گنوار واقع ہوئے تھے کہ انہیں یہ بھی وحی کے ذریعے بتانا پڑتا تھا کہ Privacy (خلوت) کا خیال کیا کرتے ہیں: دوسروں کے ہاں جاؤ تو اجازت لو اجازت نہ دیں تو برا مت مناؤ واپس آ جاؤ اپنے ہی گھروں کے اندر جن اوقات میں گھر کے بڑے مرد یا عورت ایسی حالت میں ہوں کہ وہ پورے کپڑے نہ پہنے ہوئے ہوں تو ان اوقات میں گھر کے اندر کام کاج کرنے والے حتیٰ کہ گھر کے بچے بالے بلا اجازت ان کمروں میں نہ آیا کریں تو گویا یہ بات بھی ہے کہ قرآن کو ان لوگوں کو بھی جو قرآنِ کریم کی اولیں مخاطب قوم تھی یہ کچھ سمجھانا پڑا حتیٰ کہ یہ کچھ بتانا بھی پڑا۔

کھانے کی دعوت کے سلسلے میں ہدایات کی اہمیت

اس کے ساتھ ہی سورہ احزاب کی یہ بات ذہن میں آ گئی کہ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ** (33:53) دیکھو تمہیں سمجھائیں رسول تمہیں کھانے کی دعوت دیا کریں تو ان کے یہ کہے بغیر کہ آؤ بھئی! کھانا تیار ہے یونہی اندر نہ گھس آیا کرو۔ اب دیکھیں کہ نقشہ کیسا کھنچا ہے کہ اندر چلے گئے ہیں بیٹھے ہوئے ہیں قرآن کا انداز دیکھیں کہ کہا ہے کہ ہنڈیا ابھی چولہے پہ چڑھی ہوئی ہے اور تم وہاں جا کر بیٹھ گئے ہو۔ کہا کہ دیکھو اس سے کتنی دقت ہوتی ہے۔ یہ نہ کیا کرو۔ کھانے پہ بلایا گیا ہے طعام کی تمہیں دعوت دی گئی ہے تو کھانے کے وقت میں باہر بیٹھا کرو اور جب وہ آواز دیں تمہیں بلائیں کہ آؤ بھئی! کھانا تیار ہے تو پھر اندر جایا کرو۔ یونہی نہ تم اندر بیٹھے ہوئے سامنے تک رہے ہو اور آگے یہ کہا ہے کہ **فَاِذَا طَعِمْتُمْ**

فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ (33:53) جب کھانا کھا چکو تو باہر آ جایا کرو، وہیں بیٹھے ہوئے گپ شپ نہ ہانکتے رہا کرو، تمہیں پتہ نہیں کہ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ (33:53) اس سے نبی کو، نبی کے اہلِ خانہ کو بڑی تکلیف ہوتی ہے اور یہ کہ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۫ وَ اللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ (33:53) وہ شرماتا ہے کہ اب ان لوگوں سے کیا کہا جائے، گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ تو شرماتا ہے لیکن خدا حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔ کیا بات ہے صاحب! کیا انداز ہے! یہ کتنا پیارا انداز ہے! نبی کا تعلق ملاحظہ فرمایئے کہ امت کے ساتھ یوں تعلق کی یہ بات ہے کہ وہ سربراہِ مملکت بھی ہے وہ شخصیت عظیم بھی ہے کہ جس پر ایمان لانے سے یہ لوگ مومن ہوئے ہیں، جس کا اتنا بلند مرتبہ ہے لیکن اس کے بھی اخلاق کی کیفیت یہ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے ان کو بڑی تکلیف پہنچتی ہے، اس کو بھی اور اہلِ خانہ کو بھی۔ لیکن اس کے باوجود، وہ منہ کھول کر، تم سے کہتا نہیں کہ بھئی! کھانا کھا چکے ہو تو اب تشریف لے جایئے۔ وہ یہ نہیں کہتا لیکن ہمیں پتہ ہے کہ اس سے اسے کتنی تکلیف پہنچتی ہے اور یہ بات نبی تک ہی نہیں ہے یہ تو تمہارے ہر گھر میں ایسا ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ تو شرماتا ہے لیکن خدا حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کی تعلیم کی جامعیت کی یہ کیفیت ہے کہ پہلی آیت میں استخلاف فی الارض جیسے اہم سیاسی مدنی معاملات کے متعلق ہدایات دی گئیں اور اگلی ہی آیت کے اندر آپ نے دیکھا کہ ان معاملات کے متعلق بھی ساتھ ہی ہدایت دے رہا ہے۔

اس آیت پہ پھر آ جایئے کہ گھروں کے اندر کے یہ اوقات ایسے ہوتے ہیں، جہاں اندر آنے کے لیے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اوقات یہ ہیں: صبح کی نماز سے ذرا پہلے، عشاء کی نماز کے ذرا بعد، دوپہر کے وقت۔ ایسے اوقات میں تم آرام کے لیے لیٹتے ہو، پوری طرح کپڑے بھی پہنے ہوئے نہیں ہوتے تو وہ جو عام طور پہ گھروں میں، کمروں میں ادھر ادھر آتے جاتے رہتے ہیں، کام کاج کرنے والے بچے بھی، وہ بھی بغیر اجازت ان کمروں کے اندر نہ آیا کریں

قرآن آدمی کو انسان بننا سکھاتا ہے

عزیزانِ من! ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ صاحب! یہ تو ایسے معاملات ہیں کہ مثلاً آج کے زمانے میں تو ہر ایک کو اس کا علم ہے کہ Privacy (خلوت) بڑی ضروری چیز ہے اور یہ ہونا بھی چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن دیکھیے کہ قرآن انسان کو کہاں سے اٹھا کر کہاں لاتا ہے۔ جنہیں آپ Universal Ethics (عالمگیر ضابطہ اخلاقیات) کہتے ہیں مثلاً جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو، فریب نہ دو، دغا نہ دو، کہنے کو تو یہ بھی کہا جائے گا کہ صاحب! ان چیزوں کی قرآن میں بیان کرنے کی وحی کے ذریعے یہ علم دینے کی کیا ضرورت تھی لیکن انہیں کون بتائے کہ یہ جو آج Universal Ethics (عالمگیر ضابطہ اخلاقیات) بن چکے ہیں، یہ ابتداً ذہن انسانی کی تخلیق نہیں تھے۔ شروع ہی میں وحی کے ذریعے یہ چیزیں دی گئی تھیں۔ انسان اگر غلط اور صحیح میں خود امتیاز کرنا چاہے تو پتہ نہیں کہ اسے اس کے لیے کتنی صدیاں لگ جائیں۔ اگر یہ Trial & Error (سعی و خطا) کے ذریعے اور بروقت خالص فکری طور، پر کسی صحیح بات تک پہنچنا چاہے تو

صدیاں لگ جاتی ہیں اور اس میں ہزاروں ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔ قرآنِ کریم انسان کی اس محنت اور وقت کو بچاتا ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں وحی انسان کے اس محنت اور وقت کے بوجھ کو ہلکا کیے دیتی ہے۔ ❶

یہ آداب تمدن شروع میں وحی کے ہی رہن منت تھے

جتنی بھی چیزوں کو آج آپ یونیورسل (Universal) سمجھتے ہیں' ان کی ابتدا یہ ہے کہ یہ شروع ہی میں وحی کے ذریعے انبیائے کرام ﷺ کے توسط سے دے دی گئی تھیں اور بعد میں عام ہوگئیں' اس لیے یہ ضروری نہ رہا کہ ان کی کوئی مذہب کی خصوصیات رہ جائے۔ یہ باتیں عام ہوگئیں۔ آج ہر شخص یہ کہتا ہے کہ جھوٹ بولنا بری بات ہے حتیٰ کہ وہ جو خدا کو نہیں مانتے' کسی مذہب کے پیروکار بھی نہیں ہیں' وہ بھی ان چیزوں کو Universal Ethics (عالمگیر ضابطۂ اخلاقیات) کہتے ہیں' یہ ٹھیک ہے کہ فکری طور پہ اور تجربے کی بنا پہ بھی' انسان آہستہ آہستہ ان اصولوں تک پہنچ جاتا ہے مثلاً Privacy (خلوت) کے دوران گھروں کے اندر' کمروں کے اندر' بلا اجازت نہیں آ جانا چاہیے لیکن یہاں تک پہنچنے کے لیے انسان کو کتنی منازل طے کرنا پڑیں گی' شاید ہم لوگ' جو شہروں کے اندر رہتے ہیں اور بسا اوقات وہ لوگ جو مہذب آبادیوں میں رہنے والے ہیں' اس کا احساس نہ کریں' آج بھی آپ گاؤں کی زندگی اور وہ گاؤں جو شہروں سے ذرا دور واقع ہوئے ہیں' وہاں جا کر آپ دیکھیں۔ یہ جو روزمرہ کے معمول' جنہیں آپ آدابِ معاشرت کہتے ہیں' آپ کو اکثر و بیشتر وہ لوگ ملیں گے جو ان سے بھی واقف نہیں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ آمدورفت کی زیادتی سے' ذرائع مواصلات سے' وہ شہروں میں آتے ہیں' شہر والے اب وہاں جاتے ہیں' عام طور پر اب یہ چیزیں بھی عام ہو رہی ہیں لیکن ہم نے اپنے ابتدائی دور میں بچپن کے زمانے میں' انہی گاؤں کو دیکھا ہے کہ وہاں جنہیں ہم روزمرہ کے معمولات کہتے ہیں' جنہیں ہم آدابِ معاشرت کہتے ہیں' وہ لوگ ان سے بھی واقف نہیں تھے۔ وہ بلا محابا گھروں کے اندر یونہی گھستے چلے آتے تھے۔ یہ انداز تھا گاؤں کی زندگی کا اور پھر گاؤں تو قدرے مہذب ہو جاتے ہیں' آپ ان سے بھی پیچھے چلے جائیں اور Tribal Life (قبائلی زندگی) کو دیکھیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ قبائلی زندگی بسر کرنے والے تو اس تمدنی چیز سے واقف ہی نہیں ہوتے۔

وحی ان چیزوں کے متعلق بھی آپ کو ہدایات دیتی ہے۔ اب اگر کوئی معاشرہ اس مقام تک پہنچ گیا ہے جہاں وہ ان چیزوں کو از خود جانتا ہے تو یہ ٹھیک ہے لیکن یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو اب بھی نہیں جانتے یا اس زمانے کے لیے ہے کہ انسان ابھی یہاں تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ قرآن انسان کو ان ہدایات اور اصولوں کے ذریعے رفتہ رفتہ' بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے اور آخر الامر آپ دیکھیں گے کہ جب اس کی تعلیم عام ہو جائے گی تو پھر انسان اس سے اس قدر روشناس ہو جائے گا کہ اسے اس کے حوالے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

---

❶ Revelation"economises time" (Iqbal M.Dr:Reconstruction of Religious Thought in Islam).

تمدنی زندگی میں جب یہ چیزیں روز کا معمول بن جائیں گی تو پھر اس کی بھی ضرورت نہیں رہے گی کہ قرآن نے فلاں مقام پہ یہ کہا۔ وہ انسان کو ان مقامات پر پہنچانا چاہتا ہے' یہاں قرآن یہ کہتا ہے کہ گھروں کے اندر خلوت (Privacy) کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ تمہارے ملازم اور لڑکے بالے جو ابھی تک سن بلوغت کو نہ پہنچے ہوں' کام کاج کے لیے تمہارے گھروں میں پھرتے پھراتے رہے ہیں۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر وہ ان اوقات میں تمہارے پاس آنا چاہیں جب تم اپنے کمرے میں خلوت (Privacy) میں ہو۔ مثلاً صلوٰۃ الفجر سے پہلے' دوپہر کے وقت جب تم کپڑے اتار کر آرام کرتے ہو اور صلوٰۃ العشاء کے بعد' جب سونے کا وقت آجاتا ہے تو ان اوقات میں انہیں اجازت لے کر آنا چاہیے۔ اس سے **لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَ لَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ ۢ بَعْدَهُنَّ** (24:58) نہ تمہارے لیے کوئی وجہ پریشانی ہوگی' نہ ان کے لیے۔ ان اوقات کے علاوہ **طَوَّافُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ** (24:58)۔ وہ کام کاج کے لیے' بلا اجازت اندر باہر آجا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی ممانعت کی بات نہیں۔ **كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ** [1] (24:58)۔ اب یہ دیکھیے یہ اس دور کی بات ہے کہ جب عام علمِ انسانی میں یہ باتیں نہیں تھیں۔ یہاں کہا ہے کہ خدا جاننے والا ہے اور پھر اپنے آپ کو وہ علیم کہتا ہے۔ ان مقامات پہ عربی زبان کے قاعدے کی رو سے بھی یہ جو (24:58) میں ''بعض'' کا لفظ آتا ہے اس میں Continuity (تسلسل) ہوتی ہے' کسی چیز کا مسلسل ہونا ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کسی خاص دور کی انسانی زندگی کا کوئی علم رکھتا تھا اور اس کے بعد کی زندگی کا علم نہیں رکھتا تھا۔ وہ علیم ہے' یعنی مسلسل' پہلے دن سے آخری دن تک۔ انسان کے جتنے ادوار اور منازل ہیں وہ ان کا علم بھی رکھتا ہے اور وہ علم حکمت پر مبنی ہے' Reason (استدلال وفکر) پہ مبنی ہے۔ وہ جو بات کہتا ہے' دھاندلی سے نہیں کہتا۔

ضمناً ایک اہم بات

عزیزان من! ضمناً یہ ایک بات آ گئی۔ یہ حکیم کا لفظ ہے۔ قرآن کی رو سے تو جسے آپ حکومت کہتے ہیں' جسے حکم کہتے ہیں' اس کا مادہ بھی ''ح ک م'' ہی ہے۔ جو نظامِ حکومت' Reason پہ اور حکمت پہ مبنی نہیں ہے' قرآن کی رو سے وہ حکومت کا نظام نہیں ہے۔ وہ ڈکیتی ہے' دھاندلی ہے' ناانصافی ہے۔ خود زبان کی رو سے حکومت اور حکمت کا Root (مادہ) وہی ''ح ک م'' ہے۔ حاکم اور حکیم کا مادہ بھی وہی ''ح ک م'' ہے۔ اب تو ہمارے ہاں بہرحال حکیم کہتے ہی اس کو ہیں جو طبیب ہے' جسے ہم حکیم کہتے ہیں اُسے دراصل فلاسفر کہتے ہیں۔ یہ طبیب ہوتے ہیں جو علاج کرنے والے ہیں اور انہیں اب عام طور پہ حکیم صاحب کہتے ہیں۔ انہیں اب طبیب صاحب نہیں کہتے۔ عربی زبان کی رو سے حکیم فلاسفر ہوتا ہے۔ حکیم کے معنی فلاسفر لے لیجیے تو حکم کے معنی ہی Reason (استدلال) کے ہیں Reason پر مبنی جو معاشرہ' جو آداب' جو انداز نظام ہو' اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ حکمت پر مبنی ہو۔ اسی صورت میں آپ اسے نظامِ خداوندی کہہ سکتے ہیں

---

[1] اور اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام واضح طور پر بیان کر دیتا ہے۔ وہ احکام جو سراپا علم وحکمت پر مبنی ہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔812)

کہ وہ علم پر مبنی ہو' حکمت پر مبنی ہو تو یہ جو چھوٹی چھوٹی ہدایات قرآن دیتا ہے اس میں بھی آپ دیکھیے کہ وہ کہتا ہے کہ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ [1] (24:58)۔ اور اس کے تسلسل میں ہی ہے کہ وَ اِذَا بَلَغَ الۡاَطۡفَالُ مِنۡکُمُ الۡحُلُمَ فَلۡیَسۡتَاۡذِنُوۡا کَمَا اسۡتَاۡذَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ [2] (24:59)۔ قرآن نے بچوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ بھی جب بڑے ہو جائیں تو جس طرح بڑوں کو کسی کے گھر اجازت لینے کی ضرورتی ہوتی ہے ان کو بھی اس کی ضرورت ہے۔ وہ بھی تمہارے گھروں کے اندر جائیں تو اجازت لے کر جایا کریں۔ اب یہ جو چیز ہے یہ بھی بڑی اہم ہے۔ اس کے اندر بھی ایک بڑا باریک نکتہ ہے۔ بچے تو گھروں میں آتے جاتے رہتے ہیں' اڑوس پڑوس کے بچوں کا اِدھر اُدھر کے بچوں کا' گھروں میں عام آنا جانا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہی بچہ جب بڑا ہو جائے' بالغ ہو جائے تو اسے ان گھروں میں جہاں وہ پہلے بلا اجازت آ جایا کرتا تھا' اب اسے بھی اجازت لے کر جانا چاہیے۔ دیکھا یہ ''حکیم'' کیا بات کہہ رہا ہے اور کتنی کتنی جزئیات تک پہنچ رہا ہے! اب اس سے یہ بھی دیکھیے کہ قرآن کے بڑے اہم معاملات ایسے ہیں جن میں اس نے اصولی حکم دیا ہے' اس کی جزئیات خود بیان نہیں کیں اور دوسری طرف یہ کیفیت ہے کہ ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات ہیں' وہ ان کی جزئیات تک بیان کر رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاملات ایسے ہیں کہ جن میں زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا جائے گا' زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے' ان کی جزئیات میں تغیر و تبدل ضروری ہو جائے گا۔ یہ ہے ضمناً ایک اہم بات۔

زکوٰۃ علیحدہ اور ٹیکس علیحدہ؟

اب یہاں گو کہ بات دوسری طرف نکل جائے گی لیکن اس کا بیان کر دینا ضروری ہے۔ آج کی اصطلاح میں جسے زکوٰۃ کہتے ہیں' اس کے لیے انہوں نے یہ مقرر کیا ہوا ہے کہ صاحب! فلاں فلاں چیز کے اوپر جو اڑھائی فیصد ہے وہ زکوٰۃ ہوگی۔ اب یہ حلق میں ہڈی اٹکی ہوئی ہے: ایک طرف سے تقاضا ہو رہا ہے صاحب! کہ زکوٰۃ یہی ہے' مملکت اسی کو وصول کر سکتی ہے' کوئی اور ٹیکس لگا ہی نہیں سکتی۔ اب جو یہ کہا جائے کہ صاحب! مملکت کا کاروبار اس سے نہیں چل سکتا' تو اب اس کے لیے کمیٹیاں اور کمیشن اور یہ کچھ بنائے بیٹھے ہوئے ہیں کہ کس طرح سے یہ جو غیر متبدل ہے اسے بدلا جائے۔ انہوں نے اڑھائی فیصد تسلیم کر لیا۔ اب اسی پہ کھینچا تانی ہو رہی ہے' کمیٹیاں بٹھا رہے ہیں' بیٹھے ہوئے ہیں کہ صاحب! کسی طرح سے کوئی شکل نکالیے' کام چل نہیں رہا۔ کبھی یہ مسئلہ آ جاتا ہے کہ صاحب! یہ زکوٰۃ تو ہے' یہ تو عبادت ہے۔ یہ انہوں نے جو آپ کے ہاں آجکل بہت بڑے فلاسفر' مفسر ہیں' فیصلہ دیدیا کہ جی' زکوٰۃ تو عبادت ہے اس لیے

---

[1] اور اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام واضح طور پر بیان کر دیتا ہے۔ وہ احکام جو سراپا علم و حکمت پر مبنی ہیں۔

[2] اور جب یہ لڑکے بالغ ہو جائیں' تو انہیں تمہارے گھروں کے اندر آنے کے لیے اسی طرح اجازت طلب کرنی چاہیے جس طرح اور بالغ مردوں کی اجازت لینے کی ضرورت ہے (24:27)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔812)

یہ تو وہی عبادت رہے گی۔ اب حکومت کا معاملہ آتا ہے یعنی یہ تو ہوا دین۔ اب سیاست آتی ہے۔ کہا کہ حکومت کو حق ہے کہ اور ٹیکس لگا لے' زکوٰۃ تو عبادت ہے۔ چل بھئی معاملہ ختم ہوا۔ یعنی میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ایک چیز تھی' اب اس کی بنیاد کیا ہے؟ اس کی تلاش کر رہے ہیں۔

مذہبی پیشوائیت نے دین اور دنیا میں ثنویت پیدا کر رکھی ہے

عزیزان من! قرآن کریم نے کہیں بھی زکوٰۃ کا یہ نصاب مقرر نہیں کیا' اس کی کوئی شرح بھی مقرر نہیں کی۔ اب یہ خود مقرر کی ہوئی چیز ہے اور اسے غیر متبدل سمجھ لیا ہے کہ دین میں' شریعت میں' اس شرح میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تبدیلی نہ کرنے سے حکومت کا کام نہیں چلتا۔ اب اس الجھن کے اندر پھنسے ہوئے ہیں' کمیٹیاں بٹھائی جا رہی ہیں' کمیشن بٹھائے جا رہے ہیں' کام ہو نہیں رہا۔ اسے عبادت کہہ کر الگ کر دیتے ہیں۔ یوں ان کے ہاں مذہب اور سیاست تو ایک ہے لیکن زکوٰۃ اور ٹیکس ایک نہیں ہیں۔ زکوٰۃ جو عبادت ہے مذہب ہو گیا' ٹیکس جو حکومت کا ہے سیاست ہو گئی۔ اسے الگ الگ رکھنے پہ زور دیا جا رہا ہے اور ساتھ ببانگِ دہل کہا جا رہا ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ نہیں ہیں' وہ ایک ہی ہیں۔ عزیزان من! وہ جو قرآن نے رسول ﷺ سے کہا تھا کہ ان سے کہو کہ ایک بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ **تتفکروا** (34:46) سوچا کرو۔ اس نہ سوچنے نے آپ کو یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ سوچ کی پہلی چیز یہ تھی کہ صاحب! قرآن نے جو اتنی مرتبہ ایتائے زکوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ کہا یعنی اتنی آیات میں یہ کہا' اسے ایک ہی آیت میں بھی بتایا جا سکتا تھا کہ بھائی صاحب! اڑھائی پرسنٹ (فی صد) چالیسواں حصہ دیا کرو' بات ختم ہو جاتی۔ وہ یہ نہیں کہا۔ اس نے کہیں بھی یہ نہیں کہا۔ وہ دین کو مکمل بھی کہہ رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ تکمیلِ دین بھی ہو گئی: یعنی **تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ** (6:115) دین مکمل ہو گیا اور اس نے اتنا نہیں بتایا کہ وہ زکوٰۃ اڑھائی پرسنٹ (فی صد) ہو گی تو یہ مکمل کیا ہوا۔ اگر یہ دین تھا تو نظر آیا کہ اس کے بغیر مکمل ہوا ہے۔ اس نے اس چیز کو چھوڑ دیا' خود یہ تفصیل اور جزئیات نہیں دیں اس لیے کہ اب دیکھیے کہ اس زمانے میں ہو سکتا ہے کہ اڑھائی کی بجائے سوا پرسنٹ (فی صد) سے ہی یہ کام چل جاتا ہو۔ اب زمانے کے تقاضے بڑھتے چلے جا رہے ہیں' مملکتوں کے اخراجات' مملکتوں کے محاصل بڑھتے جا رہے ہیں' اس کا اندازہ نہیں ہے۔ اگر ایک جگہ آپ اسے غیر متبدل قرار دیدیں گے تو اب اس کے بعد پھر یا تو آپ مصیبت میں پھنسیں گے یا اس کو الگ عبادت کہیں گے' ٹیکس کو حکومت کا کام کہیں گے۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ قرآن نے تو یہ مقرر نہیں کیا۔ اس نے اصول دیا ہے کہ سامانِ نشوونما بہم پہنچاؤ' یہ حکومت کے ذمہ ہے۔ کیسے بہم پہنچاؤ؟ خود سوچو' ہر زمانے کے تقاضے کے لحاظ سے اس کی تدبیر کرو' اس کا انتظام کرو۔

بے حد و نہایت دولت جمع کرنے کے جواز میں اڑھائی فیصد کا تصور

عزیزان من! اگر قرآن یہ بھی کہہ دیتا کہ نہیں' اڑھائی پرسنٹ (فی صد) لے سکتے ہو' اس سے زیادہ نہیں لے سکتے' تو وہ آپ کا معاشی نظام وہیں جامد ہو کر رہ جاتا۔ پہلے تو آپ کے ہاں بے حد و نہایت دولت جمع کرنے کے لیے اس سے جواز نکل آتا کہ اڑھائی پرسنٹ (فی صد) دیدو' باقی سارا شیر مادر کی طرح حلال و طیب ہے' تو سرمایہ داری کے نظام کی بنیاد پڑ جاتی۔ اڑھائی پرسنٹ (فی صد) سے آپ کے ہاں کی حکومت کا کام نہ چلتا' یہاں مصیبت پڑ جاتی۔ دیکھا آپ نے یہ چیز کس قدر حکمت پہ مبنی ہے کہ جتنی چیزوں کی تفاصیل اور جزئیات زمانے کے تقاضے کے ساتھ بدلنی چاہئیں قرآن نے ان کو خود نہیں دیا اور قرآن کریم نے سورۃ مائدہ میں کہا ہے کہ ان باتوں کو ہم نے بیان نہیں کیا' یہ نہ سمجھو کہ ہم بھول گئے ہیں' ہم نے دانستہ انہیں بیان نہیں کیا' انہیں کرید کرید کے نہ پوچھا کرو' تمہاری کرید پہ اگر ہم نے وہ بیان کر دیا تو مصیبت میں پھنس جاؤ گے' زمانہ آگے بڑھ جائے گا اور تم اس کے مطابق عمل نہیں کر سکو گے' تو پھر تمہارا حال بنی اسرائیل کی طرح ہوگا۔ انہوں نے کرید کرید کے خود ہی غیر متبدل شریعت بنالی۔ جب اس پہ چل نہ سکے تو اس کے ساتھ پورے کے پورے دین کا لبادہ ہی اتار کے پھینک دیا۔ یہ جو آپ کے ہاں اب اگلی جنریشن یا نئی نسل کر رہی ہے کہ صاحب! اس سے کام نہیں چل سکتا' کیا کیا جائے' وہ کہتے ہیں کہ صاحب! پھر اب یہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے' کسی زمانے میں تو Effective (مؤثر) تھا' اس میں قوت تھی' اب وہ دور لد گیا' اب اس زمانے میں اس پہ نہیں چلایا جا سکتا۔ ٹھیک ہے وہ کہتے ہیں کہ اڑھائی پرسنٹ (فی صد) سے اس زمانے میں کام نہیں ہو سکتا اور انہیں کہا جاتا ہے کہ یہ اسلام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت اچھا ہے' تمہارا اسلام تمہیں مبارک' ہم تو اس کو نہیں چلا سکتے۔ آپ نے دیکھا جو قرآن نے کہا تھا کہ اگر تم نے یہ کرید کی اور اس قسم کی جزئیات دیدی گئیں تو کل کو ان پہ تم چل نہیں سکو گے' تو دین ہی کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ اس نے تو اسے غیر متعین چھوڑا تھا۔ انہوں نے اس کے بعد کسی زمانے میں اس کو مقرر کیا اور وہ قرآن کی طرح غیر متبدل ہو گیا بلکہ قرآن سے زیادہ ہوا۔ معاف رکھیے قرآن کی آیات کے متعلق' قرآن کے احکام کے متعلق' عقیدہ یہ ہے کہ انہیں یہ روایات منسوخ کر سکتی ہیں مگر یہ جو چیزیں روایات میں آ گئی ہیں' انہیں کوئی منسوخ نہیں کر سکتا۔ یہی کچھ زکوٰۃ کی شرح کے ساتھ ہوا ہے۔

قرآنِ حکیم کی حکمتِ بالغہ

میں کہہ یہ رہا تھا کہ آپ قرآنِ کریم کی حکمتِ بالغہ ملاحظہ فرمائیے کہ ایسے اہم معاملات حل کر جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا معاملہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مالیہ (Revenue) یا حکومت کے محاصل کیا ہونے چاہئیں؟ یہ اکنامک کا بہت اہم مسئلہ ہے' اس پہ معاشی نظام کی بنیاد ہے۔ اس کی جزئیات تو وہ دیتا نہیں لیکن جو چیزیں ایسی ہیں کہ زمانے کے تغیرات کا ان کے اوپر اثر نہیں پڑتا' ان کی جزئیات تک بھی متعین کرتا ہے۔ اور یہ بات کہ گھر کے ملازموں کو یا نوکروں کو Privacy (خلوت) کے اوقات میں دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر نہیں جانا

چاہیے' زمانے کا تقاضا اس پہ اثر انداز ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ جس طرح چودہ سو سال پہلے درست تھا' اسی طرح آج بھی درست ہے اور اسی طرح ہمیشہ ہوگا۔ یہ بات کہ دوسروں کے گھر میں جاؤ تو ان سے اجازت مانگو' اجازت نہ دیں تو دل میں برا منائے بغیر واپس آ جاؤ۔ اب یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ زمانے کے تغیرات لاکھ بدلتے جائیں' اس پہ کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہ ایک ابدی حقیقت رہے گی۔ اصول یاد رکھیے کہ جتنی ایسی ہدایات ہیں' جتنے ایسے آداب و قوانین ہیں کہ زمانے کے تغیرات سے ان پہ کوئی اثر نہیں پڑتا' قرآن کریم ان کی جزئیات خود دیدیتا ہے اور جو ایسی چیزیں ہیں کہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے اس کے اوپر اثر پڑتا ہے' ان کا صرف اصول دیتا ہے' جزئیات خود متعین کر کے نہیں دیتا۔ ابدی طور پر رہنے والی کتاب' جو کتابِ قانون بننی تھی' اس کی یہی حیثیت ہونی چاہیے تھی' اس کا یہی انداز ہونا چاہیے تھا۔

ختمِ نبوت کے معنی

ختم نبوت کے معنی بھی یہی ہیں' ورنہ اگر اس میں اس قسم کی ہدایات ہوتیں کہ زمانے کے بدلنے سے ان پر عمل پیرا ہونا ممکن ہی نہ رہتا۔ ان میں تبدیلی کی ضرورت پیش آ جاتی تو پھر کسی اور نبی کی ضرورت پڑتی کیونکہ خدا کے دین میں انسان خود تو کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا۔ جب اس قسم کا ضابطہ دیا جائے کہ جن میں زمانے کے تقاضوں سے تبدیلی کی ضرورت ہی نہ پڑے اور جو جزئیات دی ہوں ان میں ویسے ہی تبدیلی کی ضرورت نہ پڑے تو اس کے بعد نبی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ ہے ختم نبوت۔

بالغ بچوں کے لیے ہدایات

اب اس سے آگے دیکھ لیجیے کہ یہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں جو قرآن نے دی ہیں۔ میں اتنی سی چیز کہتا ہوں' جو آج درس میں میرے زیرِ نظر ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' جو عام گھروں کے اندر جاتے آتے رہتے ہیں۔ یہ محلے کے بچے ہیں' دوستوں کے بچے ہیں' جب تک یہ بچے ہوتے ہیں' گھروں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ جب یہ بڑے ہو جائیں' تو انہیں بھی اندر آنے کے لیے اسی طرح سے اجازت لینی چاہیے جیسے دوسرے لوگوں کو لینی پڑتی ہے۔ یہ کتنی اہم چیز ہے' ورنہ اے کہنا پینداکہ بھئی! اوکا کا! ہن ذرا توں باہر جا کے' آواز دے کے' آیا کر۔ اوٹھیک ہے' ہے تے توں اوہو جیا ہی کا کا' پر دیکھ ناہن ذرا' اندر آیاں ہو یاں دھیاں بھیناں اندر ہوندیاں۔ کیہنا پینداے تہانوں۔ اوکا کا اپنے ذہن اچ ایہی سمجھدا اے' پئی میں اگے ایس طراں نال ای اندر اوندا جاندا روانگا۔ [1] یہ ہے علیم۔ یہ انسان عقل کے تجرباتی طریق سے اس معاملے پہ نہیں پہنچا۔ معاف رکھیے انسانی فکر یا تجرباتی بنیاد سے وہ اس پہ کیسے پہنچ سکتا تھا: نہ گھر' نہ گھاٹ' نہ بیوی' نہ بچہ' نہ کوئی جوان لڑکی' نہ کوئی چھوٹی بیٹی' نہ بیٹا۔ تے اونوں کی پتہ اے پئی' اے وڈے بالغ منڈے نوں

---

[1] ورنہ اس کے لیے کہنا پڑتا ہے کہ ارے او بھائی! او لڑکے! اب ذرا تم باہر سے آواز دے کر اندر آیا کرو۔ یہ ٹھیک ہے کہ تو ہے تو وہی لڑکا' وہی منا' مگر یہ بات ذہن میں رکھو کہ اندر بہنیں بیٹیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔ یہ تمہیں کہنا پڑتا ہے۔ وہ منا یہی سمجھتا ہے کہ وہ پہلے کی طرح اندر آتا جاتا رہے گا۔

اینویں نہیں اندر اونا چاہیدا [1] لہٰذا فکری طور پہ یہ بات نہیں ہے۔ Trial & Error (سعی وخطا) کی رو سے (معاذ اللہ) خدا یہاں نہیں پہنچا ہے، وہ علیم ہے، وہ حکیم ہے۔ انسان کو پیدا کیا ہے تو انسان کی تمام ضروریات کا اس کو علم ہے اور یہاں باریکیوں تک جاتا ہے۔

میں پھر زور دونگا تو ان آیات اور احکام کی اہمیت آپ کے ذہن میں آئے گی کہ یہ بچے بالے، چھوٹے چھوٹے ہیں تو وہ صرف ان اوقات میں، جن میں پرائیویسی (خلوت) کمروں کے اندر ہوتی ہے، وہ پوچھ کر آئیں اور جب یہ بڑے ہو جائیں، دوسروں کے گھر جانے لگیں، تو اسی طرح سے پوچھیں جس طرح سے کوئی دوسرا غیر، اجازت مانگ رہا ہے۔ ذرا غور کیجیے خود ہمارے ہی زمانے کے گھروں کے اندر کتنی اسی قسم کی خرابیاں ہیں جو اس بنا پہ پیدا ہوتی ہیں کہ جو لڑکے بچپن میں گھروں کے اندر عام آمد و رفت رکھتے تھے جب وہی بالغ ہو جاتے ہیں تو ان کی اس طرح کی بے محابا آمد و رفت کیا کیا نتائج پیدا کرتی ہے۔ یہ اندر کے بچے ہیں تو وہ بھی صرف ان اوقات میں بغیر کھٹکھٹائے ہوئے اندر نہ آجایا کریں اور جب وہ بچے بڑے ہو جائیں تو پھر وہ باہر کھڑے ہو کر اجازت مانگا کریں۔

یہ راہنمائی بھی آیات اللہ ہیں

عزیزان من! اس کے بعد ہے کہ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (24:59) تمہیں پتہ نہیں کہ یہ بھی آیات اللہ ہیں، احکام خداوندی ہیں اور ان کی وضاحت کی ضرورت تھی۔ یہاں یبین اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی ان کی بھی وضاحت کی ضرورت تھی۔ کیوں ضرورت تھی؟ اس لیے کہ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ [2] (24:59)۔ دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کہاں لاتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آیات کے آخر میں جب خدا کی کوئی صفت آئے، تو اس پہ کھڑے ہو جانا چاہیے، سوچنا چاہیے کہ وہ یہی صفت یہاں کیوں لایا ہے۔

خدا عالم نہیں بلکہ علیم ہے

ان چیزوں کی وضاحت کی ضرورت تھی اس لیے کہ وہ علیم ہے۔ کسی خاص دور کے انسان کی حالت کا ہی علم نہیں رکھتا، اگر ایسا ہوتا تو صرف عالم ہوتا، وہ ابدی طور پر، انسان جن ادوار سے گزرتا ہے، اس کے حالات کا اس کو پتہ ہے۔ وہ حکیم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حکمت کا تقاضا کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو Rational (پُرحکمت) دین دیا جاتا ہے، اس میں کون کون سی چھوٹی سی چھوٹی چیزوں کے متعلق بھی محتاط رہنا پڑتا ہے۔

---

[1] اسے کیا معلوم کہ بالغ لڑکے کو یونہی منہ اٹھائے اندر نہیں چلے آنا چاہیے۔

[2] اللہ علیم وحکیم ہے۔

اس لیے کہ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ہے۔ اب گھروں کے اندر مستورات ہیں' خواتین ہیں' گھروں کی عورتیں بھی ہیں' ٹھیک ہے ان میں بچیاں بھی ہیں' جوان اور عورتیں بھی ہیں' بوڑھی عورتیں بھی ہیں تو کہا کہ ٹھیک ہے گھر کے اندر بھی جو لڑکیاں جوان ہو جاتی ہیں ان کو چاہیے کہ اپنے کپڑے پہنے رکھا کریں۔

بوڑھی عورتوں کے لیے احکام

بوڑھی عمر رسیدہ عورتوں کے لیے کہا کہ وَ الۡقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیۡ لَا یَرۡجُوۡنَ نِکَاحًا فَلَیۡسَ عَلَیۡہِنَّ جُنَاحٌ اَنۡ یَّضَعۡنَ ثِیَابَہُنَّ ❶ (24:60)۔ یہاں ''قواعد'' کا لفظ آیا ہے۔ کیا بات ہے قواعد کے لفظ کی! یعنی وہ عورتیں جنہیں بیٹھی رہنے والی کہتے ہیں' وہ زیادہ وقت بیٹھی رہتی ہیں۔ ''بوڑھی'' کہنے کے لیے یہ کیا خوب لفظ ہے' کیا بات ہے' اس زبان کی اور کیا بات ہے قرآن کے انتخاب کی! کس حسین انداز سے یہ بات کہہ گیا کہ وَ الۡقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ (24:60) عورتوں میں وہ بڑی بوڑھی عورتیں جو اس اسٹیج تک پہنچ چکی ہوئی ہیں کہ جہاں نکاح کی ضرورت نہیں رہا کرتی۔ یہاں سن' عمر اور سال نہیں کہا' بلکہ ان کی خصوصیات بتائی ہیں کہ جو سن' عمر یا سال میں' ان خصوصیات تک پہنچ چکی ہوں کیونکہ یہ وجہ حکمت اس حکم کی بنیاد ہے۔ کہا کہ ان کے لیے کچھ مضائقہ نہیں کہ وہ گھر کے اندر اگر یہ پورے کے پورے چادریں اور دوپٹے اور یہ نہ بھی اوڑھے رکھیں' رکھ بھی دیا کریں اتار کے' تو بھی ان کے لیے کوئی بات نہیں۔ اندازہ لگائیے کہ یہ اس انداز کی عورتیں ہیں' جن کے متعلق یہ ذکر آ رہا ہے کہ وہ اپنے دوپٹے وغیرہ اتار رکھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ان کے لیے قرآن کہتا ہے کہ غَیۡرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیۡنَۃٍ ❷ (24:60) اس میں بھی ان کا جذبہ یہ نہ ہو کہ آج نہیں' کسی دور کی زینت کا خیال ہی ان کے ذہن میں ایسے ہو کہ اس کی نمود ہو جائے۔ اصل چیز تو وہ Motive (جذبہ) ہے' اصل شے تو وہ ارادہ ہے' جس کے لیے یہ کچھ کہا جا رہا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے گھرانے کی عورتوں کے لیے خصوصی احکام

قرآن کریم میں اور تو اور خود جو نسآء النبی ہیں' جو نبی کے گھرانے کی مستورات ہیں' ان کے لیے بھی یوں آیا ہے کہ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنۡ یَّاۡتِ مِنۡکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ یُّضٰعَفۡ لَہَا الۡعَذَابُ ضِعۡفَیۡنِ ❸ (33:30)۔ خاص طور پہ انہیں کہا کہ اے نبی کے

---

❶ (پہلے (24:31) میں کہا جا چکا ہے کہ عورتیں اپنی چادروں کو اپنے سینے پر ڈال لیا کریں اور اپنی زینت کی چیزوں کی نمائش نہ کیا کریں لیکن) جو سن رسیدہ عورتیں' زندگی کی اس منزل میں جا پہنچی ہوں جہاں انہیں نکاح کی آرزو اور امید باقی نہ رہی ہو' تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں کہ وہ اپنی چادروں کو اوپر نہ اڑھا کریں۔ (ص۔812)

❷ ایسا کرنے کا جذبہ محرکہ زینت کی نمائش نہ ہو۔ (33:33) (ص۔812)

❸ اے رسول کی بیویو! یہ بھی سوچ لو کہ چونکہ تمہاری زندگی کو دوسروں کے لیے نمونہ بننا ہے اس لیے تمہیں بہت ہی محتاط رہنا ہوگا۔ (مثلاً) تم میں سے اگر کسی سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہو گئی تو اسے اس کی دگنی سزا ملے گی۔ (1۔2۔3 مفہوم القرآن پرویز رحمۃ اللہ علیہ' ص ص 812، 971)

گھرانے کی عورتو! تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو‘ اس لیے کہ تمہارا انداز زیست دوسری عورتوں کے لیے نمونہ بنتا ہے‘ اور اسی لیے ان سے یہ کہا گیا کہ جن کے رتبے ہیں سوا‘ ان کو سوا مشکل ہے۔ عام جرائم کی جو سزا ہے‘ نبی کے گھرانے کی کسی عورت سے وہی جرم سرزد ہو تو اسے دوگنی سزا دی جائے گی اور کہا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ ایک تو وہ جرم ہے جس کا اثر تمہاری ذات پہ ہے‘ دوسرا یہ ہے کہ تمہاری ہر حرکت کا اثر عالمگیر ہو جاتا ہے‘ دوسروں کے لیے وہ چیز نمونہ بن جاتی ہے اور اگر اس قسم کے جرائم یا اس قسم کی قانون شکنیاں‘ یہاں عام ہونی شروع ہو جائیں۔ تو معاشرے میں تو ان چیزوں کا پھاٹک کھل جائے گا اس لیے جو لوگ بھی برسر اقتدار ہوتے ہیں انہیں دوگنی احتیاط کرنی پڑتی ہے کیونکہ ان کی ہر نقل و حرکت کا اثر معاشرے پر عالمگیر ہو جاتا ہے۔ عوام کی نگاہوں میں‘ وہ چیز جو برسر اقتدار طبقے کے ہاں عام ہو جاتی ہے معیوب ہی نہیں رہتی۔ اس کے لیے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

نسآء النبی سے یہ کہنا کہ تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو‘ تو ذہن میں یہ آتا ہے کہ آگے یہ کہنا چاہیے کہ تمہارے رتبے بہت بلند ہیں‘ تمہیں بہت زیادہ حصہ ملے گا۔ آساڈے تے وڈیاں دیاں جیہڑیاں ورتیاں‘ اونہاں نوں بہتے بہتے حصے ملدے ہیگے [1]۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ جتنی احتیاط عام عورتوں کو برتنی پڑے گی تمہیں اس سے دوگنی احتیاط برتنی ہوگی کہ تمہاری ہر نقل و حرکت کا اثر عام عورتوں پر بہت گہرا پڑتا ہے اور اسی لیے کہا کہ وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ (33:33) اپنے گھروں کے اندر بھی رہو‘ تو باوقار طریقے سے رہا کرو۔ باوقار کیا لفظ ہے صاحب! کہ نہایت سنجیدگی اور وقار سے رہو۔ یہ بڑی چیز ہے۔ تم میں چھچھورا پن نہیں آنا چاہیے۔ جب تم باہر نکلو تو وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى [2] (33:33)۔ یہ ہے وہ لفظ جو قابل غور ہے کہ نمودِ حسن یا نمود و زیبائش کا جذبہ بھی تمہارے اندر نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ یہاں تو تم Innocently (معصوم طریقے پہ) اس چیز کو کرو گی لیکن یہ جو چیز تم کرو گی جب یہ باہر عام ہو گئی تو باہر یہ طوفان برپا کر دے گی۔ تمہیں گھر کے اندر بھی یہ نہیں کرنا چاہیے۔

دیکھتے ہیں قرآن کریم معاشرے کی اصلاح‘ کس طرح سے کرتا ہے اور کہاں سے‘ اس کی ابتدا کرتا ہے! یہاں بھی وہ لفظ ''تبرج'' آیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ بڑی بوڑھی عورتیں جو اس عمر تک پہنچ چکی ہیں‘ وہ عام طور پر بیٹھی ہی رہتی ہیں‘ نکاح کی حد سے بھی آگے چلی گئی ہیں‘ انہیں اجازت دیدی کہ وہ اپنے گھروں کے اندر‘ یہ دوپٹے وپٹے اتار دیا کریں لیکن جذبہ نمود و نمائش کا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس سے بھی‘ اس عمر میں ہی سہی‘ کچھ تو زیبائش کی نمود ہوگی۔ یہ جذبہ قطعاً نہیں آنا چاہیے۔

---

[1] یہ ہمارے ہاں بڑوں کی تقسیم کی ہوئی ہے کہ انہیں بڑے بڑے حصے ملیں گے۔

[2] اپنی زینت کی نمود و نمائش نہ کرو جیسا کہ قرآن کریم سے پہلے‘ عہد جاہلیت میں عورتیں کیا کرتی تھیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔973)

کہیں نمود و نمائش کا جذبہ پیدا نہ ہونے پائے

اس جذبہ نمائش کے متعلق اگرچہ بات تو میں نے پردے کے ضمن میں کہی تھی لیکن وہ بڑی اہم بات ہے جو قرآن کہتا ہے۔ زیبائش کو قرآن ممنوع قرار نہیں دیتا بلکہ دھڑلے سے کہتا ہے کہ **قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ** ❶ (7:32)۔ وہ کون ہے جو خدا کی زیبائش کی چیزوں کو جو اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہوئی ہیں' حرام قرار دیدے! قطعاً نہیں' لیکن وہ عورتوں سے کہتا یہ ہے کہ اس زیبائش کی چیزوں سے تمہارے ذہن میں اپنے حسن کی نمود کا جذبہ نہ پیدا ہو جائے' یہ بات نہ ہو کہ تم میک اپ کرنے کے بعد اپنی ماں سے پوچھو؟ Am I presentable, Mammie جی' یہ Presentable (قابل نذر) ہونے کا جو جذبہ ہے اس میں بڑی گہری حکمت ہے۔ عزیزان من! اس نے عورت کا مقام بڑا بلند بتایا ہے۔ وہ مرد کے ساتھ' زندگی کے ہر شعبے کے اندر' دوش بدوش چلتی ہے صرف ایک شعبے میں Exception (استثنا) ہے۔

عورت مرد کے لیے کھلونا نہیں

اس شعبے میں قرآن کہتا ہے کہ **فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ** (4:34) ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہے۔ عورت کو مرد پہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ نسل انسانی میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کی تربیت کا کام عورت کے ذمے ہے۔ جس قسم کا یہ بچہ بنائے گی' اسی قسم کی نسل انسانی بنتی چلی جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ تمہیں اس مقام پہ فضیلت حاصل ہے۔ مرد تو **قَوّٰمُوْنَ** (4:34) ہے یعنی صرف کمائی کر کے لاتا ہے' محنت مزدوری کرتا ہے۔ تم جو کچھ کر سکتی ہو وہ نہیں کر سکتا۔ یہی نہیں ہے کہ جنین کی تخلیق پیدائش ہے جس کی تم ذمہ دار ہو' یہ بھی ہے کہ تم نے اس بچے کو کیا بنانا ہے' یہ تمہارے ذمے ہے تو تم تو ان سے بھی فضیلت کے اندر بڑی ہو لیکن اگر عورت کے ذہن میں یہ بات پیدا ہو جائے کہ میں تو مرد کے لیے ایک کھلونا ہوں' میرا مقصد یہ ہے کہ اس کی نگاہوں میں جاذب بنتی رہوں' Attractive (پرکشش) رہوں تو اس نے کہا کہ پھر تم نے اپنے مقام کو گرا دیا کیونکہ تم مرد کا کھلونا بن رہی ہو۔ اس لیے کہا ہے کہ کہیں یہ جذبہ تمہارے اندر نہ پیدا ہو جائے کہ میں مردوں کی نگاہ میں کس طرح Attractive (پرکشش) بن سکتی ہوں۔ یہ سمجھ کر کیوں اپنے مقام کو گرا رہی ہو تم؟ تم تو اس سے بھی افضل واقع ہوئی ہو۔

عزیزان من! یہ قرآن ہے۔ اس لیے زیبائش کی چیزوں کو ممنوع نہیں قرار دیا کہ جمالیات سے لطف اندوز ہونا انسان کے اس جذبے کے اندر داخل ہے' جس سے بہت سی لطیف صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ بڑی ضروری چیز ہے لیکن عورت سے یہ کہا کہ یہ یاد رکھو! کہیں یہ جذبہ نہ پیدا ہو جائے کہ میں اس انداز سے یہ کچھ کروں کہ مردوں کی نگاہوں میں Attractive (پرکشش) بن جاؤں۔ تم

---

❶ (اے رسول!) کہو کہ وہ کون ہے جس نے ان زیب و زینت کی چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے استعمال کے لیے پیدا کیا ہے۔

نے اپنے آپ کو مقصود بالذات قرار نہیں دیا ہے۔ تم نے اپنا جو مقصد ہے، وہ زندگی کا مقصد قرار دیا ہے۔ مرد کی نگاہوں میں رچ بس جانے کا تصور تو خود مرد کے مقام کو اونچا کر دیتا ہے جیسے بچے کے لیے کھلونہ (Toy) ہوتا ہے۔ تم مرد کے لیے وہ نہ بن کر رہ جاؤ یہ نہ کرو۔ کا کی دی گڑیا نہ بنو [1]۔ اپنا مقام پہچانو۔

عزیزان من! سوچیے قرآن کس انداز سے بات کرتا ہے! زیبائش کی چیزیں ممنوع نہیں ہیں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ نمائش کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ اسی لیے اس نے یہ کہا ہے کہ گھر کے اندر باپ ہیں، بھائی ہیں، بیٹے ہیں، ان کی موجودگی میں اس قسم کی زیبائش کی چیزیں، زینت کی چیزیں، پہنتی رہو۔ زیور بھی ہے، کچھ میک اپ بھی ہے، ان میں رہ کر تم یہ کچھ کرتی رہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کہا کہ یہ اس لیے ہے کہ ان کے اندر رہتے ہوئے تمہارے دل میں وہ بات نہیں پیدا ہو سکتی۔ اگر یہ بات غیر مردوں کے سامنے ہوگی تو وہاں اگر تمہاری یہ زیبائش، یہ جذبہ، پیدا کر دے کہ میں ان کی نگاہوں میں Attractive (پرکشش) بن جاؤں تو تم اپنے مقام سے گر جاؤ گی، تم کھلونا (Toy) بن جاؤ گی۔ کیا بات ہے! باپ اور بھائی اور بیٹوں کے اندر رہتے ہوئے نہ تو باپ اور بھائی اور بیٹوں کی نگاہ میں یہ بات ہوگی، کہ آج تو بہت پرکشش ہوگئی ہو۔ ہمارے ہاں کی جوان بیٹی اگر کسی دن بھی اچھے رنگ کا دوپٹہ اوڑھ لے تو کبھی بھی ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی ہے کہ آج بہت Attractive (پرکشش) ہوگئی ہو۔ کبھی اس لڑکی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آسکتی ہے کہ باپ مجھے کیسی جاذب نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔ آپ دیکھیے کہ چھوٹی چھوٹی سی باتوں میں، یہ جو علیم وحکیم ہے، کہاں پہنچتا ہے۔ اس لیے ان سے بھی یہ کہا کہ ٹھیک ہے ہر وقت لپٹے لپٹائے رہنے والے کپڑے وپڑے اتار دیا کرو لیکن یہ جذبہ نمود ونمائش تمہارے اندر نہ پیدا ہو جائے۔ اس زمانے میں جب یہ کچھ کہا گیا تھا شاید وہ لوگ اسے Appreciate (پسند) نہ کرتے ہیں، وہ جو بڑی بوڑھیاں بیچاری بیٹھی ہوئی تھیں ان کے دل میں کیا جذبہ پیدا ہو سکتا تھا۔

اہل یورپ کی بوڑھی عورتوں کی کیفیت

عزیزان من! آج پوچھو یورپ کی عورتوں سے، اُن بڑی بوڑھی عورتوں سے کہ وہ کس طرح اپنی صحیح عمر کو ان پاؤڈروں کی تہوں کے اندر، ان خط وخال کو، ان جھریوں کو، چھپاتی ہیں تاکہ گرافون (Gramophone) کے ریکارڈ (Record) کی لکیروں کی طرح یہ بتا نہ دیں، بول نہ پڑیں کہ تمہاری کتنی عمر ہے۔ اس لیے ان کے ہاں محاورہ ہے کہ عورت کبھی اپنی عمر صحیح نہیں بتایا کرتی۔ وہاں یہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ وہی تبرج جاہلیہ کے لیے بوڑھی بوڑھی عورتیں جس انداز سے وہاں Make up (بناؤ سنگھار) کرتی ہیں اور اس کے بعد وہاں سے نکلتی ہیں وہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ کہا کہ یہ بات نہ پیدا ہو اور اس کے بعد اگلی بات یہ کہی کہ بھئی! اصل یہ ہے

---

[1] چھوٹی بچی کی گڑیا نہ بنو۔

کہ تمہیں تو ہم نے اجازت دیدی ہے کہ گھر کے اندر ہر وقت یہ چیز تمہارے لیے Inconvenience (زحمت) کا باعث ہوگی کہ صاحب! لپٹے لپٹائے ہوئے ہیں' چادر کی ہوئی ہے' اجازت تو دی ہے مگر کہا یہ ہے کہ وَ اَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ (24:60) بہر حال اگر محتاط رہو تو زیادہ اچھا ہے مگر اجازت اور چیز ہے: عزیمت اور چیز ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیوں کہا گیا۔ اس لیے کہ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (24:60) اللہ سنتا بھی ہے' جانتا بھی ہے۔ عام محاورے میں جیسے کیندے نیں نا: سانوں سب پتہ اے' ایہو جیاں نہ کر' سمجھیا۔ اے سانوں سب پتہ والی گل اے [1]۔ بہر حال اگر تم احتیاط برتو' تو زیادہ اچھا ہے اس لیے کہ سانوں سب پتہ اے۔ [2]

بچے کی شادی کے بعد اسے الگ ہی رکھنا چاہیے

آداب معاشرت کی باتیں ہو رہی ہیں' کھانے پینے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ ہے کہ اپنے ہی گھر سے کھانا چاہیے لیکن یگانگت کی خاطر' روابط کی خاطر' اپنے ہاں کے دوسرے دوستوں سے' عزیز رشتے داروں کے ہاں سے بھی کھانا کھا لیا جائے تو کچھ مضائقے کی بات نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ: لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُیُوْتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ خَالٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِیْقِكُمْ [3] (24:61)۔ اس میں کوئی بات مضائقے کی نہیں ہے' اپنے گھروں سے تو تم کھاتے ہی ہو' اپنے گھروں سے کھاؤ پیو' بیشک باپ کے گھر سے بھی تم کھاؤ۔ نظر آیا کہ یہ زندگی کا وہ حصہ ہے جس میں بیٹا اپنے گھر میں باپ سے الگ رہتا ہے تو تم باپ کے گھر میں کبھی کبھار آ گئے' وہاں سے کھا لو' اپنی والدہ کے گھر سے بھی تم کھا سکتے ہو تو گویا یہ نظر آیا کہ یہ یونٹ الگ بن رہے ہیں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ الگ رہ رہا ہے۔

اصل یہ ہے کے بچے کی شادی کرنے کے بعد تو اسے الگ ہی رکھنا چاہیے۔ سو دکھوں میں سے ننانوے دکھ تو اس لیے ہوتے ہیں کہ شادی کے بعد اکٹھا رکھا جاتا ہے۔ وہاں ان بالکل ننانوے دکھوں کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ جس دن دی اے سبز قدمی آ گئی ہے گھر دی برکت

---

[1] جیسے کہتے ہیں: ہمیں سب معلوم ہے' ایسی چیزیں/ باتیں نہ کرو' سمجھے! یہ ہمیں سب معلوم ہے والی بات ہے۔

[2] ہمیں سب معلوم ہے۔

[3] اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے گھروں سے کھانا کھاؤ یا (عند الضرورت) اپنے باپ (دادا) کے گھر سے یا اپنی والدہ کے گھر سے یا اپنے بھائی بہن' چچا' پھوپھی' ماموں یا خالہ کے ہاں سے کھا لو یا ان گھروں سے کھا لو جن کا نظم و نسق تمہارے ہاتھ میں ہو یا اپنے دوستوں کے گھر سے۔ (اس سے یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ تم معذور یا محتاج ہو۔ یہ باہمی تعلقات کا مظاہرہ ہے۔ اس باب میں) معذور' اندھے' لولے' لنگڑے' مریض یا تندرست و توانا کی کوئی تمیز نہیں' سب یکساں ہیں' عزیز داری کے تعلقات کی بنا' پر ایک دوسرے کے ہاں سے کھاتے ہیں' خیرات کے طور پر نہیں کھاتے۔

ای اڈ گئی۔ اے تے جوتیاں گھس گیاں سن ایہد یاں ایس سبز قدمی نوں لیان واسطے۔ جس دن اے آئی سی تیل چویاسی اینے۔ ❶ عورت کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی ہے کہ میں نوں بن کے آئی' تے مینوں چنگی سس نہ ملی' تے جدوں سس بنی تے مینوں چنگی نوں نہ ملی۔ اے رشتہ چنگا ہو ہی نہیں سکدا۔ ❷ اس کی وجہ ایک ساس ہے۔ اس سے پیشتر لڑکا گھر میں ہوتا ہے' وہ سارے کا سارا ماں کے لیے ہوتا ہے۔ اب جو شادی ہوتی ہے تو اس میں ایک غیر شریک ہو جاتی ہے۔ یہ نفسیاتی طور پر اس شرکت کو گوارا نہیں کرتی' برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ بہر حال قرآن نے' میں نے عرض کیا ہے کہ' بات تو یہ کہنی تھی کہ تم ان کے گھر سے بھی کھا لو۔ سوچو تو سہی۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اپنے گھر سے تو تم کھاؤ' کھاتے ہی ہو' باپ کے گھر سے بھی تم کھا سکتے ہو' تو اپنے گھر سے یہ الگ گھر ہے حتیٰ کہ ماں کے گھر سے بھی تم کھا سکتے ہو۔ آپ نے دیکھا وہ کیا کچھ کہہ گیا ہے۔ اتنے سے رہنے سہنے کے طریقے کو بھی بتایا گیا ہے: اپنا گھر' تمہارے باپ کا گھر' تمہاری والدہ کا گھر' وہاں سے بھی کھا سکتے ہو۔ اگر یہ صورت ہو تو بڑی سکھ کی زندگی ہوتی ہے۔ شادی ہوئی' تو بچے کا اپنا گھر' باپ کا گھر' ماں کا گھر' اس کو پھر وہ اس کا اپنا گھر کہتا ہی نہیں ہے۔ اس سے پہلے جب نہیں تھا تو یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ اب یہ اس کا اپنا گھر اور بتا رہا ہے' باپ کا گھر اور بتا رہا ہے' ہو سکتا ہے کہ والدہ ہی ہو باپ نہ بھی ہو' والدہ کا گھر الگ بتا رہا ہے۔

خاندان کے اندرونی طور پر باہمی روابط کے سلسلہ میں چیدہ چیدہ احکامات

عزیزان من! **تتفکروا** (34:46) قرآن کی آیات پر کھڑے ہو کر سوچنے کی بات ہے ورنہ آدمی یہاں سے یونہی آگے بڑھ جاتا ہے۔ قرآن کھانے پینے کی بات کر رہا ہے کہ ان کے گھروں سے بھی کھا لیا کرو مگر سوال یہ ہے کہ وہ اپنا گھر' باپ کا گھر' ماں کا گھر' یہ الگ الگ کیوں بتا رہا ہے؟ اور یہ بھی کہہ رہا ہے کہ بھائیوں کے گھروں سے بھی تم کھا سکتے ہو' بہن کے گھر سے بھی کھا سکتے ہو۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا۔ ''غلط معاشرے کے اندر سارے بھرا اکھٹے جو کچھ بھر جائیاں اچ ہوندا اے فیر (اخواتکم) بہناں دے معاملے اچ تے پوچھوای نا۔ معاف رکھیں میری بیٹیاں' اے گھراں دیا گلاں پنجابی اچ سکھاوندیاں نیں سانوں۔ ان باتوں میں' میں اردو بولوں تو ایسا نظر آندا اے جس طرح جھوٹ بولدا اے آدمی۔ بھائی صاحب! آپ نند کہہ کے دیکھئے ہے اوگل نئیں بندی' جیہڑی نناناں اچ بن ری ہیگی ❸''۔ جی!

---

❶ جس دن سے یہ ''سبز قدمی'' (بہو) آئی ہے گھر کی برکت ہی ختم ہو گئی ہے۔ اسے لانے کے لیے ''ان'' کے جوتے گھس گئے تھے۔ جس دن یہ آئی تھی تیل چھڑکا تھا۔

❷ میں بہو بن کر آئی تو مجھے اچھی ساس نہ ملی اور جب ساس بنی تو اچھی بہو نہ ملی۔ یہ رشتہ اچھا ہو ہی نہیں سکتا۔

❸ غلط معاشرے میں تمام بھائی اکھٹے رہتے ہیں تو پھر بھابیوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے' اس کا پوچھو ہی نہیں۔ بہنوں کے معاملے میں تو اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ میری بیٹیاں مجھے معاف رکھیں۔ یہ گھر کی باتیں پنجابی زبان میں ہمیں بہت کچھ سکھاتی ہیں۔ ان باتوں کو میں اردو میں کہوں تو نظر آئے گا کہ یہ آدمی جھوٹ بول رہا ہے۔ بھائی جان! آپ ذرا نند کہہ کر دیکھیے وہ بات ہی نہیں بنتی جو ''نناں (نند)'' کہہ کر بنتی ہے۔

قرآن کہہ رہا ہے کہ بہنوں کے گھر سے کھا سکتے ہو، چچا کے گھر سے کھا سکتے ہو، پھوپھی کے گھر سے کھا سکتے ہو، ماموں کے گھر سے کھا سکتے ہو، اور پھر یہ جو چیزیں ہیں، عزیزان من! اور ٹھہریئے۔ اور سنیے یہاں میں بتا رہا ہوں کہ یہ جو فیملی کے یعنی خاندانی تعلقات ہیں، آپ دیکھیے، ویسے تو کہیں گے کہ ہمارے ہاں مشرق میں یہ بات ہے مگر یہ جو رشتوں کے لیے مختلف الفاظ ہیں، میں آپ احباب سے کئی دفعہ کہا کرتا ہوں کہ ان کے اندر بھی بڑی چیز ہے۔ چچا کے ساتھ بھی رشتہ ہے۔ وہ باپ کا بھائی ہوتا ہے لیکن چچا اور ماموں دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ''چاچا تے شریک ہو جاندا ہیگا اے، تے مامیاں دا رشتہ تے او ہوندا اے، پئی ماں کیندی ہوندی ہیگی اے کہ ماما بھانجا اکٹھے نا جاؤ، بجلی پے جاندی ہوندی ہیگی اے [1]''۔ ہے نہ یہ بات! ہمیں ہماری مائیں روکا کرتی تھیں۔ ماں کی طرف رشتے اور باپ کی طرف کے رشتے میں اتنا ہی فرق ہے جتنا باپ کا بیٹے اور ماں کا بیٹے سے تعلق ہوتا ہے۔ معاف رکھیے گا، باپ کا زیادہ تعلق معاشی ہوتا ہے۔ ''بیٹا وی اونوں بنک دا مینجر ای سمجھا اے۔ جس دن او چیک جیہڑا ہیگا اے، نہ پاس کرے، اوس دن ای بگڑ جاندی اے او ہدے نال [2]''۔ ماں کے ساتھ یہ رشتہ نہیں ہوتا اس لیے ماں کی طرف کے جو رشتے ہوتے ہیں ان میں اور باپ کی طرف کے رشتوں میں فرق ہوتا ہے اور جب یہ چیز معاشرے سے اٹھ جائے، یہ جو ماں کے، یا باپ کے، بہنوں کے، تعلقات ہیں وہ اٹھ جائیں ''تو اس میں پھر انکل (چچا) ہی رہ جاتا ہے۔ پتہ ای نہیں لگدا، پئی چاچا اے، کے ماما اے''۔ اس کے بعد پھر ماسی وی تے پھوپھی تے چاچی اچ تے تائی اچ فرق ہی نہیں۔ آنٹی ہوندیاں نے ساری [3]۔ یہ جو ہوم (گھر) کا یا فیملی (خاندان) کا یونٹ ہے وہ ختم ہو گیا ہے۔

مغرب کی معاشرتی تباہی کے سلسلہ میں فیملی یونٹ (خاندانی اکائی) کی حالت زار

مغرب میں اس یونٹ کے رشتوں کے، یہ جو اتنے باریک باریک فرق تھے، وہ سب مٹ گئے۔ بس سب کے لیے وہ ایک انکل، ایک آنٹی ہی رہ گئے۔ اور جب آگے بڑھے، جی نہیں سنیے، ادھر بھی گرینڈ فادر رہ گیا یعنی نانا بھی وہی، دادا بھی وہی اور ادھر گرینڈ سن آیا یعنی نواسا بھی وہی، پوترا [4] بھی وہی۔ ان کے اندر بڑا فرق ہوتا ہے، رشتہ آگے بڑھا۔ ان کے ہاں کا سسرال کا رشتہ آیا۔ یہاں، ہمارے ہاں تو سسر کا کوئی رشتہ ہی الگ ہوتا ہے۔

---

[1] چچا تو ''شریک'' بن جاتے ہیں۔ ماموں کا رشتہ وہ ہوتا ہے جس کے لیے مائیں بھی کہا کرتی ہیں کہ ماموں بھانجا اکٹھے نہ جاؤ بجلی گر پڑتی ہے۔

[2] بیٹا بھی اسے بنک کا مینجر ہی سمجھتا ہے۔ جس دن وہ اس کا ''بنک کا چک'' پاس نہ کرے اسی دن اس کی اس سے بگڑ جاتی ہے۔

[3] معلوم ہی نہیں ہوتا کہ چچا ہے یا ماموں۔ اس کے بعد ماسی (خالہ) پھوپھی، چچی، تائی میں کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا پھر سب ہی آنٹی بن جاتی ہیں۔

[4] پوتا

ادھر وہ فادر ان لاء (Father-in-law) ہوتا ہے'یعنی قانون نے بنادیا' بدوبدٗ اوس نوں پیوٗ ورنہ میرا ککھ نہیں لگدااو [1]۔ یہ ہے Father-in-law (سسر)۔ نیچے اترو۔ اب آیا Brother-in-law (سالہ)۔یعنی عدالت ولوں سمن آیا تھا' تے تاں ایں میں اینوں بھرا کین ڈیا ہویا ساں [2]۔ یہ'عزیزان من! آپ دیکھیے کہ زبانوں پہ کتنا اثر پڑتا ہے۔ان کے ہاں فیملی یونٹ ٹوٹا' مختلف رشتوں کے یہ روابط ٹوٹے' یہ ٹوٹے تو زبان سے الفاظ بھی غائب ہوگئے۔ان الگ الگ رشتوں کے لیے ایک مشترکہ سا جولفظ ہے' بس وہ باقی رہ گیا۔

خاندان کے روابط کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا اعجاز: ہوم (گھر) کو یونٹ بنانا ہوگا

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کیا رشتے ہیں اور اب کیا بن گئے ہیں۔اب یہاں سے نظر آئے گا کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ یہ کہ باپ کے گھر سے' ماں کے گھر سے' ماموں کے گھر سے' چچا کے گھر سے' بہن کے گھر سے' بہنوئی کے گھر سے' پھوپھی کے گھر سے' خالہ کے گھر سے' آپ کھا سکتے ہیں۔وہ ان رشتوں کے' جو یہ الگ الگ روابط ہیں' انہیں گنا رہا ہے اور یاد رکھیے یہ بات قدامت پرست مشرق کی نہیں ہے' جب تک آپ ہوم (Home) کو یونٹ نہیں بنائیں گے' معاشرے کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔چھوٹے چھوٹے سے پیمانے پر آپ اصلاح کیجیے۔وہاں مغرب میں ہوم رہا ہی نہیں:

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

جو لوگ وہاں گئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ وہاں کے بڑے بوڑھوں کی زندگی کس قدر جہنم میں گزر رہی ہے۔اگرچہ مملکت' سلطنت' حکومت کی طرف سے' ان کے کھانے پینے کا انتظام تو ہوتا ہے لیکن انسان کھانے پینے سے ہی تو زندہ نہیں رہتا: کھوتا رہندا کھان پین تے۔ [3]

ہوم یونٹ کے بغیر بھرے معاشرے میں یتیم

مغرب میں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کھانے پینے سے آگے کچھ اور چاہتا ہے۔مغرب کے ان بوڑھوں کو جا کر دیکھیے۔انہیں نہ موت آتی ہے' نہ وہ زندہ ہوتے ہیں' بھرے معاشرے میں یتیم ہوگئے ہوتے ہیں۔صاحب! یہ ہے ایک نقطہ نگاہ۔انسان اتنا Materialistic (مادیت پرست) ہوا کہ وہاں ہر پیمانہ فزیکل (طبعی) ہے۔اس میں ان انسانی اور انسانیت کی چیزوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔آپ دیکھتے ہیں کہ وہاں نقشہ ہی بدل گیا ہے۔قرآن یہ مختلف چیزیں گنا رہا ہے اور اس سے نظر آتا ہے کہ وہ یہ جو روابط ہیں' رکھنا چاہتا

---

[1] یعنی اسے قانون نے زبردستی باپ بنادیا ہے ورنہ میرا اس سے کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔

[2] عدالت سے سمن آیا اسی لیے میں اسے بھائی کہہ رہا ہوں۔

[3] گدھا ہی کھانے پینے میں لگا رہتا ہے۔

ہے اور یہ بڑی چیز ہے۔ کہا کہ ان کے گھروں میں کھالیں۔ اس سے اور آگے بڑھیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ (24:61) جن گھروں کا نظم ونسق تمہارے ہاتھ میں ہے' وہاں سے بھی کھا سکتے ہو اور اگلی چیز وہ ہے جو شاید بہت سے دوست سننا ہی نہ چاہیں کہ اَوْ صَدِيْقِكُمْ (24:61) دوستوں کے ہاں سے بھی کھا سکتے ہو۔ ''اے ان سنی کر دینا' اینا ں نے روز تہاڈے گھر جا بیہا کرنا اے جی۔ قرآن شریف دا حکم ہیگا وے۔ اسی تے ایس واسطے آئے آں۔ یعنی سارے قرآن تے نہیں' کسے تاں حکم تے عمل کر لینا چاہیدا اے نا۔ آؤ دیکھو' لکھیا ہویا ہے۔ تہاڈے تے گھر پہنچ جاندا اے۔ اوکیندے اسی نہیں اوندے' تہاڈے گھر پہنچ جاندا ہیگا [1] اے''۔

قرآن کہتا ہے کہ دوستوں کے ہاں سے کھالیا کرو۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اگلی بات یہ کہی کہ یہ ان کے لیے خیرات کا کھانا نہیں ہے کہ تم معذور یا محتاج ہو یا تم یہ خیرات کا کھانا کھا رہے ہو' یہ باہمی تعلقات کا مظاہرہ ہے۔ یہ جو کھانا ہے اس میں تو وہ جنہیں بظاہر تم سمجھتے ہو کہ یہ خیرات کا کھاتے ہیں' یہاں خیرات کا کھانا نہیں ہے۔ اس باب میں لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ (24:61) اندھا ہو' لولا لنگڑا ہو' مریض ہو' جن کے متعلق عام حالات پہ کہا جاتا ہے کہ وہ ان گھروں سے خیرات کا کھاتے ہیں یا تندرست وتوانا ہو۔ ان کی کوئی تمیز نہیں' یہ سب یکساں ہیں۔ اگر وہ بھی کھائیں گے تو یہ خیرات کا کھانا نہیں ہوگا' یہ محبت کے رابطوں کا کھانا ہوگا۔ اس لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ وہ عزیز داری کے تعلقات کی بنا پر ایک دوسرے کے ہاں سے کھاتے ہیں' خیرات کے طور پر نہیں کھاتے۔ واہ! قرآن کریم کن باریکیوں تک جاتا ہے یعنی بظاہر بات اتنی سی کر رہا ہے کہ کوئی حرج نہیں ہے' ان سے کھالو' وہاں سے کھالو۔ یہاں تک پہنچ رہا ہے کہ جو عام حالات میں بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ ہمیں شاید خیرات کی طرح مل رہا ہے ان گھروں میں وہ بطور استحقاق کھا سکتے ہیں۔ وہ جو ان کا ان کے ساتھ رشتے کا رابطہ ہے اس کی بنا پہ یہ کھا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے' اگر وہ اس طرح سے آ کے کھالیں۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (24:61) ٹھیک ہے کہ تم' عام مومنین' ایک ہی برادری کے افراد ہو' اس لیے کھانے کی عمدہ شکل یہی ہے کہ تم سب آپس میں مل بانٹ کر کھاؤ۔ تنہا خوری اچھی چیز نہیں لیکن اس میں غلو نہ کرو کہ الگ الگ کھانے کو معیوب سمجھنے لگ جاؤ۔ حسب ضرورت ایسا کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اکیلا ہے' کھانے کا وقت ہے اکیلے کھاؤ' کچھ دوست آ گئے ہیں' عزیز آ گئے ہیں' اکٹھے مل کر کھاؤ۔ نہ اس اکیلے کھانے میں کوئی مضائقہ ہے' نہ اس طرح سے اکٹھے کھانے میں کوئی مضائقہ کی بات ہے۔ قرآن اس طرح سے کیا روابط قائم رکھتا ہے! اور آگے چلیں۔ وہاں تو کہا تھا کہ جب دوسروں کے گھر میں جاؤ وہاں جانے کی اجازت لو۔ جب جاؤ تو وہاں ان پہ سلام بھیجو۔ اس

---

[1] اسے ایسے کر دینا جیسے سنا ہی نہیں ہے ورنہ یہ روز تمہارے گھر آ جایا کریں گے کہ یہ قرآنِ شریک کا حکم ہے اس لیے ہم تمہارے ہاں آئے ہیں۔ یعنی سارے قرآنِ کریم پہ تو نہیں بلکہ اس کے کسی حکم پر تو عمل کر لینا چاہیے۔ آؤ! دیکھو' یہ لکھا ہوا ہے۔ تمہارے تو گھر پہ پہنچ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو نہیں آتے مگر یہ تمہارے گھر پہنچ جاتا ہے۔

سلسلے میں قرآن کہتا ہے کہ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (24:61) ان کے گھر میں بھی داخل ہو تو وہاں ان لوگوں کو بھی سلام کرو۔ ان کے لیے سلامتی اور پاکیزہ زندگی کی آرزو کا اظہار کرو۔ کیا یہ غیر ہی ہیں جو تمہاری سلامتی کی دعاؤں کے محتاج ہیں کہ وہاں تو تم دعائیں دو اپنوں کو کیوں محروم کرو؟

گھر میں کسی بزرگ کے کردار کا گھریلو زندگی پر اثر

صاحب! ہمارے ہاں بچوں تک کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ساریاں نوں آ کے سلام کیا کرو [1]۔ وہ تو کیا کریں مگر جب میاں صاحب خود تشریف لائیں تو یہ نہ کیا کریں، بچوں تک ہی یہ رہا کرے۔

عزیزان من! چھوٹی چھوٹی سی باتیں کر کے دیکھیے گھر کے اندر کتنی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ جو گھر کا بزرگ یا سربراہ ہے، عام طور پہ تو اس کے پاؤں کی چاپ آنے سے ہی وہ کہتے ہیں کہ صاحب لوگ، بچوں کو ڈراتے ہیں کہ وہ آتے ہیں: ''چھپو ہٹو آ جائے گا، کھا جائے گا، اوندے ای جناب، پیر رکھیا نہیں اونے، تے کڑ کیا نہیں: آ ایتھے اے اونے کیوں ڈھک دتا، اے میں سویرے کہہ کے گیا ہیگا ساں، تے نہیں باز اوندے تسی گھر والے۔ وہ بجلی کا کڑکا تھا کہ سارا گھر کنبن ڈیا ہویا ہیگا [2]۔'' جی میاں صاحب آ گئے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ گھر میں جاتے ہی اہلِ خانہ کو سلام علیکم کہے۔ پوچھے کہ کیا حال ہے؟ تم یہ سلامتی: تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (24:61) وہ سلام جس میں کہو کہ اللہ تمہیں مزید عمریں عطا کرے، جیتے رہو۔ آپ حیران ہونگے کہ وہ جو یحییٰ نام ہے، وہ وہی ہے جیہڑا ساڈے جیونا نام رکھ لینے نیں۔ [3] وہ عربی زبان کا حیات ہے یہیں تحیۃ ہے: جیوندے رہو، سلامتی نال رہو۔ [4] مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً (24:61) اللہ کی برکتیں ہوں، تمہارے ہاں زندگی کی خوشگواریاں ملیں، تمہاری عمر دارز ہو، جیتے رہو، سلامت رہو، خوشحال رہو، طیب زندگی بسر کرو۔ گھر میں داخل ہو تو یہ کچھ کہتے ہوئے داخل ہوا کرو۔ عزیزان من! گھر کا نقشہ بدل جاتا ہے اگر وہ اس طرح داخل ہو اور باہر سے کتنا ہی غصے میں چلا آ رہا ہو، اگر یہ اتنے سے حکم پر عمل پیرا ہو جائے، آپ دیکھیے اس کی اپنی غصے کی کیفیت بدل جائے گی، گھر والے اس کی آمد کا استقبال کریں گے، انتظار کریں گے، ورنہ جہاں انہوں نے کہا کہ ''میں آج شام نوں نہیں اوناں۔ گھر دیاں کہیا: اللہ دا شکر اے صاحب! اے اک شام تے آرام دی کٹاں گے۔ جے او ہدا باہروں سنیہا آ جائے کہ میں آریاں، او کیندے نیں: او تے کیندے سن میں کوئی دس پندرہ دن لونے نیں۔

---

[1] سب کو آ کر سلام کیا کرو۔

[2] چھپ جاؤ، ہٹ جاؤ، کھا جائے گا۔ جونہی جناب گھر آئے کڑک اور گرج کر کہا: یہ اس نے یہاں کیوں ڈھانپ دیا۔ یہ میں صبح ہی کہہ کر گیا تھا۔ تم گھر والے اس سے باز نہیں آتے ہو۔ وہ تو بس بجلی کی کڑک تھی کہ تمام اہلِ خانہ خوف سے تھر تھرا اٹھے۔

[3] جو ہمارے ہاں جیونا نام رکھ لیتے ہیں۔

[4] جیتے رہو، سلامت رہو۔

چوتھے ای دن خط آ گیا۔ آ گیا' فیر اوہی مصیبت پے جانی اے ❶ ۔'' اتنی سی بات کہی کہ اپنے گھر میں بھی داخل ہو تو سلامتی کی دعائیں دو' درازی عمر کی دعائیں دو' مبارکۃ طیبۃ یعنی جی نہیں بھرتا اس کا دل یہ کہنے سے سیر نہیں ہوتا کہ بھئی! صرف سلام ہی کہیے: **تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ** ❷ (24:61) عمر دراز ہو' پاکیزہ زندگی ہو' جو خدا کی طرف سے برکات کی موجب اور خوشگواریوں کی باعث ہو۔ یوں اللہ اپنے اس قسم کے احکام کو واضح کر کے بتاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تمہیں کیوں بتاتا ہے' کیوں حکم دیتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اس لیے **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** (24:61) تا کہ تم عقل وفکر سے کام لو۔ یہ وہی Rationality (حکمت) ہے' یہ کسی تھانیدار کا حکم نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ ذرا عقل وفکر کی میزان پر کس کے دیکھو کہ ان کے اندر کیا کیا چیزیں چھپی ہوئی ہیں' چھوٹی چھوٹی سی باتوں سے تمہارے ہاں کتنی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں!

عزیزان من! اس نے جو روزمرہ کی زندگی میں' ایک دوسرے کے ملنے کے لیے ''اسلام علیکم'' کہا تھا' اے کاش! یہ ہمارے ہاں تو اسلام علیکم کہا اور پھر چل بھئی! فوراً کہہ دیا کہ یہ بڑا احرام زادہ واقع ہوا ہے جناب! لوکاں نوں گالیاں نال دیندا پیا اے۔ ❸ وہ کہتا ہے کہ جب بھی ایک دوسرے کے ساتھ ملو اسلام علیکم کہو کہ تمہارے لیے میرے پاس سلامتی کا پیغام ہے' میں تمہارے لیے سلامتی کا خواہاں ہوں۔ وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں بھی تو دشمن نہیں یعنی وعلیکم السلام' میری طرف سے بھی سلامتی ہے۔ اگر معاشرے کا ہر فرد دوسرے کے لیے سلامتی کی تمنا ظاہر کرتا ہے تو عزیزان من! اس معاشرے کے اوپر سلامتی کے بادل برسنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ہر فرد دوسرے سے ملے' کہے: اسلام علیکم' میں تو تمہارے لیے سلامتی کا پیغامبر ہوں۔ جواب میں وہ کہے: وعلیکم السلام' میں بھی سلامتی کا پیغامبر ہوں۔ اس معاشرے میں جہاں کہیں دو ہی اکٹھے سامنے ہونگے' وہ دو اس طرح سے سلامتی اور پاکیزہ زندگی کی آرزو ایکسچینج (Exchange) کرتے جائیں گے' اسے میکینیکلی نہیں' دل کی تمناؤں کا اظہار الفاظ میں کریں گے تو پھر کہا کہ **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** (24:61) یہ جو چیزیں ہیں انہیں یاد رکھو۔ ان کی روشنی میں عقل وفکر سے کام لے کر معاشرہ میں رہو سہو۔

---

❶ میں آج شام نہیں آؤنگا تو اہل خانہ کہہ اٹھے: اللہ کا شکر ہے صاحب! یہ ایک شام تو آرام کی کاٹیں گے۔ اگر اس کا باہر سے پیغام آ جائے کہ میں آ رہا ہوں وہ کہتے ہیں: وہ تو کہتے تھے کہ میں کوئی دس پندرہ دن لگاؤنگا' چوتھے ہی دن خط آ گیا۔ وہ آ گیا تو پھر وہی مصیبت پڑ جائے گی۔

❷ اپنے ان لوگوں کے لیے سلامتی اور ایسی پاکیزہ زندگی کی آرزو کا اظہار کرو جو خدا کی طرف سے صد برکات کا موجب اور ہزار خوشگواروں کا باعث ہو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام' واضح طور پر بیان کرتا ہے تا کہ تم ان کی روشنی میں عقل وفکر سے کام لے کر معاشرہ میں رہو سہو۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔813)

❸ یہ لوگوں کے ساتھ ہی گالیاں بکتا ہے۔

مومن وہ ہے جو اس طرح ایمان لائے جس طرح قرآن کا مطالبہ ہے

ان چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے بعد قرآن پھر بڑے معاملے کی طرف آیا۔ کہا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ اِذَا کَانُوْا مَعَہٗ عَلٰٓی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْهُ ❶ (24:62)۔ اب کہا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ یعنی یہ مومن تو وہ ہے جو اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ واقعی اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں۔ ورنہ مومن کہنے کے بعد اس کی ضرورت کیا ہے کہ یہ کہا جائے کہ مومن وہ ہیں جو واقعی ایمان لاتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ وَ اِذَا کَانُوْا مَعَہٗ عَلٰٓی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْهُ (24:62) جب رسول ﷺ انہیں کسی امر جامع کے لیے بلائے۔ یہاں امر جامع کا لفظ آیا ہے یعنی یہ وہ معاملہ ہے، جس کا تعلق جماعتی حیثیت سے ہے۔ یہ وہی ہے جسے Public affair کہتے ہیں، انفرادی نہیں کہتے۔ انفرادی باتیں تو وہ ہوتی ہیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہو۔ اب تو جو رسول ہے وہ تم کو امر جامع کے لیے بلانے والا ہے۔ یہ حیثیت ہے رسول ﷺ کی یعنی وہ Collective good of the society (معاشرے کی اجتماعی بہتری) کے لیے بلائے۔ یہاں امر جامع کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی امور جامع کے لیے آپ کو بلائے۔

اجتماعی معاملات کے لیے رسول اکرم ﷺ کا صحابہ رضی اللہ عنہ کو بلانا

آپ کو معلوم ہے کہ یہ الصلوٰۃ جسے ہم نماز کہتے ہیں، اور جس کے لیے کہتے ہیں کہ اس کی ادائیگی وقت پر ضروری ہے، وہ وقت تو صدر اول میں، حضور ﷺ کے زمانے میں، خلافت راشدہ میں متعین کر لیے گئے۔ جب کوئی اہم معاملہ آتا تھا، جس پہ غور و فکر کرنا ہوتا تھا، مشورہ کرنا ہوتا تھا، ان ارباب مشاورت کو بلانا ہوتا تھا، اس کے لیے اس زمانے کے انداز کے مطابق بلاوا یا دعوت یا ان کو آواز دینے کا طریق یہ تھا۔ یہ تاریخ میں ہے کہ وہ حکومت کی طرف سے جاتے تھے اور گلی گلی، محلے محلے، آواز دیتے تھے: الصلوٰۃ الجامعۃ، الصلوٰۃ الجامعۃ، الصلوٰۃ الجامعۃ۔ آؤ، ایک امر جامع آ گیا ہے جس پہ بحث ہوگی، الصلوٰۃ کے لیے آؤ۔ اس کا نام تھا الصلوٰۃ۔ اور وہ جو کہتے ہیں کہ صاحب! قرآن نے کہا ہے کہ اس پہ جو وقت مقرر ہو اس پہ آؤ۔ یہ وقت مقرر ہوتا تھا، اس کے لیے جب کوئی امر جامع آتا تھا۔ اس کے لیے ان کے بلانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس بلانے کے الفاظ یہ ہوتے تھے۔

---

❶ حقیقی مومن وہ ہیں جو ان قوانین کی صداقت پر دلی یقین رکھتے ہیں جو خدا کی طرف سے، رسالت محمدؐیہ کی وساطت سے انہیں ملے ہیں۔ اس کے بعد ان کی عملی زندگی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ جب کسی اجتماعی معاملہ میں، اس نظام کے مرکز (رسول) کے ساتھ ہوتے ہیں تو اس کام کو چھوڑ کر جاتے نہیں جب تک اس (رسول) سے اجازت نہ لے لیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ فی الواقعہ خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔813)

ان اجتماعات کی اہمیت اور افادیت

عزیزان من! خود قرآن کریم میں سورۃ الشوریٰ میں ہے کہ وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38) مومنین اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں۔ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (42:38) اور اس مقصد کے لیے صلوٰۃ قائم کرتے ہیں۔ یہاں (24:62) میں امر جامع کہا ہے: جب رسول کسی امر جامع کے لیے تمہیں بلائے۔ یہ بڑی Comprehensive Term (جامع اصطلاح) ہے۔ یہ امر جامع ہر وہ معاملہ ہے جس کا تعلق امت سے ہے' انسانیت ہے' صرف افراد سے نہیں بلکہ Collective good (اجتماعی بہبود) کہا کہ مومن کے ایمان کی نشانی یہ ہے کہ جب رسول اس قسم کے کام کے لیے بلائیں تو وہ اجازت لیے بغیر خود بخود وہاں سے نہیں چلے جاتے۔ بظاہر یہ بڑی چھوٹی سی بات ہے لیکن بڑی اہم چیز ہے۔ یہیں سے ایمان کی پرکھ ہو جاتی ہے۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَسۡتَاۡذِنُوۡنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ (24:62) وہ لوگ جو تم سے اجازت لے کر جاتے ہیں' وہ ہیں جو ایمان رکھتے ہیں ورنہ قرآن کریم کہتا ہے کہ فَاِذَا اسۡتَاۡذَنُوۡكَ لِبَعۡضِ شَاۡنِهِمۡ فَاۡذَنۡ لِّمَنۡ شِئۡتَ مِنۡهُمۡ وَ اسۡتَغۡفِرۡ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (24:62) پھر جب وہ اجازت لینے کے لیے آئیں تو ایک ایک شخص کے متعلق سوچ لو کہ اس کا ابھی رکنا ضروری ہے یا اس کو چھٹی دی جا سکتی ہے۔ جس کے متعلق تم مناسب سمجھو کہ ہاں' اس کو اجازت دیجا سکتی ہے' اس کو اجازت دو اور اسے اس طرح سے کہو کہ جو تم اب غیر حاضر ہو گئے ہو' اس کا تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ''استغفار'' کے معنی دیکھ لیے کہ یہ کہاں آتا ہے۔ یہ اس کا عام ترجمہ کیا جائے گا اور ان کے لیے خدا سے استغفار کر یعنی وہ تجھ سے پوچھ کے چلے ہیں' تم نے ان کو اجازت دی ہے' تو پھر انہوں نے کیا جرم کیا ہے جو اس کے لیے خدا سے استغفار کر۔ ''غفر'' کے معنی ہی ہمارے ہاں غلط ہو گئے۔ یہ جواب' اتنا عرصہ یہاں سے چلے گئے ہیں' اس کے بعد جو کچھ بھی ہونا ہے' اس سے کچھ فائدہ ہونا تھا یہ اس سے محروم رہ جائیں گے۔ کہا کہ ایسا انتظام کر کہ اس سے جو محروم رہنے کی بات ہے یہ اس سے محفوظ ہو جائیں' ان کی Absence (عدم موجودگی) سے جو کچھ طے ہو وہ ان تک پہنچا دیا کرو' یہ ان کے جو امور ہیں یہ ان میں برابر کے حصے دار ہیں کیونکہ یہ تم سے پوچھ کے گئے ہیں' تم نے ان کو خود اجازت دی ہے' ان کی اس غیر حاضری سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ معنی ہیں۔ قرآن کتنی جزئیات تک جا رہا ہے۔ اس لیے کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (24:62) قانون خداوندی میں اس قسم کے استثنائی حالات کے لیے حفاظت و مرحمت کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔

سربراہِ مملکت کی طرف سے یہ بلاوا زندگی کی آبیاری کے لیے ہوگا

کہا ہے کہ لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَيۡنَكُمۡ كَدُعَآءِ بَعۡضِكُمۡ بَعۡضًا (24:63) یاد رکھو! یہ جو رسول' یعنی سربراہِ مملکت کا بلاوا ہے یہ عام لوگوں کے بلاوے کی طرح نہیں ہے۔ اس کے بلانے میں اور عام لوگوں کے بلانے میں بڑا فرق ہے۔ پتہ

ہے یہ کا ہے کے لیے بلاتا ہے؟ سینے کا ہے کے لیے بلاتا ہے؟ اس سلسلے میں قرآن کریم کہتا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ (8:24) اے جماعت مومنین! یہ نظام خداوندی اللہ اور رسول کا نظام' جب تمہیں بلائے تو اس کے بلاوے پہ لبیک کہہ کے فوراً پہنچو۔ کا ہے کے لیے؟ اس لیے کہ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ (8:24) یہ تمہیں بلاتا ہے تاکہ تمہیں زندگی عطا کرے' جبکہ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی بڑے کا بلاوا آ جائے تو جان اوتھے ای نکل جاندی اے۔ گھر والے نیازاں سکھ دے پھر دے نیں: یا اللہ! خیریت نال واپس آوے۔ ❶ ایک یہ سربراہ مملکت ہے۔ جس کی قرآن شہادت دیتا ہے کہ یہ تمہیں اس لیے بلاتا ہے کہ تمہیں زندگی عطا کرے۔

فرمودہ اقبالؒ: خدا روٹی بھی دیتا ہے اور زندگی بھی

یہ خدا روٹی دیتا ہے' زندگی بھی دیتا ہے' وہ خدا روٹی دیتا ہے' جان نکال لیتا ہے: اوجیہڑے قربانی لئی بکرے رکھے ہوندے نیں' ویکھدے ہو' کنیاں خاطراں اوہدیاں ہوندیاں نیں۔ کاہدے لئی ہوندیاں نیں؟ عید والے دن واسطے۔ ❷ یہ ہے آپ کے ہاں کے کمیونزم اور سوشلزم' عزیزان من! ایں خدا جانے بردنانے دہد۔ جشن اقبالؒ کا سال آپ نے دیکھا لیا۔ جشن اقبالؒ کے سال بھر کے مذاکرات' اجتماعات' سیمینارز' تقریروں' تحریروں' کتابوں' میں اقبالؒ (1877-1938ء) کا یہ شعر کسی نے آپ کو نہیں سنایا ہے اور یہ شعر سنانے والا' یہ ایک ہی ❸ تھا' عزیزان من! کسی دوسرے نے یہ ایک شعر نہیں سنایا۔ مجھے معاف رکھیے' میں کسی کو شکایت نہیں کرتا۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ یہ شخص یہ شعر سنا دے گا۔ احتیاط برتی گئی کہ سننے والوں میں بھی اس کو دعوت نہ دی جائے کہ کہیں یہ شعر نہ سنا دے۔ کسی نے نہیں سنایا' حالانکہ انہیں پتہ ہے کہ اس شخص کا تعلق تو پچاس برس سے اقبالؒ سے تھا لیکن انہیں معلوم ہے کہ یہ تو اقبالؒ کا یہ شعر سنا دے گا۔ ہاں رسول کی دعوت یا بلاوا عام لوگوں کی دعوت نہیں ہے۔ یہ تمہیں بلاتا ہے تاکہ تمہیں زندگی عطا کرے۔

---

❶ وہیں جان نکل جاتی ہے۔ گھر والے نذر نیاز مانگتے ہیں: اے اللہ! خیر و عافیت سے واپس آئے۔

❷ وہ جو قربانی دینے کے بکرے رکھے ہوتے ہیں آپ کو معلوم ہے کہ ان کی کس قدر خاطر و مدارت کی جاتی ہے۔ یہ خاطر و مدارت کس لیے کی جاتی ہے؟ صرف عید کے دن کے لیے اور بس!

❸ یہ اشارہ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف ہے۔

بلا اجازت ان اجتماعات سے کھسک کر چلے جانے والے منافق ہوتے ہیں

مومن وہ ہیں کہ جب یہ بلاتا ہے تو لپک کے' بھاگ کے' اس کی طرف جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ **یَعْلَمُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا** ❶ (24:63)۔ یہ ابھی وہ دور ہے جس کے اندر یہ جماعت مخلوط تھی' منافق بھی درمیان میں ہی تھے۔ قرآن بتاتا ہے کہ ایمان والوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ بلا اجازت کہیں نہیں جاتے۔ ان کے برعکس منافقین کی یہ صورت ہے کہ وہ ہر وقت اس تاڑ میں رہتے ہیں کہ کس طرح سے جائیں۔ یہ کھسک جانا یتسللون کا ترجمہ ہے۔ کہا ہے کہ کوئی بات نہیں ہے' وہ جو پوچھ کے گئے تھے' وہ ایک وہ تھے جن کے متعلق کہا کہ ایسا انتظام کرو کہ یہ نقصان میں نہ رہیں۔ گئے دونوں ہی ہیں: ایک اجازت لے کر اور دوسرے بلا اجازت۔ جو یونہی بلا اجازت گئے ہیں ان سے کہہ دو کہ **فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖٓ اَنْ تُصِیْبَھُمْ فِتْنَۃٌ اَوْ یُصِیْبَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ** ❷ (24:63) محتاط رہیں۔ اس طرح سے جو یوں کھسک کے چلے جانا ہے تو وہ یاد رکھیں کہ اس کے بعد جو ایک تباہی آئے گی' اس تباہی سے محفوظ رہنے کی کوئی شکل تمہارے پاس نہیں ہے۔ یہ ہے امر جامع کے حالات' یہ ہے Discipline (نظم و نسق)' یہ ہے ایمان کی نشانی' اور اس کے بعد یہ ہے کہ اس قوم کے اوپر **عَذَابٌ اَلِیْمٌ** (24:63) آیا۔

عزیزانِ من! آخری آیت ہے اور وقت ہو ہی گیا ہے۔ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد جیسا کہ میں نے کہا ہوا ہے کہ سورۃ کی آخری آیت میں' قرآن تمام مواد (Contents) کو سمیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اب یہاں اگلی ہی آیت میں اس کے لیے ''الا'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ الا کیا ہے؟ ''الآ'' کہ آخر میں آگاہ رہو' سن رکھو' دل کے کانوں سے سنو جو ہم کہہ رہے ہیں' ہم یہ جو کچھ تمہیں کہہ رہے ہیں' غور سے سنو۔ یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ اسے تم مانو یا نہ مانو۔ اگر مانو گے تو تمہارا بھلا ہوگا' نہ مانو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ سنو! **اِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (24:64) یاد رکھیں! کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ساری کی ساری کارگہ کائنات جو کچھ ہے' وہ اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہے۔ اگر تم کھسک جاؤ گے' بلا اجازت چلے جاؤ گے' تو اس کا کیا بگاڑ لو گے' یہاں تو ساری کائنات اس کے لیے سرگرم عمل ہے۔ **قَدْ یَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَیْہِ** (24:64) وہ جانتا ہے تم کیا کرتوتیں کرتے ہو۔ کھسک جانے والا اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ **وَیَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْہِ فَیُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا** (24:64) اور جب کاموں کے ظہور نتائج کا وقت

---

❶ اللہ ان تمام لوگوں سے باخبر ہے جو' تم میں سے عدول حکمی کا پہلو لیے ہوئے' چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔814)

❷ لہٰذا' وہ لوگ جو اس طرح نظام خداوندی کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں' انہیں اس بات کی خلافت ورزی سے محتاط رہنا چاہیے کہ وہ اس قسم کی روش سے' کسی آفت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آفت ایک بلائے عظیم بن کر ان کی تباہی کا موجب بن جائے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔814)

آئے گا تو اس وقت یہ ظاہر ہو جائے گا کہ کس نے کیا کیا تھا اور یہ اس لیے ظاہر ہو جائے گا کہ **وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ** (24:64) اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے: انہیں بھی جانتا ہے جو اس طرح آتے ہیں، انہیں بھی جانتا ہے جو اس طرح چلے جاتے ہیں۔

عزیزان من! سورۃ النور آج ختم ہوگئی آئندہ ہم سورۃ الفرقان لیں گے جو پچیسویں سورۃ ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔معراجِ انسانیت)